بارِ وفا
نگہت سیما

باراول 2003ء
ناشرین .... خواتین ڈائجسٹ
پریس .... ابن حسن پریس

سول ایجنٹ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37- اردو بازار کراچی

کچھ بارِ وفا کے بارے میں

بہت دن پہلے میں نے اخبار میں ایک خبر پڑھی تھی۔ کہ ایک بااثر زمین دار نے ایک خاندان کی عورتوں کو بے لباس کر کے پورے شہر میں گھمایا اور......

اتنی شقی القلبی

اتنا ظلم...... یقیناً آسمان بھی تھرا اٹھا ہوگا۔

قصور اگر کسی مرد نے کیا تھا تو اس کی سزا عورت کو کیوں دی گئی؟

عورت کیسے کیسے بارِ وفا اٹھاتی ہے۔

کبھی ستی ہو کر تو کبھی دیت، قصاص اور سوارہ جیسی رسم کی بھینٹ چڑھ کر......

میں نے سوچا تھا' کبھی تو اس پر لکھوں گی۔ میں وہ تو نہیں لکھ سکی جو لکھنا چاہ رہی تھی۔ تاہم میں نے کچھ نہ کچھ کہنے کی کوشش ضرور کی ہے۔

اور میں نے یہ بھی بتانا چاہا ہے کہ یہاں ہر شخص اپنے اپنے انداز میں وفا کا بار اٹھائے ہوئے ہے۔

کسی نے ہوش وخرد سے بیگانہ ہو کر'
اور کسی نے ساری عمر وفا نبھا کر'
منصور ملک نے یہ بوجھ ہوش وخرد سے بیگانہ ہو کر اٹھایا۔
تورابی نے اپنے ہی خون کے خلاف گواہی دے کر......
اور عبداللہ نے انعم کو اپنانے کا فیصلہ کر کے۔ کون جان سکتا ہے کہ......

ہم نے کیسے اٹھایا ہے بارِ وفا
ہم نے کاٹی ہے کیسے شبِ زندگی

نگہت سیما

انتساب

اپنی پیاری امی جان کے نام
جنہوں نے ہمیشہ میری ہر تحریر کو پڑھا اور سراہا

بارِ وفا

”حکومتوں کا احوال بھی میکس ملر کی نوجوان ہیروئن جیسا ہوتا ہے۔
good and when she was bad she was very popular.
(جب وہ نیک لڑکی ہوتی When she was good she was very very
ہے تو اسے بہت اچھا سمجھتے ہیں اور جب وہ بری لڑکی ہوتی ہے تو وہ بے حد مقبول ہوتی ہے۔)“
دانیال نے بلند آواز میں پڑھا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا میگزین گول مول کر کے مامون کی طرف پھینک دیا اور مزید کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ مامون نے ایک ہاتھ سے میگزین کیچ کرتے ہوئے دوسرا ہاتھ اوپر اٹھا کر اسے کچھ کہنے سے روکا۔

”لگتا ہے آج پھر تمہیں سیاست کا بخار چڑھا ہے اور میں کم از کم اس وقت کوئی بھی سیاسی بحث سننے کے موڈ میں ہرگز نہیں ہوں کیونکہ آج مجھے ملک صاحب سے فضل داد کے کیس کو ڈسکس کرنا ہے اور اس کے لیے میں ضروری پوائنٹ نوٹ کر رہا ہوں اور تم جانتے ہو کہ ملک صاحب اگر میرے پوائنٹس سے مطمئن نہ ہوئے تو کان پکڑ کر چیمبر سے باہر نکال دیں گے۔“

”اور کیا ہی اچھا ہو مامون کہ ملک صاحب ایک روز یہ کر گزریں۔“ شیلف سے اپنی مطلوبہ کتاب نکالتے ہوئے صدف منیر نے مڑ کر کہا۔

”آخر تمہیں مجھ سے کیا دشمنی ہے صدف منیر۔“ مامون اپنی ٹیبل کے پیچھے سے نکل کر اس کے پاس آ کھڑا ہوا اور اس کے ہاتھ سے Evidenceact لے لی۔

"آج تمہیں بتانا پڑے گا صدف منیر! کہ تم مجھ سے اتنی الرجک کیوں ہو۔ ہر وقت مجھے یہاں سے نکالنے کے چکر میں رہتی ہو۔"

"دراصل یہ تمہاری ذہانت سے خوفزدہ ہے خلیفۃ المومنین اور اسے ڈر ہے کہ کہیں تمہارے نمبر ملک صاحب کے ریکارڈ میں اس سے زیادہ نہ ہو جائیں۔" دانیال نے اس کے ہاتھ سے کتاب لے کر دوبارہ صدف کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

"خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔" صدف کتاب لے کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ملک صاحب جانتے ہیں سب کہ کون کام چور ہے اور کون دل لگا کر کام کرتا ہے۔" صدف کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور وہ شریر نظروں سے ماموں کو دیکھ رہی تھی۔

"تم کسی روز میرے ہاتھوں سے قتل ہو جاؤ گی صدف!" اس نے مصنوعی غصے سے کہا۔

"اس صورت میں دانی تم میری طرف سے تعزیرات پاکستان کے تحت دفعہ ۳۰۲ کا کیس کر دینا۔ میں ابھی سے تمہیں پاور آف اٹارنی دیتی ہوں۔"

"پلیز صدف! آج کے دن تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں۔" ماموں نے لجاجت سے کہا۔

"یہ میرا پہلا کیس ہے اور میں چاہتا ہوں کہ۔۔۔"

"ملک صاحب کو رنگ کروں۔" دانیال نے اس کی بات کاٹ دی۔

"بشرطیکہ کہ تم لوگوں نے مجھے یہ کیس اسٹڈی کرنے دیا تو۔" ماموں نے چڑ کر کہا اور اپنے سامنے پڑی فائل کھول لی۔

دانیال صدف کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اور دھیمی آواز میں پوچھا۔

"یہ عبداللہ ابھی تک نہیں آیا اور عبیر کا کیا ارادہ ہے۔"

"عبداللہ کے چاچو کی طبیعت ناساز تھی۔ صبح کچہری میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ چیمبر نہیں آسکے گا اور عبیر کے ارادے کی کچھ خبر نہیں۔ معلوم نہیں اس کے پاپا نے اجازت بھی دی ہے یا نہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے صدف! عبیر کے پاپا اسے پریکٹس کی اجازت دے دیں گے۔"

"میرا خیال ہے نہیں۔ وہ لوگ بیسکلی جاگیردار ہیں۔ تعلیم کی اجازت اور بات ہے۔ پریکٹس کی اجازت بہت مشکل ہے۔" صدف نے خیال ظاہر کیا۔

"اور عبیر نے ہمیں جوائن نہ کیا تو ہمارے ستارے کا ایک کونا ٹوٹ جائے گا۔"

عبیر، صدف، دانیال، ماموں اور عبداللہ پانچوں یونیورسٹی میں ایک ساتھ ہی تھے۔ ماموں اور عبداللہ نے تو گریجویشن بھی ایک ہی کالج سے کیا تھا۔

"ہاں، یہ تو ہے۔" دانیال کی بھی شدید خواہش تھی کہ وہ سب ہمیشہ اکٹھے رہیں۔ اکٹھے کام کریں۔ اسی لیے تو اس نے اپنے والد سے بات کی تھی۔ ملک غضنفر علی ایک کامیاب وکیل تھے۔ بہت نام تھا ان کا اور ان کے ساتھ کام کرنا بہت بڑا اعزاز۔ اگر دانیال ان کا بیٹا نہ ہوتا تو شاید ان سب کے لیے ملک صاحب کا چیمبر جوائن کرنا مشکل ہو جاتا۔ لیکن جب دانیال نے ان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ چاہتا ہے کہ اس کے دوست بھی اپرنٹس شپ اس کے ساتھ ہی جوائن کریں تو ملک صاحب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد انہیں اجازت دے دی۔

ان کا یہ چیمبر چار بڑے کمروں پر مشتمل تھا اور دوسری منزل پر تھا۔ سیڑھیوں سے داخل ہوتے ہی ویٹنگ روم تھا۔ جہاں منشی بیٹھا کرتا تھا۔ اور کیسز کے سلسلے میں آنے والے لوگ بھی یہاں ہی بیٹھتے تھے۔ منشی کی ٹیبل کے علاوہ دونوں سائیڈوں پر ریگزین کے کور والے صوفے پڑے تھے اور اسی کمرے سے ایک دروازہ اندر کی طرف کھلتا تھا۔ یہ ایک بڑا کمرہ تھا۔ تین اطراف شیلف میں موٹی موٹی قانون سے متعلق کتابیں پڑی تھیں۔ اور کمرے میں کچھ رائٹنگ ٹیبلز اور چیئرز تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ لائن میں صوفہ چیئرز لگی تھیں۔ سامنے گلاس وال تھی اور ساتھ ہی گلاس ڈور۔ گلاس وال سے اندر والے کمرے کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ وہ ملک صاحب کا آفس تھا۔ ان کی ٹیبل بالکل سامنے تھی۔ اس کمرے میں بھی زمین سے چھت تک شیلف بنے ہوئے تھے جو کتابوں سے بھرے تھے۔ آفس سے دائیں طرف ایک چھوٹا کمرا تھا، جہاں ایک سنگل بیڈ اور اٹیچڈ باتھ تھا۔

کبھی کبھار ملک صاحب اسے آرام کے لیے استعمال کرتے تھے۔ لیکن دانیال اور اس کے دوستوں کے آنے کے بعد انہوں نے یہ کمرہ ہارون احمد اور نوید اسد کے لیے سیٹ کروا دیا تھا۔ یہ دونوں وکیل بہت عرصہ سے ان کے ساتھ ہی کام کر رہے تھے اور پہلے دانیال والے کمرے میں بیٹھتے تھے۔

"یہ عبیر آج کل کہاں ہے۔" اچانک ہی ماموں نے فائل بند کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا گاؤں میں؟"

"وہ گاؤں گئی تو تھی لیکن آج واپس آگئی ہوگی۔" صدف نے اٹھ کر کتابیں واپس شیلف میں رکھتے ہوئے بتایا۔

"کیا تم آج اس کی طرف جاؤ گی؟" دانیال نے کچھ سوچتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں لیکن آج نہیں۔ اور شاید کل بھی نہیں۔ البتہ پرسوں جاؤں گی۔"

"آج اور کل کیوں نہیں؟" ماموں نے جو پھر فائل کھول چکا تھا احمقوں کی طرح پوچھا۔

اس لیے کہ آج اس وقت سات بجنے والے ہیں۔ آٹھ بجے میں یہاں سے اٹھوں گی اور میرا خیال ہے' یہ وقت کسی شریف لڑکی کے لیے گھر سے نکلنے کے لیے مناسب ہرگز نہیں ہے۔"

"خیر شریف لڑکی کے لیے تو یہ وقت بھی مناسب نہیں ہے گھر سے نکلنے کا بی بی۔"

دانیال نے بہت آہستگی سے کہا' لیکن صدف نے سن لیا اور میز پر سے رولر اٹھا کر اسے مارا۔

"کیا کہا پھر کہنا۔۔۔ اور یہ بھی بتانا کہ چیمبر جوائن کرنے کا مشورہ کس کا تھا اور آٹھ گھنٹے تک مسلسل کس نے ابو کے سامنے تقریر کی تھی کہ یہ بڑی زیادتی ہے کہ پڑھ لکھ کر پھر پریکٹس نہ کی جائے اور یہ کہ جب پریکٹس نہیں کرنا تھی تو پھر لاء پڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔ مزے سے بی۔اے کر کے گھر بیٹھتیں اور سر پر سہرا سجاتیں۔"

"سہرا لڑکے باندھتے ہیں اور سہرا مجھے باندھنا ہے تم کو نہیں۔" دانیال نے لقمہ دیا تو صدف نے گھور کر اسے دیکھا۔

"میں جو پوچھ رہی ہوں' وہ بتاؤ۔"

"میرا خیال ہے' میں نے ہی کہا تھا۔" دانیال نے اعتراف کیا۔

"اور جب شریف لڑکیاں اس وقت گھروں میں ہوتی ہیں تو ٹھیک ہے' میں جا رہی ہوں۔ اور کل سے نہیں آؤں گی۔"

اس نے اٹھنا چاہا تو دانیال نے تیزی سے اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کا بیگ چھین لیا۔

"ارے ارے مذاق کر رہا تھا' ایک تو تم اس قدر بدذوق ہو کہ مذاق بھی نہیں سمجھتی ہو۔"

"اچھا وہ مذاق تھا تو ٹھیک ہے لیکن دانی میاں! کم از کم مجھے پہلے بتا دیا کرو کہ یہ مذاق تھا۔"

"تم نے پھر مجھے میاں کہا۔ دادی اماں! سچی جب تم اس طرح کہتی ہو نا تو میرا سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے اور مجھے وہ میاں جی یاد آجاتے ہیں جن سے بچپن میں' میں نے قرآن پڑھا تھا۔ قسم سے ابھی تک میرے بدن پر ان کی چھڑیوں کے نشان ہیں۔ بید کی لچکیلی چھڑی اس زور سے لگتی تھی کہ آنکھوں میں تارے ناچ جاتے تھے۔ ذرا سا زیر زبر پیش میں فرق آیا اور پڑی میاں جی کی چھڑی۔" اس نے اس طرح بازو سہلایا جیسے ابھی ابھی میاں جی کی چھڑی پڑی ہو۔

"ہاں تو کل کیوں نہیں جا سکو گی عبیرہ کی طرف۔" بال پین دانتوں میں دبائے مامون جیسے کسی گہری سوچ سے چونکا تھا۔

"کل کرن کے سسرال والے اس کی شادی کی تاریخ لینے آ رہے ہیں اور امی نے مجھے الٹی میٹم دے دیا ہے کہ میں گھر سے باہر قدم نہ نکالوں۔"

"تو اس کا مطلب ہے تم پرسوں جاؤ گی۔"

"بالکل۔" صدف نے جواب دیا۔

"تو پھر ایسا کیوں نہ کریں۔ ہم سب مل کر چلیں اور عبیرہ کو رضامند کر لیں۔"

"کیا خبر وہ۔۔۔ میرا مطلب ہے' اس کے پاپا برا مانیں۔" دانیال نے کہا۔

"نہیں۔۔۔ وہ لوگ خاصے براڈ مائنڈڈ ہیں۔" صدف نے انہیں یاد دلایا۔

"یاد ہے' کتنی بار عبیرہ نے ہمیں اپنے گاؤں چلنے کی دعوت دی تھی اور لاسٹ ایئر تو اس نے وہاں سب ارینج بھی کر لیا تھا۔ بلکہ اس کے پاپا نے فون بھی کیا تھا مامون کے گھر کہ انہیں خوشی ہو گی کہ اگر عبیرہ کے کلاس فیلوز چھٹیوں میں ان کے گاؤں آئیں۔ بلکہ انہوں نے تفصیل سے بتایا تھا کہ ان کے ہاں کس کس قسم کے آم ہوتے ہیں۔"

"ہاں! یاد آگیا۔" دانیال نے سر کھجایا۔

"دراصل میری یادداشت کچھ کمزور ہو چکی ہے۔"

"بادام کھایا کرو۔"

"تمہارے ہی مشورے پر ایک بار کھانے کی کوشش کی تھی' لیکن منہ چھل گیا سارا۔"

"کس پاگل نے تمہیں چھلکوں سمیت کھانے کو کہا تھا۔"

"ایک ہی پاگل ہے' لیکن میری بدقسمتی کہ میں اسے پاگل نہیں سمجھتا حالانکہ۔۔۔" صدف نے ٹیبل پر سے بال پین اٹھا کر اس کی طرف پھینکا۔ لیکن اس نے جھکائی دے کر سر بچا لیا۔

"تو پھر یہ طے ہے کہ پرسوں ہم سب چلیں گے عبیرہ کی طرف۔" مامون نے ٹیبل پر پنسل بجا کر انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔

تب ہی دروازہ کھلا اور ملک غضنفر اندر داخل ہوئے۔ وہ تینوں اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے سلام کیا۔ ملک صاحب ان کے سلام کا جواب دیتے اور ہاتھ کے اشارے سے انہیں بیٹھنے کا کہتے ہوئے اندر آفس میں چلے گئے تو وہ تینوں بھی اپنی اپنی فائل کھول کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

"یہ عبداللہ کہاں ہے زہرا۔"

ماسٹر شفیق احمد نے کروٹ بدل کر زہرا بیگم کی طرف دیکھا جو جاء نماز پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

"ابھی تو یہاں ہی تھا۔ آپ سو گئے تو باہر چلا گیا' شاید صحن میں ہے۔" انہوں نے اٹھ کر جاء نماز تہہ کرتے ہوئے بتایا۔

"مغرب کا وقت نکل گیا۔ تم کم از کم مجھے جگا دیتیں۔" انہوں نے سامنے گھڑی پر نظر ڈالی اور

اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"ڈاکٹر نے آپ کو نیند کا انجکشن دیا تھا اور کہا تھا کہ آپ چار پانچ گھنٹے سوئیں گے، لیکن آپ تو دو گھنٹے بھی نہیں سوئے۔"

"ہاں، نیند میں بھی مجھے احساس تھا کہ شاید مغرب کا وقت نکلا جارہا ہے۔"

"آپ کے لیے نیند بہت ضروری تھی ماسٹر صاحب! آپ کو پتا ہے کتنی راتوں سے آپ جاگ رہے ہیں۔" زہرا بیگم چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

کمرے میں تین چارپائیاں بچھی تھیں۔ ایک طرف دو کرسیاں اور ٹیبل تھی۔ کرسیوں پر چار سوتی کے کشن اور بیک کور تھے۔ سادا سا صاف ستھرا کمرہ تھا۔ روشن اور ہوا دار۔

"ہاں، کھانسی بھی تو اتنی شدید تھی کہ لیٹا ہی نہیں جاتا تھا۔ آج تو شکر ہے سکون ہے۔"

"لیکن ڈاکٹر نے ایکسرے کے لیے کہا ہے۔ عبداللہ کہہ رہا تھا کہ وہ صبح آپ کو ایکسرے کے لیے لے جائے گا۔"

"میں نہیں کرواتا ایکسرے، کھانسی ہے کچھ دمے کی شکایت بھی لگتی ہے مجھے۔ خالص شہد منگوا کر کھاؤں گا تو کچھ دن میں آرام آجائے گا' وہ اللہ دین ہے نا چپڑاسی وہ پچھلے سال بھی خالص شہد لایا تھا گاؤں سے۔ اسکول جاؤں گا تو اس سے کہوں گا۔۔۔ وہ خود اتارتا ہے شہد اور ہاں عبداللہ نے میری اپلیکیشن بھجوادی تھی اسکول۔" انہوں نے تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بلکہ وہ خود ملا تھا ہیڈ ماسٹر صاحب سے۔"

"اور کیا کہا بھٹی صاحب نے؟"

"عبداللہ کہہ رہا تھا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ آپ آرام کریں اور اسکول کی فکر نہ کریں۔ آپ نے تو کبھی چھٹی نہیں کی۔ انتہائی ضروری موقعوں پر بھی نہیں تو بھلا انہیں کیا کہنا تھا۔ یاد ہے جب انعم پیدا ہوئی تھی تو اللہ بخشے چچی جان نے آپ سے کتنا کہا تھا کہ آپ چھٹی کرلیں زہرا کا جی مندا ہے لیکن آپ نے کہا۔ نہیں آج تو میٹرک کے لڑکوں کے داخلہ فارم جانے ہیں۔ میں کسی طرح چھٹی نہیں کرسکتا اور چچی جان مجھے اکیلی لے کر اسپتال گئیں اور جب آپ آئے تو انعم دنیا میں آچکی تھی۔"

زہرا بیگم کے نارمل لہجے میں جو ہلکا سا شکوہ چھپا تھا' وہ ماسٹر شفیق احمد سے چھپا نہ رہ سکا اور ان کے ہونٹوں کے کونوں پر مبہم سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوگئی۔

"زہرا بیگم! آپ ہماری یہ خطا کبھی معاف نہیں کریں گی۔ حالانکہ ہم نے پھر ثمن اور کومل کی پیدائش پر تلافی کردی تھی۔"

"ہاں ہاں۔ میں کوئی گلہ تو نہیں کررہی لیکن ماسٹر صاحب! وہ اس وقت چچی جان کے ساتھ اکیلے اسپتال میں جو احساسات تھے ان پر اس وقت بڑی شدید ضرب پڑی تھی۔ جب ڈاکٹر نے پوچھا تھا۔ بی بی آپ کے ساتھ مرد کوئی نہیں ہے۔ تو وہ تکلیف تو اب بھی کبھی کبھی یاد آجاتی ہے۔ یہ تو انسانی فطرت ہے۔ انسان خوشی کے لمحے بھول جاتا ہے لیکن غم کے لمحات تو نقش ہو جاتے ہیں۔ ان کی کسک ہمیشہ باقی رہتی ہے۔"

"یہ تو ہے۔ چلیں آج پھر اتنے سالوں بعد ہم ایک بار پھر آپ سے معافی مانگ لیتے ہیں۔" شفیق احمد نے سچ مچ ہاتھ جوڑ دیے تو زہرا بیگم نے بوکھلا کر کہا۔

"ارے ارے ماسٹر صاحب! یہ کیا کررہے ہیں۔ میں نے تو یونہی ایک بات کی تھی۔ میرا یہ مقصد تو نہ تھا۔"

"جانتا ہوں زہرا! آپ کا یہ مقصد نہ تھا' لیکن شاید کسک کچھ کم ہو جائے۔" وہ نچلے ہونٹ کا کونا دانتوں تلے داب کر مسکرائے تو وہ ان کی شرارت سمجھ کر مسکرادیں۔

"آپ بھی حد کرتے ہیں ماسٹر صاحب۔"

"ہمارے دل میں بھی ایک کسک ہے۔"

"کیا؟" زہرا بیگم نے بوکھلا کر انہیں دیکھا۔

"یہ کہ آپ نے ہمیں کبھی ماسٹر صاحب کے بجائے شفیق یا شفو کہہ کر بلایا ہوتا۔ آپ کو یاد ہے جب پہلی بار اماں کے ساتھ میں آپ کے گھر آیا تھا تو آپ اچانک ہی ایک کمرے سے نکلی تھیں اور پھر ماسٹر صاحب السلام علیکم کہہ کر واپس کمرے میں گھس گئی تھیں۔"

زہرا بیگم محجوب سی ہوگئیں۔

"ویسے ایک بات بتاؤں زہرا بیگم! مجھے اسی وقت اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔ جب اسپتال پہنچا تھا تو اسٹاف نرس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لے کر عجیب سے انداز میں کہا تھا۔ "اچھا تو آپ ہیں زہرا بیگم کے شوہر۔"

"دراصل عورت کو ہمیشہ مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ عورت مرد کے بغیر معتبر نہیں ہوتی کبھی بھی۔ وہ جہاں بھی جائے اسے مرد کا حوالہ دینا ہوتا ہے۔ مرد کے حوالے کے بغیر اس کی حیثیت تنکے سے بھی کم ہے۔ خواہ وہ حوالہ باپ کا ہو' بھائی کا ہو یا شوہر کا۔" زہرا بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"میں بھی ہردم انعم کے لیے پریشان رہتی ہوں۔"

"تمہیں انو کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ عبداللہ ہے نا۔"

"ہاں لیکن انو نے بی۔ اے کرلیا ہے جب کہ عبداللہ کو سیٹل ہونے میں ابھی چار پانچ سال

تو لگیں گے اور لڑکیاں تو پچیس سے اوپر ہوئیں تو لوگ کہنے لگتے ہیں۔ عمر زیادہ ہو گئی ہے۔ عمر زیادہ ہو گئی ہے۔۔۔ ابھی کل پروین آپا آئی تھیں۔ پوچھ رہی تھیں۔ انعم کے لیے کچھ سوچا۔۔۔ لڑکیوں کی یہی عمر ہوتی ہے۔"

"پروین آپا کو میری بچیوں کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

شفیق احمد جو بہت ہلکے پھلکے انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ انہیں پروین آپا پسند نہ تھیں حالانکہ رشتے میں وہ ان کی چچا زاد بہن لگتی تھیں، لیکن شادی کے ابتدائی دنوں میں انہوں نے انہیں زہرا بیگم کے متعلق خوب ورغلایا تھا اور وہ غصے میں آ کر طلاق ہی دے دیتے زہرا بیگم کو لیکن ان کی والدہ نہ صرف عقل مند اور باشعور تھیں بلکہ پروین کی خصلت کو بہت اچھی طرح پہچانتی تھیں۔۔۔ پھر ثمن کی پیدائش اور کومل کی پیدائش پر بھی انہوں نے کس قدر ورغلایا تھا انہیں کہ وہ بیٹے کی خاطر دوسری شادی کر لیں۔

بلکہ ایک دن تو حد ہی کر دی۔ کچھ خواتین کو گھر لے آئیں اور بڑے فخر سے بتایا کہ انہوں نے شفیق احمد کے لیے لڑکی نہ صرف پسند کر لی ہے بلکہ ہاں بھی کروا لی ہے اور اب لڑکی کی ماں، بہن کو گھر دکھانے اور شفیق احمد سے ملوانے لائی ہیں۔ سو وہ پروین آپا کے گھر زیادہ آنا جانا پسند نہ کرتے تھے۔

"اور ہاں عبداللہ سے کہہ دینا' دو ایک روز تک ایم۔ اے کے ایڈمیشن کھل جائیں گے۔ یونیورسٹی سے انعم کے لیے ایڈمیشن فارم لے آئے۔"

"لیکن وہ پروین آپا کہہ رہی تھیں کہ ایم اے پاس لڑکیوں کے لیے خاندان میں تو کوئی بر نہیں ہے اس لیے بہتر ہے کہ انعم یونیورسٹی۔۔۔"

"فار گاڈ سیک زہرا۔" شفیق احمد نے غصے سے ان کی بات کاٹی۔

"مجھے پروین آپا کی کہی گئی فضول باتیں مت بتایا کرو۔ میری بچیاں انشاءاللہ اعلا تعلیم حاصل کریں گی اور جب تک اور جہاں تک انہوں نے پڑھنا ہے' میں پڑھاؤں گا۔"

"ثمن ڈاکٹر بننا چاہتی ہے تو کیا آپ اسے ڈاکٹر بنائیں گے؟"

"ہاں' اس میں کیا حرج ہے۔"

"حرج ہے۔ ماسٹر صاحب! کیا خاندان میں دور نزدیک کوئی لڑکا ہے ڈاکٹر۔ بڑی مصیبت ہو جائے گی۔"

"یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ثمن ڈاکٹر بنے گی تو اس کے لیے ڈاکٹر لڑکے کا ہی رشتہ چاہیے۔ کوئی بھی اچھا لڑکا ہو سکتا ہے' یہ تم عورتوں نے خود ہی خود فرض کر لیا ہے کہ لڑکی اگر ڈاکٹر بن گئی ہے تو اس کے لیے ڈاکٹر لڑکے کا رشتہ ہی موزوں رہے گا۔ اور اب اس فضول بحث

کو ختم کرو۔ اور بچیوں کے لیے پریشان مت ہو۔ انعم کے لیے تمہیں کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس کے لیے بہت پہلے سوچ چکا ہوں۔ رہی ثمن اور کومل تو ان کے لیے سوچتی رہنا لیکن ابھی وہ پڑھ رہی ہیں' یہ دھیان میں رکھنا اور یہ بھی ذہن میں رکھ لو کہ میں ثمن کو خاندان کے کسی جاہل ان پڑھ لڑکے سے نہیں بیاہوں گا۔ اگر خاندان برادری میں اچھا رشتہ نہ ملا تو میں خاندان سے باہر کے کسی رشتے کو قبول کرتے ہوئے بالکل نہیں ہچکچاؤں گا اور یہ بات پروین آپا کے کان میں ڈال دو کہ ان کے کبوتر باز بیٹے کے لیے تو میرے دل میں ذرا بھی گنجائش نہیں ہے۔ اماں نے کتنا کتنا سمجھایا تھا کہ عبدالواحد کے اتنے لاڈ مت اٹھاؤ۔ ذرا کسی ٹیچر نے کچھ کہہ دیا۔ کلاس میں تو بستہ اٹھا کر صاحبزادے بسورتے ہوئے گھر آ گئے اور اماں نے بغل میں داب لیا۔ یہ نہ کیا کہ ایک تھپڑ لگا کر واپس اسکول بھیج دیں۔" شفیق احمد کا سانس پھول گیا۔

"آپ غصہ نہ کریں ماسٹر صاحب! یونہی باتوں میں بات نکلی تھی ورنہ ثمن تو ابھی بالکل بچی ہے۔ آپا نے دو ایک بار ڈھکے چھپے لفظوں میں اشارہ دیا ہے ثمن کے لیے' لیکن اب کے ایسی بات ہوئی تو میں صاف کہہ دوں گی۔"

"بالکل ابھی سے کلیئر کر دو' اس آس پر بٹھائے نہ رکھیں' عبدالواحد کو۔"

"امی! امی! دیکھیں یہ ثمو باجی مجھے مارتی ہیں۔" کومل بھاگتی ہوئی اندر آئی تو باہر سے عبداللہ کی آواز آئی۔

"کومل گڑیا! آ جاؤ میں نے ثمن کے کان کھینچے ہیں۔"

"لیکن میں ثمن باجی سے نہیں پڑھوں گی۔ وہ ذرا سی غلطی پر مارتی ہیں اور کاپی پر کراس بھی لگا دیتی ہیں۔" اس نے کمرے کے اندر سے ہی چیخ کر کہا۔ "میں آپ سے پڑھوں گی۔"

"او کے گڑیا! میں ہی پڑھا دیتا ہوں۔ تم فٹافٹ آ کر ہوم ورک مکمل کرو۔" کومل نے مڑ کر ماں باپ کی طرف دیکھا۔ مسکرائی اور باہر نکل گئی۔

ثمن سیکنڈ ایئر میں تھی اور کومل ابھی سیونتھ میں پڑھتی تھی۔ وہ ثمن سے تقریباً پانچ سال چھوٹی تھی' لیکن سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے اس میں بچپنا بہت تھا اور پھر سب ہی اس سے لاڈ بھی بہت کرتے تھے۔ سرخ و سفید رنگت' بڑی بڑی آنکھیں خوبصورت سی ناک انعم ہمیشہ پیشانی پر سے اس کے بال کاٹ دیتی تھی۔ موٹی موٹی دو چٹیا کیے اور پیشانی پر سے کٹے بالوں کی وجہ سے وہ بالکل بچی لگتی تھی۔

"عبداللہ ثمن کو پڑھا رہا تھا تو اٹھ کر غالباً" آپ کی دوائیں لینے میڈیکل اسٹور تک گیا تھا اور ثمن سے کہہ گیا تھا کہ وہ کومل کو میتھس کا ہوم ورک کروا دے۔ اور ثمن تو برداشت ہی نہیں کر سکتی کوئی غلطی۔۔۔ اتنی جلدی غصہ آتا ہے اسے۔" زہرا بیگم تفصیل بتاتے ہوئے اٹھیں۔

"آپ اس وقت کچھ لیں گے۔ سوپ یا دودھ؟"

"تھوڑا دودھ لے آؤ۔ سوپ کا موڈ نہیں ہے لیکن خالص دودھ مجھ سے پیا نہیں جائے گا' اس میں تھوڑا سا چائے کا رنگ لگا لینا۔" انہوں نے خوشگوار سے لہجے میں کہا۔

"اور یہ عبداللہ آج چیمبر نہیں گیا یا جلدی آ گیا ہے؟"

"وہ آج گیا ہی نہیں آپ کی وجہ سے۔ ڈاکٹر کو لانا تھا۔ بہت فکر مند تھا آپ کے لیے۔"

"ہاں۔" شفیق احمد کی آنکھوں میں محبت اور فخر کی چمک تھی۔ "اگر میرا اپنا بیٹا بھی ہوتا تو میں اسے ایسا ہی بنانا چاہتا جیسا عبداللہ ہے۔"

"بھتیجا بھی تو بیٹا ہی ہوتا ہے ماسٹر صاحب اور مجھے تو کبھی محسوس نہیں ہوا کہ عبداللہ میرا بیٹا نہیں ہے۔ تب انعم ابھی میری گود میں نہیں آئی تھی جب بھابھی اور بھائی جان کا حادثہ ہوا۔ اور عبداللہ پانچ چھ سال کا بچہ کس قدر سہما ہوا تھا ماں باپ کی اچانک وفات سے۔ میں نے ممتا کا جذبہ پہلی بار اسے ہی سینے سے لگا کر محسوس کیا تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے وہ ہی میرا پہلوٹھی کا بیٹا ہے۔ حالانکہ تب مجھے خبر نہیں تھی کہ اللہ مجھے صرف بیٹیاں ہی دے گا اور بیٹے کی کمی عبداللہ کو ہی پورا کرنی ہے۔"

"ہر بات میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے زہرا۔ وہ اپنے کاموں کو زیادہ بہتر جانتا ہے اور بہتر کرتا ہے بندوں کے لیے۔"

"ہاں۔ کس قدر خوفناک حادثہ تھا۔ ویگن کا ایک مسافر بھی نہیں بچ سکا تھا۔ بھاری ٹرک نے ویگن کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ لیکن اللہ کی قدرت کہ عبداللہ کو خراش تک نہ آئی' حالانکہ بھائی جان اور بھابھی کی تو لاشیں بھی نہیں پہچانی جا رہی تھیں۔" شفیق احمد کے چہرے پر اداسی پھیل گئی۔

وہ ہی تو بھائی تھے۔ وہ بڑے بھائی رفیق احمد ان کی شادی سے پہلے ہی لاہور میں جاب کر رہے تھے اور وہیں اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ رہتے تھے' لیکن بیوی کی بیماری کی وجہ سے عبداللہ زیادہ تر ننھیال میں رہتا تھا۔ اس روز وہ قصور سے عبداللہ کو اس کی نانو کے گھر سے لا رہے تھے کہ یہ حادثہ ہو گیا۔

اب ان کی بیوی بالکل صحت یاب ہو چکی تھیں اور یوں بھی عبداللہ پانچ سال کا ہونے والا تھا۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ وہ اسے لاہور لے آئیں اور اس کا تعلیمی سلسلہ بھی شروع کیا جائے' لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ان کے آفس کے ایک کولیگ نے شفیق احمد کو اطلاع دی تھی کہ رفیق صاحب بھی اس حادثے والی ویگن میں تھے۔ سامان سے ان کا شناختی کارڈ ملا تھا اور پھر تصویر سے بھی اس کی تصدیق ہو گئی تھی کہ رفیق صاحب' ان کی بیوی اور بچہ

اسی ویگن میں سوار ہوئے تھے عبداللہ کے نانا خود انہیں اسٹاپ تک چھوڑنے آئے تھے اور اسی ظالم ویگن میں سوار کیا تھا۔ ماں اور زہرا بیگم کو روتا پیٹتا چھوڑ کر وہ لاشیں لینے اکیلے لاہور پہنچے تھے۔

"چچا جان! اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

عبداللہ دستک دے کر اندر آ گیا تو وہ چونکے۔

سنجیدہ' بردبار اور شاندار شخصیت کا مالک عبداللہ چھ فٹ کے قریب قد' گندمی رنگ' کشادہ پیشانی' بھرے بھرے ہونٹ' سیاہ بال جن میں ہلکے گھونگھر تھے۔

"یا رب! تیرا شکر ہے۔ تو کس کس طرح نوازتا ہے بندے کو۔ آج عبداللہ کا اونچا لمبا وجود کتنا سکھ دیتا ہے مجھے۔"

"ٹھیک ہوں بیٹا! آؤ بیٹھو' ادھر میرے پاس۔" انہوں نے اپنے قریب ہی ذرا کھسک کر جگہ بنائی۔

"چچی جان نے بتایا ہے کہ آپ جاگ رہے ہیں۔"

"ہاں۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔"

"کچھ دیر اور سو لیتے تو اچھا تھا۔"

"ابھی بھی نیند تو محسوس ہو رہی ہے' لیکن عشاء پڑھ کے ہی اب تو لیٹوں گا۔ مغرب بھی چلی گئی جس کا بہت افسوس ہے مجھے۔ تم نے پڑھی نماز۔"

"نہیں۔ وہ میں آپ کی دوائیاں لینے چلا گیا تھا۔" عبداللہ شرمندہ ہو گیا۔

"مجھے ہمیشہ تم پر ہر مقام پر فخر رہا ہے عبداللہ! لیکن ایک بات ایسی ہے جہاں کبھی کبھی تم ڈنڈی مار جاتے ہو۔ سمجھ رہے ہو نا۔"

"جی۔" عبداللہ نے سر جھکا لیا۔

وہ کتنی ہی کوشش کرتا تھا کہ کوئی نماز قضا نہ ہو' لیکن پھر بھی کبھی نہ کبھی کوئی نماز رہ ہی جاتی تھی۔

"نماز ہر کام سے افضل ہے بیٹا! کوئی ایمرجنسی تو تھی نہیں۔ آپ کچھ دیر بعد دوائیں لے آتے۔"

"جی چچا جان! آئندہ خیال رکھوں گا۔" اس نے یونہی سر جھکائے جھکائے کہا۔

اور شفیق احمد کا جی چاہا' وہ اس قادر مطلق کے سامنے بے اختیار سجدہ شکر بجا لائیں۔ جس نے انہیں اتنا اچھا' اتنا فرماں بردار بیٹا دیا تھا۔

بلکہ انہوں نے ہمیشہ رب کا شکر ہی ادا کیا تھا اور زہرا کو بھی اس کی تلقین کی تھی۔ اماں جان

بھی باشعور تھیں کہ انہوں نے کبھی پوتا نہ ہونے پر زہرا کو کوئی طعنہ دیا تھا اور نہ ہی کبھی شفیق احمد کی دوسری شادی کا سوچا تھا لیکن اللہ کی مصلحتیں۔۔۔۔ کیا خبر اپنے بیٹے کے ہوتے وہ عبداللہ سے اپنی محبت نہ کر پاتے۔

اور شاید زہرا بھی اسے اتنا پیار نہ دے پاتیں اور اس کی پرورش میں ان سے کوتاہی ہو جاتی تو روز محشر وہ جواب دہ ہوتے۔

کبھی کبھی تو انہیں یوں لگتا تھا' جیسے وہ عبداللہ سے انعم' ثمن اور کومل سے بھی زیادہ محبت کرتے ہیں۔ انہیں لگتا تھا جیسے عبداللہ ان کے لیے بہت بڑی ڈھال ہے۔ کوئی مشکل لمحہ آیا تو وہ سپر بن جائے گا سب کے لیے۔ باشعور' فرماں بردار' نیک اور سمجھ دار اولاد والدین کے لیے نعمت سے کم نہیں ہوتی اور ایسی اولاد پر وہ جتنا بھی فخر کریں کم ہے اور ماسٹر شفیق احمد کو عبداللہ پر بجا فخر تھا۔

بچپن سے وہ بے حد ذہین اور سمجھ دار بچہ تھا۔ جب سے وہ اس گھر میں آیا تھا نہ تو اس نے کبھی بچپن ہی میں ضد کی تھی اور نہ ہی کبھی زہرا شفیق احمد کو اس کے سلسلے میں کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

"چچا جان! آپ کیا سوچ رہے ہیں۔"

"کچھ نہیں۔ یوں ہی تمہارے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"کیا؟" وہ مسکرایا۔

"یہی تمہارے فیوچر کے متعلق۔"

"میرا فیوچر انشاءاللہ بہت برائٹ ہوگا چچا جان۔ میں جانتا ہوں کہ امی اور آپ۔۔۔۔ (وہ اکثر زہرا بیگم کو امی جان ہی کہتا تھا کیونکہ یہ زہرا بیگم کی ہی خواہش تھی کہ عبداللہ انہیں چچی جان کے بجائے امی ہی کہا کرے) چاہتے تھے کہ میں ڈاکٹر یا انجینئر بن جاؤں لیکن پتا نہیں کیوں میں سمجھتا ہوں کہ شاید میں ڈاکٹر یا انجینئر بن کر اتنا کامیاب نہ ہو سکتا تھا جتنا وکیل بن کر۔ مجھے شروع سے ہی وکیل بننا پسند تھا۔ میں نے شاید یہاں آپ کو مایوس کیا ہے۔"

"ارے نہیں بیٹا۔" شفیق احمد نے ایک محبت بھری نظر اس پر ڈالی۔ "میں بچوں پر جبر کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ اور سمجھتا ہوں کہ انہیں وہی تعلیم حاصل کرنا چاہیے جس کی طرف ان کا رجحان ہو۔۔۔۔ رہی ڈاکٹر بننے کی بات تو تمہاری امی جان کا شوق ان کی بیٹی جو پورا کرے گی۔"

انہوں نے ٹرے اٹھائے اندر آتی ثمن کو دیکھ کر کہا تو ثمن نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے مسکرا کر انہیں دیکھا۔

"انشاءاللہ۔"

"اچھا ڈاکٹرنی صاحبہ! تم بیٹھو چچا جان کے پاس گپ لگاؤ۔ مجھے کہیں جانا ہے۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

"اس وقت کہاں جاؤ گے بیٹا۔" شفیق احمد کچھ پریشان سے ہو گئے۔ وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ عبداللہ دیر تک باہر رہے۔ ہاں جب سے اس نے ملک صاحب کو جوائن کیا تھا تو عموماً" اسے دیر ہو جاتی تھی۔ کبھی ساڑھے آٹھ کبھی نو بج جاتے تھے۔

"کہیں نہیں چچا جان! وہ یہاں قریب ہی پی۔ سی۔ او تک جاؤں گا۔ ماموں سے کچھ ضروری بات پوچھنا ہے۔"

"کیا اپنا فون ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا۔"

"نہیں چچا جان! آج بھی کمپلین کروائی تھی۔" وہ انہیں بتاتے ہوئے باہر نکل گیا اور شفیق احمد ثمن کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگے۔

جانے کب۔ جانے کب سب کچھ ٹھیک ہو گا ہر محکمے میں۔۔۔۔

جانے کب آنکھوں میں سجے خوابوں کو تعبیر ملے گی اور جانے کب لوگ آزادی کی قیمت جان پائیں گے اور جانے کب ہم اپنا احتساب کر پائیں گے۔ اوپر سے لے کر نیچے تک ہر جگہ کرپشن' دھوکا' فریب۔

زندگی کے بے حساب تجربے آنکھوں کے سامنے آتے چلے گئے اور انہوں نے اپنے اندر ایک گہرے درد کو بیدار ہوتے اور بھرپور وجود میں پھیلتے پایا۔۔۔۔ اور انہوں نے بہت کرب سے بے آواز دعا کی۔

"میرے رب! میرے لوگوں کے دلوں سے خود غرضی' لالچ اور ہوس ختم کر دے۔ میرے مولا ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت پیدا فرما۔ فرقہ پرستی' تعصب اور نفرت کو ختم کر دے اور میرے ملک کو ایک مثالی ملک بنا دے۔"

انہوں نے دودھ کے چند گھونٹ پی کر کپ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"آپ نے تو آدھا کپ بھی نہیں پیا ابو۔" ثمن نے ان کی طرف دیکھا۔ "تھوڑا سا اور پی لیں۔"

"نہیں اور جی نہیں چاہ رہا۔"

انہوں نے تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں موند لیں تو ثمن ٹرے میں کپ رکھ کر باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

"اوئے! یہ منہ اٹھائے کیوں کھڑا ہے الو کی کان۔" چوہدری نیاز نے غصے سے عبدالقادر کی طرف دیکھا۔

"تونے سنا نہیں میں نے کیا کہا ہے اس مولوی کے بچے کو لے کر آ۔ بڑا آیا کہیں سے عالم فاضل۔ ہمیں سبق سکھاتا ہے۔ ہمیں بتاتا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔"

چوہدری نیاز نے عادتاً ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی گھمائی۔ یہ نازک سی اسٹک جس کی شام سونے کی تھی ہمیشہ ان کے ہاتھوں میں رہتی تھی' اور یہ عبدالقادر ہی جانتا تھا کہ یہ اسٹک دیکھنے میں جتنی نفیس اور نازک تھی بدن پر اتنی نزاکت سے نہیں لگتی تھی۔ اب بھی بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹ کر اس نے خود کو بچانے کی کوشش کی تھی' لیکن پھر بھی چھڑی نے اس کی ناک کو نشانہ بنایا تھا۔ شدید تکلیف سے مجبور ہو کر اس نے بائیں ہاتھ سے ناک کو سہلایا اور دایاں ہاتھ پیشانی تک لے جا کر چوہدری نیاز کو سلام کیا۔

"سلام چوہدری جی! بس ابھی جاتا ہوں' لیکن میں سوچ رہا ہوں جی کہ مولوی صاحب تو بہت اللہ والے ہیں جی وہ تو ــــ"

چوہدری نیاز کی چھڑی پھر گھومی۔ اب کے عبدالقادر خود کو نہ بچا سکا تھا اور چھڑی اس کے دائیں گال پر نشان چھوڑتی ہوئی واپس ہو گئی تھی۔

"اب تو بھی سوچنے لگا ہے۔" انہوں نے قہقہہ لگایا اور ان کے حلق سے یوں آوازیں نکلیں' جیسے کسی کنستر میں بہت سے روڑے ڈال کر اسے ہلایا جائے۔ ان کا قہقہہ اسی طرح کا ہوتا تھا اور جب بھی وہ ہنستے تو یوں لگتا جیسے رو رہے ہوں۔

عبدالقادر گال سہلاتا ہوا الٹے قدموں باہر نکلا اور حویلی کا وسیع صحن عبور کرتا ہوا باہر نکل آیا۔

اسے مولوی صاحب سے بڑی اندھی عقیدت تھی۔ پتا نہیں کیوں اسے لگتا تھا جیسے مولوی اللہ یار' بہت اللہ والے ہوں۔ جیسے وہ کوئی رحمت کا فرشتہ ہوں' جنہیں اللہ نے ان کے گاؤں میں بھیج دیا ہو۔ جب وہ اس گاؤں میں آئے تھے تو سب سے پہلے عبدالقادر نے ہی انہیں دیکھا تھا۔

وہ ساتھ والے گاؤں سے پڑھ کر آ رہا تھا۔ ان کے گاؤں میں صرف پرائمری تک اسکول تھا جبکہ ساتھ والے گاؤں میں مڈل اسکول تھا اور اس کے باپ کو بہت شوق تھا کہ عبدالقادر پڑھ لکھ کر کہیں شہر میں جا کر نوکری کر لے سو اس نے اسے دوسرے گاؤں میں داخل کروا دیا تھا۔ اور ان دنوں وہ آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ خود اسے بھی پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اپنے ہی دھیان میں مگن چلتے چلتے جب وہ مولوی ہدایت اللہ کے گھر کے پاس پہنچا تو ٹھٹک کر رک گیا۔

مولوی صاحب کی گھر کی دیوار سے ٹیک لگائے کوئی بیٹھا تھا۔ اس کے کپڑے ملگجے تھے اور

آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑی جمی تھی۔

"اے بھائی۔" عبدالقادر نے دو تین بار بلایا لیکن جب اجنبی نے جواب نہ دیا تو عبدالقادر نے بازو پکڑ کر ہلایا۔ اور چونک گیا۔

اجنبی آگ کی طرح تپ رہا تھا۔ بازو ہلانے پر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں سرخی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے عبدالقادر ساکت کھڑا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"بھائی! کہاں سے آئے ہو۔ کہاں جانا ہے؟"

"کہاں سے آیا ہوں؟ کہاں جانا ہے؟ پتا نہیں۔" اجنبی نے آہستگی سے کہا یوں جیسے خود سے بات کی ہو اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

عبدالقادر کچھ دیر متذبذب سا کھڑا رہا۔ شاید بخار سر کی طرف چڑھ گیا ہے۔ اس نے سوچا اور اس کا جی نہ چاہا کہ وہ اجنبی کو ایسی حالت میں چھوڑ کر چلا جائے۔ وہ بستہ زمین پر رکھ کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور پھر آہستگی سے اس کا بازو ہلایا۔

"بھائی! کس کے مہمان ہو اور کس کا گھر تلاش کر رہے ہو؟"

"کس کی تلاش ہے؟" اجنبی نے پھر آنکھیں کھول دیں۔

"ہاں۔ تلاش تو ہے کسی کی۔ پر تلاش پر بھی کوئی کہاں ملا ہے اور تلاش تو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ہے نا۔" اس نے عبدالقادر کی آنکھوں میں جھانکا۔

عبدالقادر سٹپٹا گیا۔

عجب دل پر اثر کرتا ہوا لہجہ تھا اس کا۔

"آپ مجھے بتاؤ بھائی۔ میں آپ کی مدد کرتا ہوں۔ کہاں جانا ہے آپ کو؟" عبدالقادر نے پھر کہا۔

"تم میری مدد کرو گے۔" اجنبی ہولے سے ہنسا۔

"کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا۔ اپنے لیے راستے تو خود ہی تلاشنے پڑتے ہیں۔ ہاں خود ہی۔"

اجنبی نے اٹھنے کی کوشش کی اور لڑکھڑا گیا۔ عبدالقادر نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی تو اس نے ہاتھ جھٹک دیا اور ایک غصیلی نظر عبدالقادر پر ڈالی۔ عبدالقادر سہم گیا اور اس نے جھک کر بستہ اٹھایا۔ اجنبی کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی مگر وہ چل رہا تھا۔ عبدالقادر نے بھی اس کے پیچھے ہی قدم بڑھایا لیکن اجنبی دو قدم چل کر ہی گر پڑا تھا۔ اس کی پیشانی زمین پر پڑے نوکیلے پتھر کے لگنے سے زخمی ہو گئی تھی۔ عبدالقادر نے دوڑ کر اسے سیدھا کیا۔ بڑھی ہوئی داڑھی۔ روشن' کشادہ پیشانی۔ عبدالقادر کی نظر مولوی ہدایت اللہ کے دروازے پر پڑی۔

"اوہ۔" اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔

"ضرور یہ اجنبی مولوی صاحب کا مہمان ہو گا۔ میں بھی کتنا پاگل ہوں۔" اس نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا ڈالا۔

"مولوی صاحب! آپ کا مہمان دروازے پر بے ہوش پڑا ہے۔" مولوی ہدایت اللہ کو دیکھتے ہی عبدالقادر نے بتایا تو مولوی صاحب باہر نکلے۔ اجنبی کو دیکھا۔

"آپ کے مہمان ہیں نا جی۔" مولوی ہدایت اللہ نے سر ہلا دیا۔ اور عبدالقادر کی مدد سے اجنبی کو اٹھا کر گھر کے اندر لے گئے اور صحن میں بچھی چارپائی پر لٹاتے ہوئے اس کی پیشانی کا زخم دیکھا۔

معمولی زخم تھا پھر بھی انہوں نے آواز دے کر بیوی کو گرم پانی اور روئی لانے کے لیے کہا اور عبدالقادر سے درخواست کی کہ گھر جاتے ہوئے حکیم صاحب کو بھیج دے۔

مولوی ہدایت اللہ کئی برس پہلے اس گاؤں کی مسجد کے پیش امام مقرر ہو کر آئے تھے۔ یتیم خانے میں پرورش پائی تھی اور دارالعلوم حنفیہ رضویہ سے دینی تعلیم حاصل کی تھی اور وہاں سے ہی ایک روز مولوی صدیق نے انہیں خوشخبری دی تھی۔

"صدر ایوب خان نے گاؤں کی مساجد میں امام متعیّن کرنے کے لیے کہا ہے تنخواہ بھی ملے گی۔" اور مولوی ہدایت اللہ نے جو سوچ رہے تھے کہ فارغ التحصیل ہو کر کہاں جائیں گے۔ اس آفر کو نعمت خداوندی سمجھا تھا اور تب سے ہی وہ اس گاؤں میں تھے۔ گاؤں کے ہی ایک غریب گھرانے میں ان کی شادی ہو گئی تھی اور اب دو بیٹیاں بھی تھیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ لاہور جیسے شہر میں گزارا تھا۔ ایک نظر نے ہی انہیں بتا دیا تھا کہ یہ نوجوان کسی اعلا گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ ہاتھ پر بندھی رولکس گھڑی اور جسم کا لباس گو ملگجا تھا لیکن قیمتی تھا۔

انہوں نے لمحہ بھر میں ہی سوچ لیا تھا کہ وہ عبدالقادر کی بات کا جواب اثبات میں دیں گے۔ نہ جانے کون مصیبت زدہ ہے۔ زندگی کے اس سفر میں طویل تجربے ہو چکے تھے انہیں۔۔۔ کیا خبر دشمنوں سے بچ کر آیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ چوہدری نیاز یا اعجاز کے ظلم کا شکار ہو۔۔۔ سو جب عبدالقادر حکیم صاحب کو لے کر آیا تو انہوں نے یہی بتایا کہ رشتے میں ان کا بھتیجا لگتا ہے۔ ان سے ملنے چلا آیا۔

"اتنے عرصہ بعد آپ کا کوئی عزیز یہاں آیا ہے۔" حکیم صاحب نے اجنبی کا معائنہ کیا۔

"بس جی۔ یہاں آیا تو پھر یہاں کا ہی ہو گیا۔ قریبی عزیز تو کوئی نہ تھا بس رشتے کے بہن بھائی تھے۔" مولوی ہدایت اللہ کی نظریں اجنبی پر تھیں۔

"خطرے کی تو کوئی بات نہیں حکیم صاحب!"

"بخار بہت تیز ہے اور نقاہت بھی ہے۔ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھیں پہلے۔ تاپ کم ہو تو پھر یہ دوا دے دیجیے گا۔ عبدالقادر کو میرے ساتھ بھیجیں۔ میں دوا دے دیتا ہوں۔"

حکیم صاحب اُٹھے تو مولوی ہدایت اللہ نے عبدالقادر کو دوا کے پیسے پکڑانا چاہے۔

"کیسی بات کرتے ہیں مولوی صاحب! آپ کا مہمان ہمارا مہمان ہے۔ مہمان تو پورے گاؤں کا سانجھا ہوتا ہے۔"

مولوی صاحب خاموش ہو گئے اور عبدالقادر جس نے بستہ اٹھا لیا تھا۔ بستہ دوبارہ صحن میں رکھ کر حکیم صاحب کے ساتھ دوا لینے چلا گیا۔ اور جب دوا لے کر واپس آیا تو مولوی صاحب اجنبی کے ماتھے پر پٹیاں رکھ رہے تھے۔

"مولوی جی! میں رکھوں پٹیاں۔" عبدالقادر نے آفر کی۔

"نہ بیٹا! تو اب گھر جا۔ تیری ماں فکر کرتی ہو گی اور باپ بھی۔"

عبدالقادر کو بھی ماں کی طبیعت کا پتا تھا' اس لیے گو اس کا جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا' پھر بھی مولوی صاحب کو سلام کر کے چلا گیا۔ لیکن دوسرے دن اسکول سے واپسی پر اس نے غیر ارادی طور پر ہی مولوی صاحب کا دروازہ کھٹکھٹا دیا تھا۔ اور مولوی صاحب نے دروازہ کھولا۔

"آؤ عبدالقادر! آجاؤ۔"

"مہمان کی طبیعت کیسی ہے۔"

"بخار کم تو ہے لیکن اُترا نہیں۔"

عبدالقادر نے صحن اور برآمدے میں نظر دوڑائی۔ تو مولوی صاحب نے اس کی نظروں کا مطلب سمجھ کر بتایا کہ وہ کمرے میں ہے۔

"دوا وغیرہ تو نہیں لانی۔"

"نہیں۔ ابھی تو ہے۔"

مولوی صاحب نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور کونے میں بنے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ اجنبی گھٹنوں پر سر رکھے دونوں بازو گھٹنوں کے گرد حمائل کیے بیٹھا تھا۔

"السّلام علیکم جی۔"

عبدالقادر نے سلام کیا تو اس نے گھٹنوں سے سر اٹھایا ویسی ہی سرخ آنکھیں۔ کھوئی کھوئی سی نظر اس پر ڈال کر اس نے پھر سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔

عبدالقادر کچھ دیر بیٹھ کر اور مولوی صاحب کو دوبارہ حکیم صاحب کو دکھانے کا مشورہ دے کر اپنے گھر آ گیا تھا لیکن اس کے دل میں نہ معلوم کیوں اجنبی کے لیے ایک نرم سا گوشہ پیدا ہو

گیا۔ وہ اسکول سے واپسی پر ہر روز ہی اجنبی کا احوال پوچھنے چلا جاتا مولوی صاحب کا گھر گاؤں کی حدود شروع ہوتے ہی آجاتا تھا۔ دو تین گھر چھوڑ کر اور گھر سے چند گز کے فاصلے پر چھوٹی سی مسجد تھی۔

اجنبی کا بخار اتر بھی گیا تھا' پھر بھی وہ بات چیت نہیں کرتا تھا۔ خاموش بیٹھا خلاؤں میں دیکھتا رہتا۔ اور جو بات کرتا بھی تو وہ بہت مبہم اور الجھی ہوئی سی ہوتی تھی۔

"مولوی صاحب کا بھتیجا اللہ والا ہے۔" پورے گاؤں میں مشہور ہو گیا تھا۔

کوئی کہتا "سائیں ہے۔"

اب وہ اکثر مولوی صاحب کے گھر سے نکل کر باہر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا یا پھر پیپل کے نیچے بیٹھ کر اس کے گرے ہوئے پتے اکٹھے کرتا رہتا۔ ایک روز حسبِ معمول اسکول سے واپسی پر عبدالقادر اجنبی کے پاس مولوی صاحب کے گھر سے باہر بیٹھا تھا کہ اجنبی نے اچانک سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تم کون ہو؟"

"میں!" عبدالقادر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"میں جی عبدالستار حجام کا بیٹا ہوں۔" اس کی آواز میں خود بخود ایک فخر سا جھلکنے لگا تھا۔ اجنبی کی آنکھوں میں اچانک دلچسپی کی چمک نظر آئی ہونٹوں پہ مدھم سی مسکراہٹ ابھری۔

"تم اچھے لڑکے ہو۔" عبدالقادر کا سینہ خوشی سے بھر گیا۔ آج تک کسی نے اس کی تعریف نہیں کی تھی۔

"آپ جی اب ادھر ہی رہو گے مولوی صاحب کے پاس یا واپس چلے جاؤ گے۔" خوشی سے اس کی آواز ہلکی ہلکی کانپ رہی تھی۔

"واپسی کا تو کوئی راستہ نہیں ہوتا۔" اجنبی کی مسکراہٹ معدوم ہو گئی اور آنکھیں پہلے جیسی لگنے لگیں۔ کھوئی کھوئی سی۔

"کیا ہوتا ہے۔۔۔؟" اس کی سوالیہ نظریں عبدالقادر کی طرف اٹھیں "بتا کیا ہوتا ہے واپسی کا راستہ؟"

اس نے سوال دُہرایا۔ آواز قدرے بلند تھی۔

عبدالقادر سٹپٹا گیا۔ "پتا نہیں جی۔"

"نہیں ہوتا۔۔۔ کوئی راستہ نہیں ہوتا واپسی کا۔۔۔ جب ایک بار قدم اٹھ گیا دوست کے کوچے کی طرف تو اٹھ گیا۔"

"جی۔۔۔" عبدالقادر اس کی بات نہ سمجھ پایا۔

"وہ ہے دوست۔" اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ اس سے بڑھ کر تو اور کوئی دوست نہیں' لیکن پھر بھی یہ تو کس دوست کو تلاشتا ہے عبدالقادر! کس کو کھوج رہا ہے۔ کس کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ وہ تو یہاں ہے۔ ہر جگہ ہے۔"

"جی میں۔۔۔ میں تو کسی کے پیچھے نہیں بھاگ رہا۔" عبدالقادر ذرا سا سہم گیا تھا۔

"ہاں تو نہیں میں۔۔۔ میں بھاگ رہا ہوں۔" اس نے سر پھر گھٹنوں پر رکھ لیا۔

"اللہ یار۔" مولوی ہدایت اللہ جانے کب گھر سے باہر نکلے تھے۔

"اٹھ اندر چل کے اندر کھانا کھا لے۔ تیری چاچی نے روٹی پکالی ہے۔"

"اچھا تو مولوی صاحب کے بھتیجے کا نام اللہ یار ہے۔" عبدالقادر نے سوچا۔ اب پتا نہیں یہ نام مولوی صاحب نے خود ہی اس کا نام اللہ یار رکھ دیا تھا' لیکن عبدالقادر کے طفیل تمام گاؤں میں وہ مولوی اللہ یار کے نام سے مشہور ہو چکا تھا۔ عبدالقادر تو اسے چھوٹے مولوی صاحب یا صرف مولوی صاحب کہہ کر بلاتا تھا۔ اور دیوانگی سے ہوش مندی تک آتے آتے عبدالقادر اور مولوی اللہ یار کے درمیان ایک گہرا تعلق یا ربط پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے اسکول سے واپسی پر اللہ یار' عبدالقادر کو پیپل تلے اپنا منتظر ملتا۔ کبھی گرے ہوئے پتے اکٹھے کرتے ہوئے اور کبھی خاموش بیٹھے ہوئے۔ عبدالقادر سلام کر کے اس کے پاس بیٹھ جاتا۔ کبھی تو وہ کوئی بات نہ کرتا اور عبدالقادر کے ہر سوال پر خاموشی سے اسے تکتا رہتا اور کبھی چند باتیں کر لیتا۔ وہ بہت کم گو تھا اس نے اپنے متعلق کبھی کوئی بات نہیں کی تھی کہ وہ کون تھا اور کہاں سے آیا تھا۔

ان دنوں عبدالقادر یہی کوئی سولہ سترہ سال کا تھا جب اچانک ہی مولوی ہدایت اللہ بیمار ہو گئے تھے۔ ان دنوں مولوی اللہ یار کو گاؤں میں رہتے تقریباً" تین سال ہو گئے تھے۔ وہ اب زیادہ تر مسجد میں ہی رہتے تھے۔ البتہ کھانا وغیرہ سب مولوی ہدایت اللہ کے گھر سے ہی آتا تھا۔ اس روز بھی مولوی ہدایت اللہ کا پڑوسی لڑکا کھانا لایا تو ساتھ مولوی صاحب کا پیغام بھی تھا۔ انہوں نے کہلوایا تھا کہ ان کی طبیعت صحیح نہیں اور وہ مسجد تک نہ آپائیں گے' سو آج مغرب اور عشاء کی نماز وہ پڑھادیں اور اذان بھی دے دیں۔

"میں۔" مولوی اللہ یار نے حیرت سے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"جی مولوی نے آپ سے ہی کہا ہے۔"

"مگر میں۔" انہوں نے متذبذب سا ہو کر عبدالقادر کی طرف دیکھا جو ان کے پاس ہی بیٹھا تھا۔

وہ میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہو چکا تھا سو اکثر مولوی اللہ یار کے پاس آکر بیٹھ جاتا تھا۔

مولوی اللہ یار کی گفتگو سے اب وہ دیوانگی نہ جھلکتی تھی۔ وہ اکثر عبدالقادر سے بہت اچھی باتیں

کرتے تھے اور زندگی کے اسرار و رموز سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔

"اور انہوں نے کہا ہے رات گھر پر آئیے گا۔" لڑکے نے پھر کہا تو انہوں نے سر ہلا دیا۔ اور عبدالقادر سے بولے۔

"نہیں۔ میں یہ ذمہ داری نہیں اٹھا سکتا۔ میں تو..... میں تو عبدالقادر.....!"

"مگر مولوی جی! بڑے مولوی صاحب تو بہت بیمار ہیں تو پھر کون نماز پڑھائے گا۔"

"کوئی بھی..... کوئی بھی۔ آخر اتنا گاؤں بھرا ہوا ہے۔ پہلے مولوی صاحب بیمار ہوتے تھے تو کون پڑھاتا تھا نماز۔؟"

"پہلے....." عبدالقادر سوچ میں پڑ گیا۔

"جب سے مولوی صاحب اس گاؤں میں آئے ہیں' وہ کبھی بیمار ہی نہیں پڑے۔ ہاں کبھی کبھی انہیں مسجد آنے میں دیر ہو جائے تو خیر دین چاچا اذان دے دیتا ہے۔ بس۔"

خیر دین مسجد میں پانی ڈالتا تھا اور مسجد کی دیکھ بھال بھی کرتا تھا۔

"پر میرے مَن میں تو کوئی اور بیٹھا ہے چھپ کر۔ عبدالقادر! میں اس کی طرف لپکتا ہوں تو وہ جو میرے مَن میں چھپا بیٹھا ہے وہ میری راہ روک لیتا ہے۔ اصل تو وہی ہے سراہی کے سامنے سجدے میں جھکتا ہے وہ جو اندر چھپ کر بیٹھ گیا ہے وہ نکلتا ہی نہیں۔"

وہ جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہے تھے اور عبدالقادر حیران سا بیٹھا تھا..... اسے مولوی اللہ یار کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔

"اور پھر مجھے تو یہاں رکنا بھی نہیں ہے..... پتا نہیں کیوں میں یہاں رک گیا ہوں اس مٹی کی باس میں کیا ہے۔ یہاں کی ہوا میں کیسا سحر ہے۔ جس نے میرے قدم روک رکھے ہیں۔" انہوں نے عبدالقادر کو جانے کا اشارہ کیا۔

"جاؤ کسی اور سے کہو جا کر جس کے من میں صرف وہ ہی وہ ہے۔ جس کے لبوں پر اس کی ثنا سجے۔ میرے لبوں سے تو بے خودی میں جو نام نکلتا ہے' وہ اس کا نہیں ہے۔"

انہوں نے گھٹنوں پر سر رکھ لیا اور دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ لیے۔ عبدالقادر حیران سا بیٹھا انہیں دیکھتا رہا تب ہی خیر دین نے آ کر اذان دی اور کچھ دیر بعد نمازی اکٹھے ہونے لگے۔

"مولوی صاحب! اٹھیں نمازی اکٹھے ہو گئے ہیں۔"

لوگ ان کے منتظر تھے۔ انہوں نے انکار کرنا چاہا' لیکن لوگوں نے جیسے خود ہی فرض کر لیا تھا کہ مولوی ہدایت اللہ کی عدم موجودگی میں امامت کے فرائض وہی انجام دیں گے۔ انکار کی گنجائش نہ تھی۔ مغرب کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ وہ بے بس سے ہو گئے۔

لیکن نماز سے فارغ ہوتے ہی وہ عبدالقادر کا ہاتھ پکڑے مسجد سے باہر نکلے اور تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے مولوی ہدایت اللہ صاحب کے گھر کی طرف چل پڑے۔

☆ ☆ ☆

"بابا جان کو میرا پریکٹس کرنا پسند نہیں ہے۔" **عبیرہ** نے افسردگی سے کہا۔

"مگر کیوں **عبیرہ**! اگر انہیں تمہارا پریکٹس کرنا پسند نہیں تھا تو انہیں چاہیے تھا کہ وہ تمہیں لاء کرواتے ہی نہ۔ تم سمپل بی۔اے کرتیں۔ گھر بیٹھتیں اور اپنے بابا چوہدری امتیاز جیسے کسی جاگیردار کے بچے پالتیں۔"

دانیال کو **عبیرہ** کے پریکٹس نہ کرنے کا دکھ ہو رہا تھا۔ اور **عبیرہ** بھی یہ سمجھ رہی تھی سو اس کی لمبی چوڑی بات کے جواب میں صرف اتنا کہا۔

"یہ میری ضد تھی لاء کرنے کی' بابا تو چاہتے تھے کہ میں انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کر لوں۔"

"مگر **عبیرہ**! ہم لوگ تمہارے بغیر بہت اداس ہیں۔" صدف بھی افسردہ تھی۔

"تم نے بابا جان سے بات کی۔ کیا انہوں نے صاف منع کر دیا۔ ماموں نے پوچھا۔

"نہیں' میں نے ابھی بات نہیں کی۔"

"حد کرتی ہو تم بھی..... میں سمجھ رہا تھا بابا جان نے صاف انکار کر دیا ہے۔ خوامخواہ تم نے میرا پاؤ بھر خون خشک کر دیا۔" دانیال نے ناراضی سے کہا۔

"جس بات کو میں جانتی ہوں۔ اس کو پوچھنے کا کیا فائدہ۔" **عبیرہ** ابھی تک افسردہ تھی۔

"مگر تمہارے بابا تو بڑے براڈ مائنڈڈ ہیں **عبیرہ**! ہم ان سے بات کریں۔" ماموں کو امید تھی کہ شاید وہ ان کی بات مان لیں۔ آخر انہوں نے صدف کے ابا جان کو بھی تو قائل کر لیا تھا۔

"مگر میرے ابا جان کی اور بات ہے۔ وہ بڑے زمیندار یا جاگیردار نہیں ہیں۔ بے چارے سفید پوش متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والے کمزور ارادے کے ابا۔"

"صدف منیر!" دانیال علی نے ہاتھ اٹھا کر اسے وارننگ دی۔ "یہ تم خود پر ترس کھانا اور طنز کرنا کب چھوڑو گی۔ کل سے لے کر اب تک تم نے..... بے چارے سفید پوش' متوسط' غریب..... یہ الفاظ کوئی پچاس دفعہ استعمال کیے ہیں آئندہ نہیں۔ بھئی کرن کے سسرال والے اگر گھٹیا اور چھچھورے ہیں تو گولی مارو انہیں اور بے فکر رہو تمہارے سسرال والے اتنے چھچھورے نہیں ہوں گے۔" وہ بات کرتے کرتے شرارت سے مسکرایا۔

"اور اس کی میں تمہیں گارنٹی دیتا ہوں۔ اور تم سب گواہ رہنا۔" اس نے ماموں اور **عبیرہ** کی طرف دیکھا۔

"تم باز نہ آنا کبھی' کہیں بھی۔" صدف جھینپ گئی۔

"اور ابا سے کہہ دینا کہ کرن کے سسرال میں کہلوا دیں کہ انہیں ایسے چھچھورے لوگوں سے رشتہ نہیں جوڑنا' کرن کے لیے بہت رشتے ہیں۔"

"تم پاگل ہو دانیال!" صدف کے لہجے میں کوشش کے باوجود پھر طنز آگیا تھا۔ "ہم جیسے لوگوں کے ہاں رشتے مشکل سے ہی آیا کرتے ہیں اور اگر آ کر لوٹ جائیں تو لڑکی ساری عمر دہلیز پر ہی بیٹھی رہتی ہے۔ تمہیں نہیں معلوم کرن کا رشتہ کتنی مشکلوں سے ہوا ہے۔ کسی کو گھر پر اعتراض تھا اور کسی کو بھائی نہ ہونے پر کسی کو خوف تھا کہ ابا بے چارے ایک کریانے کی دکان میں سے بیٹی کو کیا جہیز دے سکیں گے۔"

"اُفوہ! او پھر وہی خود ترسی۔۔۔" دانیال نے سر تھام لیا۔ تب ہی ملازم نے آکر عبیر کو بتایا کہ چوہدری امتیاز خان آگئے ہیں۔

"ٹھیک ہے' انہیں مہمانوں کا بتا دو۔" وہ سب اس وقت اسلام آباد میں عبیر کے محل نما گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"دانی یار! تم عبیر کے بابا جان سے بات کرنا۔" مامون نے دانیال سے کہا۔

"اور اگر انہوں نے انکار کر دیا تو؟" صدف نے خدشہ ظاہر کیا۔

"تو کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔ کیوں عبیر؟" دانیال نے پوچھا۔

"میرے خیال میں بابا جان اجازت نہیں دیں گے۔"

"مجھے تو اپنے عبداللہ کا مستقبل مخدوش لگ رہا ہے۔" مامون نے سرگوشی کی۔

"کیا مطلب؟" صدف نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"ایک تو تمہارے کان بہت پتلے ہیں۔" دانیال نے اسے گھورا۔

"تو کیا کانوں میں روئی ٹھونس لوں۔" صدف چڑ گئی۔

"ویسے یہ عبداللہ راستے میں سے غائب کہاں ہو گیا تھا۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ [illegible] آئے گا عبیر کی طرف۔" مامون نے پوچھا۔

"اس کو ڈاکٹر کی طرف جانا تھا اور صبح کورٹ میں ہی اس نے بتا دیا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ عبیر [illegible] طرف نہیں جا سکے گا۔" دانیال نے بتایا۔

"تم گئے تھے دانی! عبداللہ کے چچا کو دیکھنے۔" صدف کو اچانک یاد آیا۔

"نہیں۔ آج چلیں گے ابھی یہاں سے واپسی پر۔ کیا تم بھی چلو گی۔؟"

"ہاں اگر زیادہ دیر نہ ہوئی تو۔"

"کیا عبداللہ کے چچا جان زیادہ بیمار ہیں۔" عبیر نے پوچھا اور پھر اس کی نظر ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے چوہدری امتیاز پر پڑی۔

"السلام علیکم بابا جان!" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ دانیال' مامون اور صدف بھی اس کی تقلید میں کھڑے ہو گئے۔

"ارے بیٹھو بچو! یہ کیا کھڑے ہو گئے ہو تم۔ میں کوئی استاد ہوں۔" ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے چوہدری امتیاز نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گئے۔

"پتری! کوئی خاطر مدارت کی اپنے مہمانوں کی۔۔۔ کوئی چاء پانی۔"

"جی بابا جان۔"

"اوئے نور خان۔" انہوں نے اپنے ساتھ آنے والے ملازم کو آواز دی جو دروازے پر ہی ٹھہر گیا تھا۔

"خانساماں سے کہہ دو جا کر مہمان کھانا کھا کر جائیں گے۔ اچھا سا کھانا ہو۔ شکایت نہ ہو۔"

"جی چوہدری جی۔" نور خان جو دو قدم آگے بڑھا تھا وہاں سے ہی پلٹ گیا۔

"وہ جناب! کھانے وانے کا تردد نہ کریں۔ ہم بس اب جائیں گے۔ ہم تو بس عبیر سے یہ پوچھنے چلے آئے تھے کہ وہ چیمبر کب آئیں گی۔" دانیال نے فوراً کہا۔

"کیوں بھئی بچو! یہ شہروں میں کوئی چاچا ماما نہیں ہوتا یا آپ جناب ہی چلتا ہے۔" چوہدری امتیاز نے خوشگوار سے لہجے میں پوچھا۔

"سوری انکل وہ۔۔۔" دانیال شرمندہ ہو گیا۔

"یہ انگریز خود تو چلا گیا اور اپنا سوری اور انکل یہاں چھوڑ گیا۔" چوہدری امتیاز مسکرائے۔

"مجھے یہ انکل ونکل پسند نہیں ہے۔ میں تو سیدھا سادا سا دیہاتی بندہ ہوں۔ اور تم میری عبیر جیسے ہو۔ چاہو تو چاچا بلا لو چاہو تو بابا جان ہی کہہ لو۔" ان کے لہجے میں بے انتہا خلوص تھا۔

اور یہ عبیر نے خوامخواہ ڈرا رکھا تھا اپنے بابا جان سے۔ یہ تو اتنے خوش مزاج اور نرم دل لگ رہے ہیں۔" صدف نے کن اکھیوں سے انہیں دیکھا۔

سرخ و سفید رنگت' کشادہ پیشانی اور باریک باریک مونچھیں۔۔۔ آنکھوں میں ایک نرم سا محبت بھرا تاثر۔ ان کی شخصیت خاصی پُرکشش تھی۔ وہ بہت باوقار اور بہت شفیق سے لگ رہے تھے۔

"میں نے تو کئی بار کہا عبیر پتر سے۔ ادھر آموں کے موسم میں بلاؤ اپنے کلاس فیلوز کو رونق شونق لگاؤ۔"

"جی انکل! کہا تو تھا عبیر نے لیکن بس ہم لوگ پڑھائی میں مصروف رہے۔ اب انشاءاللہ پھر کبھی آئیں گے۔" صدف نے دوپٹے کو اچھی طرح سے اوڑھتے ہوئے کہا۔

"اوئے پھر انکل۔۔۔" چوہدری امتیاز نے بے ساختہ کہا۔ "خیر جیسی تمہاری مرضی۔"

"باباجان! یہ صدف منیر ہے۔" عبیر کو اچانک ہی تعارف کا خیال آیا تھا۔

"اور یہ دانیال علی ہے مشہور وکیل ملک غضنفر علی کے بیٹے ہیں۔"

"اچھا اچھا۔" انہوں نے بہت دھیان سے دانیال کو دیکھا۔

"بڑا نام سنا ہے آپ کے والد کا لیکن کبھی شرفِ ملاقات حاصل نہیں ہوا۔۔۔۔ ایک مقدمہ ہے زمین کا ہمارا۔ اپنا منشی کہہ رہا تھا کہ ملک صاحب کو وکیل کر لیں۔ دو چار پیشیوں میں فیصلہ ہو جائے گا۔ سالوں سے چل رہا ہے۔"

"اور یہ مامون الرشید ہیں۔ ڈاکٹر رشید الحق کے صاحبزادے۔ مشہور نیورو سرجن ہیں اس کے ڈیڈی۔۔۔"

"ڈاکٹرز تو اکثر اپنی اولاد کو اپنے ہی نقش قدم پر چلاتے ہیں۔ آپ کے والد صاحب نے آپ کو اپنے نقش قدم پر نہیں چلایا۔" چوہدری امتیاز کے انداز میں بڑی بے تکلفی سی تھی۔

"جی کوشش تو بہت کی لیکن پھر ہتھیار ڈال دیے۔" مامون نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔

"یعنی بیٹا سبقت لے گیا۔" چوہدری امتیاز نے قہقہہ لگایا۔

"ان کی طبع آزمائی کے لیے دو بیٹے اور ہیں ورنہ ہتھیار ڈالنے والے نہ تھے۔ اب ساری توجہ ان کی طرف ہے۔"

"بہت خوب۔" چوہدری امتیاز دل کھول کر ہنسے۔

"عبیر تم سب کی بہت تعریف کرتی تھی۔ اور واقعی تم سب مجھے اچھے لگے ہو۔ سلجھے ہوئے اور اچھے گھرانوں کے۔"

"عبداللہ بھی ہے ہمارے گروپ میں۔" مامون نے فوراً کہا۔ "لیکن اس کے چچا جان کی طبیعت کچھ ناساز تھی سو وہ نہیں آیا۔"

"اوہ ہاں عبداللہ۔ ذکر کیا تھا عبیر نے۔ وہی نا جس کے والد ماسٹر ہیں۔"

"جی وہ دراصل اس کے چچا ہیں۔ والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔" مامون نے وضاحت کی۔

"ہاں بتایا تو تھا عبیر نے۔۔۔ دراصل عبیر ہر بات مجھ سے کرتی ہے۔ اپنے اسکول 'کالج' دوستوں کی 'استادوں کی۔ بچپن سے اس کی عادت ہے۔ اور کوئی بہن بھائی نہ ہونے کی وجہ سے ہر بات مجھ سے ہی شیئر کی۔ حالانکہ اسے ماں کے زیادہ قریب ہونا چاہیے تھا لیکن ماں کی نسبت

یہ مجھ سے زیادہ قریب ہے۔" انہوں نے محبت سے عبیر کو دیکھا۔

"اور تم لوگ اب کیا کر رہے ہو آج کل؟"

"ہم نے ملک صاحب کو جوائن کر لیا ہے اور ہم اس لیے حاضر ہوئے تھے کہ عبیر کا ارادہ پوچھیں۔" دانیال نے فوراً کہا۔

"عبیر کا ارادہ۔" انہوں نے سوالیہ نظروں سے دانیال کو دیکھا اور پھر عبیر کی طرف نگاہ کی۔

"ہاں جی۔۔۔ وہ دراصل ہم ہمیشہ یہ پروگرام بنایا کرتے تھے کہ ہم پانچوں مل کر کام کریں گے۔ ہمارا اپنا چیمبر ہوگا اور ایک روز پورے ملک میں ہمارا نام ہوگا۔"

"اللہ آپ کو آپ کے ارادوں میں کامیاب کرے لیکن عبیر۔ میرا خیال نہیں تھا کہ عبیر پریکٹس کرے گی۔ کیوں پتری۔" انہوں نے عبیر سے پوچھا۔

"جی۔" عبیر جو بے دھیانی میں بیٹھی تھی۔ سٹپٹا گئی۔

"جیسے آپ کی مرضی باباجان۔"

"او۔۔۔ او۔" صدف نے گھور کر اسے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا کہ وہ اجازت طلب کرے۔

چوہدری امتیاز نے فخر اور محبت سے عبیر کو دیکھا۔ انہیں عبیر پر بے جا ناز نہیں تھا۔ عبیر نے کبھی ان کے یقین' اعتماد اور مان کو نہیں توڑا تھا۔ حالانکہ چوہدری اعجاز نے اس کے لاء کرنے کی سخت مخالفت کی تھی۔

لڑکیوں کے لیے بی۔ اے تک تعلیم کافی ہے۔"

"لیکن لالہ! وہ لاء کرنا چاہتی ہے۔ اس کی خواہش ہے۔ وہ میری ایک ہی بیٹی ہے۔ میں اس کی کسی خواہش کو رد نہیں کر سکتا۔"

"لیکن امتیاز خان! بیٹی کو لڑکوں کے ساتھ تعلیم دلواؤ گے۔ کل کلاں کوئی بات ہو گئی تو۔"

اور چوہدری امتیاز کا رنگ سرخ ہو گیا تھا۔

"مجھے اپنی بیٹی پر یقین ہے لالہ! وہ بہت سمجھ دار اور باشعور ہے۔ اور پھر میں نے بھی تو یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہے۔ اچھے اور خاندانی لوگ ہر جگہ اپنے خاندان کا وقار قائم رکھتے ہیں۔"

اور یہ حقیقت تھی کہ انہیں عبیر نے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ جب وہ صدف منیر کے ساتھ دانیال وغیرہ کے گروپ میں شامل ہوئی تھی تو اس نے انہیں بتایا تھا اور اجازت لی تھی۔ انہوں نے عبیر کی آنکھوں کی خواہش بھی پڑھ لی تھی اور کئی دنوں سے اس کی اداسی بھی محسوس کر رہے تھے لیکن عبیر نے اس طرح ان کی رضا پر سر جھکا کر ان کا مان بڑھا دیا تھا۔

"تمہاری مرضی کیا ہے پتر؟"
"میرا خیال ہے کہ آپ اسے پسند نہیں کریں گے۔" اس نے ایک بار پھر ان کا مان بڑھا دیا تھا۔

ان کا دل عجب طرح کی خوشی اور مسرت سے بھر گیا۔
"لیکن انکل! ہم سب کی بڑی خواہش تھی کہ عبیر ہمارے ساتھ کام کرے۔۔۔ کم از کم انٹرن شپ تو۔" صدف نے آہستگی سے کہا۔
"جیسے کل ہی میں ایک مسئلے پر پھنس گیا تو میں نے سوچا کہ عبیر ہوتی تو منٹوں میں حل کر دیتی اس مسئلے کو۔۔۔"
"اور کیا انکل۔" دانیال نے ماموں کی بات کو آگے بڑھایا۔ "یہ صدف تو بالکل ہی نالائق ہے اگر عبیر نہ ہوتی تو ساری زندگی لاء نہ کر پاتی۔"
"شرم کرو۔" صدف نے اسے گھورا۔
"لو اپنے بابا جان سے کیا شرم۔" دانیال نے صدف کی طرف دیکھا۔
"اب اگر تم نے آدھے سے زیادہ پیپرز میں عبیر کی چیٹنگ کی ہے تو۔"
صدف اندر ہی اندر بل کھا کر رہ گئی اور چوہدری امتیاز نے قہقہہ لگایا۔
"ہاں ہاں۔ اپنے بابا جان سے کیا چھپانا بیٹی۔ ویسے آپس کی بات ہے میں نے بی۔ اے میں اپنا انگلش کا پیپر سارا کا سارا اپنے دوست محسن علی کا دیکھ کر کیا تھا۔" وہ پھر ہنسے صدف نے بھی زبردستی مسکرانے کی کوشش کی مگر دل ہی دل میں اسے دانیال پر بہت غصہ آرہا تھا۔
"تو پھر عبیر پتر ایسا ہے کہ۔" وہ ہنستے ہنستے عبیر کی طرف مڑے۔
"تمہارے دوستوں کی بھی خواہش ہے اور تم بھی گھر میں بور ہوتی ہو تو کرلو جوائن۔۔۔ جب تک پتر ایاز نہیں آجاتا امریکہ سے۔۔۔ تب تک اپنا شوق پورا کرلو۔"
عبیر کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ماموں اور صدف یکدم خوش نظر آنے لگے۔ دانیال نے دل ہی دل میں ہرا کا نعرہ بلند کیا۔

"ایاز میرا بھتیجا ہے۔" چوہدری امتیاز نے وضاحت کی۔ "اعجاز لالہ کا بیٹا۔۔۔ اعلا تعلیم کی غرض سے امریکہ گیا ہوا ہے۔ میری اور لالہ کی خواہش ہے کہ ایاز اور عبیر کی شادی ہو جائے۔ سو یہ نیک کام انشاءاللہ ایاز کے آنے پر ہو گا' سو تب تک عبیر آپ لوگوں کے ساتھ کام کرلے۔ میں بچوں پر خوامخواہ کا جبر کرنا پسند نہیں کرتا۔۔۔ اگر عبیر پسند نہ کرے خود تو اور بات ہے ورنہ میری طرف سے پابندی نہیں ہے۔"
"کیوں عبیر؟" صدف نے بے قراری سے پوچھا۔ "تم ہمیں جوائن کرو گی نا۔ سچی میں تو

تمہارے بغیر بہت اداسی اور تنہائی محسوس کرتی ہوں۔"
عبیر کی نظریں پھر چوہدری امتیاز کی طرف اٹھ گئیں۔ "ہاں ہاں پتر! کرلو تم بھی ایک دو سال اپنا شوق پورا۔" ان کی آنکھوں میں واضح رضامندی تھی۔
عبیر نے اثبات میں سرہلا دیا۔ تو سب کے چہرے کھل اٹھے۔
"او کے بچو! تم لوگ گپ شپ لگاؤ۔ انشاءاللہ کھانے پر ملاقات ہو گی اب۔"
چوہدری امتیاز اٹھے تو وہ سب بھی تعظیماً کھڑے ہو گئے۔
"یار عبیر! تمہارے بابا جان تو بہت اچھے ہیں بھئی۔" ان کے باہر نکلتے ہی دانیال نے بے تکلفی سے کہا۔
"خوامخواہ تم نے ہمیں ڈرا رکھا تھا۔" ماموں نے بھی بیٹھتے ہوئے تبصرہ کیا۔
"مجھے تو یقین تھا' تمہارے بابا جان ہرگز نہیں مانیں گے۔"
"ہاں۔ اُمید تو مجھے بھی نہیں تھی۔" عبیر کو شاید ابھی تک حیرت تھی۔
"یہ دراصل میرا کمال ہے۔" دانیال نے کالروں سے مصنوعی گرد جھاڑی۔ "اندازہ لگالو کہ مستقبل میں وکالت کے شعبے میں میرا کیا مقام ہو گا۔"
"اور تم نے وہ کیا بکواس کی تھی۔" صدف کو یاد آیا۔
"کیا؟" دانیال نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔
"وہی جو کہہ رہے تھے کہ میں عبیر کی نقل۔۔۔"
"ہاں تو بتایا نہیں تھا تم نے ایک بار۔ اسلامی فقہ کا ایک سوال تم نے عبیر سے پوچھا تھا۔"
"وہ تو ذرا سا پوچھا تھا اور تم کہہ رہے تھے کہ سارے پیپرز۔"
"اوہ اچھا۔ میں نے سوچا کہ اتنا آسان سا کوئسچن عبیر سے پوچھ کر کیا ہے تو باقی سب بھی۔۔۔ خیر سوری یار! غلط فہمی ہو گئی۔" اس نے انتہائی معصومیت سے کہا اور صدف برا سا منہ بنا کر عبیر کو دیکھنے لگی۔
"یہ ایاز کا کیا قصہ ہے۔ اب جلدی سے شروع ہو جاؤ اور کتنی گھنی ہو۔ بتایا تک نہیں کہ منگنی شدہ ہو۔"
"کچھ قصہ نہیں بھئی۔۔۔ اور منگنی وغیرہ کا بھی کوئی چکر نہیں ہے۔۔۔ ہاں بابا جان کی اور شاید تایا جان کی بھی خواہش ہے۔۔۔ لیکن تائی اماں کا خیال شاید اپنی بھانجی کے لیے ہے اور جہاں تک تمہیں بتانے کی بات ہے تو مجھے خود ابھی چند دن پہلے دونوں باتوں کا علم ہوا ہے۔۔۔ بابا جان کی خواہش اور تائی اماں کا خیال۔۔۔ جس روز مجھے بابا جان کی خواہش کا علم ہوا' اسی روز تائی جان

میں نے چچی جان سے کہتے سنا کہ انہیں مونا ایاز کے لیے بہت پسند ہے۔ لیکن ایاز کی واپسی پر
وہ مونا کا رشتہ مانگیں گی۔" عبیر نے پورے اطمینان سے بات مکمل کی۔
"تو کیا تمہارے بابا جان کو تائی جان کی خواہش کا علم نہیں؟
"ظاہر ہے نہیں ہوگا۔ دراصل ہمارے ہاں مرد حتمی بات کے بعد ہی عورتوں کو آگاہ کرتے
ں کسی بات سے۔ ممکن ہے' تایا جان نے ابھی تک تائی جان سے بابا جان کی خواہش کا ذکر نہ کیا
ـــــ اور نہ ہی تائی جان نے تایا جان سے مونا کی بات کی ہو۔"
"لیکن اگر تمہارے بابا جان اور تایا جان کی بات مان لی تمہاری تائی نے تو کیا تم کر لو گی ایاز
سے شادی۔" صدف نے پوچھا۔
"جس بات میں بے یقینی ہو' اس کے متعلق ابھی سے کیا سوچنا۔"
"تھینک گاڈ۔" مامون نے آہستگی سے کہا۔ اور پھر عبیر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "ویسے
وصوف کیسے ہیں اور کیا تعلیم حاصل کر رہے ہیں وہاں۔"
"بہت اسمارٹ اور زبردست شخصیت کے مالک۔" عبیر کے ہونٹوں پر شرارت بھری
سکراہٹ ابھری۔ "گریجویشن کے بعد یہاں سے چلے گئے تھے وہاں کیا کر رہے ہیں' یہ مجھے
علوم نہیں۔"
"اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہاں سے ساتھ کوئی دُم چھلا لگا لیں۔" مامون نے تبصرہ کیا۔
"ایسی صورت میں عبداللہ کے چانسز بن جاتے ہیں کچھ۔ کیوں عبیر۔" دانیال نے ہمیشہ
ں طرح بے سوچے سمجھے بات کی۔
"تم فضول بہت بولتے ہو۔" عبیر نے آہستگی سے کہا۔
لیکن اس کی آنکھوں میں یکایک جو جگنو چمک اٹھے تھے اور رخساروں پر جو چمک سرخی بن کر
ھری تھی' اس نے صدف کو سہما سا دیا تھا۔ اسے شک تو ہمیشہ سے تھا کہ عبیز عبداللہ کو پسند
رتی ہے اور شاید عبداللہ بھی لیکن دونوں کی کسی بات سے اس کا اظہار نہیں ہوتا تھا البتہ
مون اور دانیال کبھی کبھار کوئی اس طرح کی بات کہہ جاتے تھے جس پر عبداللہ ہمیشہ انہیں
تنبیہی نظروں سے دیکھتا تھا۔ لیکن آج پتا نہیں کیوں اسے یقین سا ہو گیا تھا کہ بات پسندیدگی
سے بھی کہیں آگے ہے۔
"اور اگر ایاز یوں ہی آگیا بغیر کسی دُم چھلے کے تو پھر کیا ہوگا عبیر؟" صدف نے ہمیشہ کی
طرح احمقوں کی طرح پوچھا۔
"کیا ہوگا بھئی۔ میرا یار بنے گا دولہا اور پھول کھلیں گے دل کے۔" دانیال نے لہک کر گایا۔

عبیر کا رنگ لحہ بھر کو سفید پڑا اور پھر وہ نارمل ہو گئی۔ لیکن صدف کا دل جیسے ایک لحہ کو
ڈوب سا گیا تھا۔
عبیر اور عبداللہ۔
عبداللہ اور عبیر۔
"اور یہ کس قدر مشکل ہے ان دونوں کا اکٹھے زندگی کرنا اور دونوں ایک ساتھ کھڑے کتنے
اچھے لگتے ہیں' جیسے ایک دوسرے کے لیے ہی بنائے گئے ہوں۔ ایک بار اس نے دانیال سے کہا
تھا۔
"ہاں۔ جیسے ہم دونوں ایک ساتھ کھڑے اچھے لگ رہے ہیں۔ اللہ کی بندی۔ کبھی اپنے لیے
بھی سوچ لیا کرو۔"
دانیال کبھی سنجیدہ نہیں ہوتا تھا اور وہ جو اس وقت مامون سے سنجیدگی سے عبداللہ کے
متعلق بات کرنے کو سوچ رہی تھی' اس سے الجھ پڑی تھی۔
چاروں ہی اپنی اپنی جگہ یکدم خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگے تھے۔ تب ہی ملازم نے آکر کھانا
لگنے کی اطلاع دی تو عبیر نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔
"کھانا لگ گیا ہے۔ پلیز چلیں۔ بابا جان انتظار کر رہے ہوں گے۔"
اور وہ تینوں بھی اپنے اپنے خیالوں میں گم عبیر کے پیچھے چل پڑے۔

✡ ✡ ✡

عبداللہ کورٹ جانے کے لیے تیار ہو کر اپنے کمرے سے باہر آیا تو ماسٹر شفیق احمد بھی اسکول
جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔
"چچا جان! آپ اسکول جا رہے ہیں۔" عبداللہ کو حیرت ہوئی۔
"ہاں بیٹا سوچا بہت دن آرام کر لیا اب چلتے ہیں۔" وہ خوشدلی سے مسکرائے۔
"مگر چچا جان! ابھی آپ کو آرام کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کم از کم ایک ہفتہ اور'
رات بھی آپ کو ٹمپریچر تھا۔"
"ڈاکٹروں کی بات چھوڑو میاں! میں خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ پھر بچوں کا بھی خرچ
ہو رہا ہے میں اسے پسند نہیں کرتا۔ اسکول میں میتھس کے ٹیچر صرف دو ہی ہیں۔ اور بے
چارے اکبر صاحب پر خوامخواہ وزن پڑ رہا ہوگا۔ وہ اپنی کلاسیں بھی لیں اور میری بھی۔"
عبداللہ خاموش ہو گیا وہ جانتا تھا کہ ماسٹر شفیق احمد نے اگر سوچ لیا ہے کہ انہیں آج اسکول
جانا ہے تو وہ اس کے کہنے سے رہیں گے نہیں۔"

"بیٹا! ان سے ضد یا بحث کا فائدہ نہیں' یہ ہمیشہ اپنی ہی کرتے ہیں۔"
زہرا بیگم ہاتھ میں چائے کا کپ لیے کچن سے نکلیں تو عبداللہ کو مخاطب کیا۔
"جی امی جان! بس چچا جان جو فیصلہ کرلیں۔ اس پر قائم رہتے ہیں۔"
عبداللہ برآمدے میں پڑی کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے سامنے پڑی چھوٹی ٹیبل کو اپنے قریب کرلیا۔
"حالانکہ فیصلوں میں لچک ہونا چاہیے۔"
زہرا بیگم نے مسکرا کر ماسٹر شفیق احمد کو دیکھا۔ اور چائے کی پیالی لے کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئیں۔
"خیر' اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے کہ میرے فیصلوں میں لچک نہ ہو۔ انسان حالات کے تابع ہوتا ہے۔ وہ کیا اور اس کے فیصلے کیا۔ کرنے والا تو وہ قادرِ مطلق ہے۔" انہوں نے اپنی عینک اٹھائی اور قلم اٹھا کر جیب میں رکھا۔
"اچھا بھئی۔ خدا حافظ۔" انہوں نے قدم آگے بڑھایا۔ اور پھر مڑ کر عبداللہ کی طرف دیکھا۔
"انعم کے داخلے کا کیا ہوا؟"
"فارم جمع کروادیے ہیں۔ ایک دو روز میں لسٹ لگ جائے گی۔"
"دھیان رکھنا بیٹا! پتا کرتے رہنا' اس کا سال ضائع نہ ہو۔"
"جی۔"
"اللہ حافظ۔" انہوں نے دوبارہ کہا۔
"اللہ حافظ۔" عبداللہ اور زہرہ بیگم نے بیک وقت کہا اور وہ تیز تیز چلتے ہوئے باہر نکل گئے۔
"ثمن اور کومل چلی گئیں کیا؟" عبداللہ نے زہرہ بیگم سے پوچھا۔
"ہاں ان کی وین تو ساڑھے سات بجے آجاتی ہے آج کل۔" زہرہ بیگم نے کہا اور انعم کو آواز دی۔
"عبداللہ کے لیے ناشتہ لاؤ بیٹی۔ اسے دیر ہو جائے گی۔"
"لارہی ہوں۔" انعم نے کچن میں سے ہی جواب دیا۔
صبح سب مختلف اوقات میں ہی ناشتہ کرتے تھے۔ ثمن اور کومل کو جلدی جانا ہوتا تھا تو وہ جلدی کرلیتیں عام طور پر کچن میں ہی۔ ماسٹر شفیق احمد کے لیے زہرہ بیگم کمرے میں ہی ناشتہ لے جاتی تھیں اور عبداللہ کی عادت تھی کہ وہ تیار ہو کر برآمدے میں بچھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ جاتا اور وہیں اخبار دیکھتے ہوئے ناشتہ کرلیتا۔ زہرہ بیگم بھی چائے کا کپ لے کر وہاں ہی

آبیٹھتی تھیں اور اس دوران وہ ان سے باتیں کرلیتا۔ ہاں چھٹی والے دن سب اکٹھے ہی ناشتہ کرتے تھے۔ آج کل چونکہ انعم بھی گھر پر تھی' اس لیے وہ بھی زہرہ بیگم کے پاس ہی آبیٹھتی تھی۔
"کوئی خاص خبر بیٹا؟" زہرہ بیگم نے ہمیشہ کی طرح پوچھا۔
عبداللہ نے اخبار سے نظریں ہٹائیں۔ "وہی معمول کی خبریں۔ کہیں چوری' کہیں ڈاکہ' کہیں دہشت گردی اور کہیں۔"
عبداللہ نے اخبار ایک طرف رکھا اور ٹرے میز پر رکھتی انعم پر نظر ڈالی۔
سادہ سے لباس میں سیدھی مانگ نکالے دوپٹا سلیقے سے سر پر لپیٹے وہ بہت مقدس سی لگ رہی تھی۔ ماسٹر شفیق احمد اور زہرہ بیگم نے بہت اچھی تربیت کی تھی بچیوں کی لیکن انعم شاید سب سے بڑی ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ حساس' سمجھ دار اور ذمہ دار تھی۔ اسے دیکھ کر اکثر عبداللہ کے ذہن میں خیال آتا تھا کہ عورت کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اتنا ہی محبت اور خیال رکھنے والا وہ عادات و مزاج کے لحاظ سے زہرہ بیگم کی ہی کاپی تھی۔ اور انہی کی طرح اسے سب کا خیال رہتا تھا۔
"میں نے آج پراٹھے پکائے ہیں اور ساتھ آملیٹ بھی ہے۔ رات آپ نے کھانا نہیں کھایا تھا نا تو اس لیے۔" انعم نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے وضاحت کی تو عبداللہ کرادیا۔
وہ عام طور پر ناشتے میں چائے اور ایک آدھ سلائس لینا ہی پسند کرتا تھا۔ لیکن انعم کی اس خیال رکھنے والی عادت کو اس نے دل ہی دل میں سراہتے ہوئے ٹرے اپنی طرف کھسکالی۔ رات وہ جس کیس پر کام کر رہا تھا' اس سے اس کے دل پر کچھ اتنا بوجھ سا آپڑا تھا کہ اس کا کھانا کھانے کا جی ہی نہ چاہا تھا۔
کیس ایک لڑکی کی طرف سے تھا۔ جس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور سگے ماموں نے نہ صرف یہ کہ ساری جائداد پر قبضہ کرلیا تھا بلکہ اس کے چھوٹے دو بھائیوں کو نہ جانے کس کے حوالے کردیا تھا۔ لڑکی کے پوچھنے پر کہ بھائی کہاں ہیں' اس نے یہ کہا کہ ان کی بہتری کے لیے انہیں کہیں بھیجا ہے اور مزید استفسار پر نہ صرف یہ کہ اسے مارا پیٹا گیا تھا بلکہ کمرے میں بند کردیا گیا تھا۔ لڑکی نہ جانے کیسے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ اس کا پورا جسم نیلوں نیل تھا۔ اس کا کوئی جاننے والا اسے ملک صاحب کے پاس لایا تھا اور ملک صاحب نے کیس اس کے حوالے کیا تھا۔
"کیا سوچ رہے ہو بیٹا!" زہرہ بیگم نے پوچھا تو اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔
"میں سوچ رہا ہوں امی جان! دنیا میں کتنا ظلم' ناانصافی اور زیادتی ہے۔ خون کے رشتے بھی

بے معنی سے ہو جاتے ہیں۔ جب آدمی ظلم کرنے پر آتا ہے تو۔"

"ہاں بیٹا! یہ تو ہے۔" زہرہ بیگم نے خالی کپ میز پر رکھا۔

"آپ شاید کل سے اسی کیس کے متعلق سوچ رہے ہیں جس کی فائل لائے تھے۔" انعم نے چائے بنانے کے لیے کپ اور چائے دانی اپنی طرف کھسکائی۔

"ہاں۔" عبداللہ نے دل ہی دل میں ایک بار پھر اسے سراہا۔

"میں جس لڑکی کے کیس پر کام کر رہا ہوں' وہ بہت مظلوم ہے اور ظلم کرنے والوں کے ہاتھ بہت مضبوط ہیں۔ ملک صاحب کہہ رہے تھے کہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم سچ کو بھی سچ ثابت نہیں کر پاتے ہیں۔"

"آپ اللہ پر بھروسا رکھیں۔ وہ یقیناً" آپ کی مدد کرے گا۔" انعم نے چائے اس کی طرف بڑھائی۔

"تھینک یو انعم! تم دعا کرنا۔ یہ میرا پہلا کیس ہے' میں اس لیے بھی ہارنا نہیں چاہتا اور اس لیے بھی کہ وہ لڑکی یقیناً" مظلوم ہے یقین کرو انعم! جب وہ اپنے بھائیوں کے متعلق بات کرتے ہوئے رو رہی تھی تو مجھے لگ رہا تھا جیسے اس کا ہر آنسو میرے دل کو چیرتا جا رہا ہو۔ پتا نہیں کیا بات ہے امی جان میں جب کبھی کسی کو کسی پر زیادتی کرتے دیکھتا ہوں۔ کہیں ظلم ہوتا سنتا ہوں تو میرا دل پھٹنے لگتا ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں نے پہلے بھی کہیں ایسا ہی کوئی واقعہ دیکھا ہو۔ بہت بار سینکڑوں بار۔ کئی بار میں نے خواب دیکھا کہ کچھ لوگ ہیں ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں ہیں اور وہ ہم سب کو مار رہے ہیں۔ چچا جان کو' آپ کو' انعم کو۔ یہ خواب بدل بدل کر آتا ہے کبھی دیکھتا ہوں' کسی نے گھر کو آگ لگا دی ہے۔ ہم سب چیخ رہے ہیں۔۔۔ کبھی۔۔۔ امی جان کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے بچپن میں کہیں آس پاس کوئی ایسا واقعہ ہوا ہو۔"

"نہیں بیٹا۔" زہرہ بیگم نے قدرے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ آج سے پہلے تو کبھی اس نے اس طرح کے خواب کا ذکر نہیں کیا تھا۔

"یہاں تو اردگرد سب شریف معزز لوگ رہتے ہیں۔ ہمارے جیسے ہی متوسط گھرانوں کے۔ خدا کا شکر ہے اچھا محلّہ ہے اور اچھا پڑوس ہے۔ رات کو چار قُل پڑھ کر سویا کرو۔"

"یہ دراصل آپ کی حد سے بڑھی ہوئی حساسیت ہے اور آپ کے دل کا گداز ہے۔ کہ آپ کسی پر ظلم اور زیادتی ہوتے برداشت نہیں کر سکتے اور جب اس ظلم کو ختم نہیں کر سکتے تو شاید پھر اس طرح کے خواب دیکھتے ہیں۔" انعم نے تجزیہ کیا۔

"ہاں شاید ایسا ہی ہو۔" عبداللہ نے پر خیال انداز میں کہا۔

زہرہ بیگم انہیں باتیں کرتا چھوڑ کر اٹھ گئیں۔ وہ تہجد کے وقت سے اٹھی ہوئی ہوتی تھیں۔ اس لیے اس وقت تھوڑی دیر کے لیے سو جاتی تھیں۔

"پتا ہے انعم! مجھے ٹھیک سے یاد تو نہیں ہے لیکن جب پہلی بار میں نے خواب دیکھا تھا تو اس وقت میں نے دیکھا تھا کہ اچانک ہی ڈاکو ہمارے گھر گھس آئے ہیں اور انہوں نے چچا جان کو مار دیا ہے اور تمہیں اٹھا کر باہر لے گئے ہیں۔ میں ان کے پیچھے بھاگتا ہوں تو وہ تمہیں حاجی صاحب کے گھر کے قریب والے کنوئیں میں پھینک دیتے ہیں۔ میں چیخ پڑتا ہوں اور یوں ہی چیختے چیختے میری آنکھ کھل گئی تھی اور پھر جب تک میں نے چچا جان کو باہر چارپائی پر سوتے اور تمہیں اماں جان کی گود میں نہ دیکھ لیا تھا' میرا ڈر ختم نہیں ہوا تھا اور۔۔۔"

"تب ہی آپ بچپن میں ضد کرتے تھے کہ باہر صحن میں نہیں سوئیں گے۔" انعم مسکرائی۔

"ہاں شاید۔ لیکن مجھے ڈر لگتا ہے انعم کہ اگر ماضی میں ایسا کوئی واقعہ میرے اردگرد نہیں ہوا تو کہیں یہ کوئی مستقبل کی جھلک تو نہیں ہے۔"

"اللہ نہ کرے۔" انعم کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

"آپ نے شاید اس خواب کے متعلق بہت سوچا ہے اس لیے آپ بار بار اسے دیکھتے ہیں۔ اگر آپ اس کے متعلق سوچنا چھوڑ دیں تو یقیناً" یہ خواب خود ہی آپ کے ذہن سے نکل جائے

"شاید تم صحیح کہہ رہی ہو۔" عبداللہ نے اس سے اتفاق کیا۔ اور چائے کا خالی کپ میز پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"تھینک یو انعم فار پراٹھا۔"

انعم مسکرا دی۔

"تم بہت کیئرنگ ہو اور بہت اچھی ہو۔"

انعم کی آنکھوں میں جگنو سے چمک اٹھے۔

"میں ہمیشہ ہی تم سے اپنا ہر مسئلہ ڈسکس کر کے بہت ریلیکس فیل کرتا ہوں۔ یو آر اے گڈ فرینڈ۔" اس نے سادہ سے لہجے میں کہا اور اپنا والٹ اٹھا کر اسے خدا حافظ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

"تم بھی تو بہت کیئرنگ ہو عبداللہ۔" انعم نے دل ہی دل میں سوچا۔

اگرچہ عبداللہ اس سے عمر میں تقریباً" چار پانچ سال بڑا تھا پھر بھی بچپن سے ہی اس کی عبداللہ سے بہت دوستی تھی۔ زہرہ بیگم نے بہت کوشش کی تھی کہ وہ اسے بھائی جان کہہ کر بلائے لیکن اس نے کہہ کر نہ دیا۔ عبداللہ عبداللہ ہی کرتی رہتی تھی۔ اماں ابا کہنے کے بجائے جو پہلا لفظ بولا' وہ عبداللہ ہی تھا۔ جب وہ اپنی توتلی زبان میں اسے باللہ کہتی تو عبداللہ کو بہت اچھا

لگتا تھا اور عبداللہ بھی اس کی ہر بات مانتا تھا اس کے ساتھ مل کر گڑیاں کھیلنے سے لے کر گڑیوں کا جہیز بنانے تک گڑیوں کے کپڑوں پر ستارے تک ٹانکے تھے اس نے۔ پھر ثمن کے آنے کے بعد بھی وہ عبداللہ کو ہی اپنے ساتھ کھیل میں شامل ہونے کو کہتی تھی۔

"بھائی کو پڑھنے دو انو... اور ثمن کے ساتھ کھیلو۔" زہرہ بیگم کہتیں لیکن وہ ضد کرنے لگتی رونے لگتی۔

"نہیں... نہیں میں ثمن سے نہیں کھیلوں گی۔ میں عبداللہ سے کھیلوں گی۔"

اور عبداللہ پڑھائی چھوڑ کر اس کی گڑیوں کا گھر سجانے لگتا۔

"بیٹا! تم خوامخواہ اپنی پڑھائی کا حرج نہ کرو۔ اب یہ کوئی تمہارے کھیلنے کے کھیل ہیں۔ بابا کے لاڈ نے بگاڑ دیا ہے اسے۔" اور عبداللہ مسکرا دیتا۔

"کوئی بات نہیں چچی جان! میں بعد میں پڑھ لوں گا۔" اور زہرہ بیگم اسے دیکھتی رہ جاتیں۔

مسکراہٹ اس کے پورے چہرے کو روشن کر دیتی تھی۔ کشادہ پیشانی دمک اٹھتی تھی اور بے حد دلکشی لیے سیاہ آنکھوں میں جیسے یہ مسکراہٹ ٹھہر سی جاتی تھی۔ اس کی لانبی سیاہ آنکھوں میں عجیب مقناطیسی کشش تھی۔

"ایسی آنکھیں تو نہ بھائی جان کی تھیں اور نہ بھابھی کی۔" زہرہ بیگم کہتیں۔

"ہاں" ماسٹر شفیق احمد بھی غور سے اسے دیکھتے۔ "شاید ننھیال میں سے کسی کی ایسی ہی آنکھیں ہوں۔"

"آنکھیں ہی نہیں عبداللہ تو سارا کا سارا ننھیال پر گیا ہے۔" زہرہ بیگم کا تبصرہ جاری رہتا۔

"سنا ہے بھابھی جان کی والدہ بڑی خوبصورت کشمیری خاتون تھیں۔ لگتا ہے اپنا عبداللہ انہیں پر چلا گیا ہے۔"

اور ماسٹر شفیق احمد کی مسکراہٹ گہری ہو جاتی۔

"عبداللہ بھابھی جان اور بھائی جان کا بیٹا لگتا ہو یا نہ لگتا ہو۔ ہمارا ضرور لگتا ہے جب تمہارے پاس کھڑا ہوتا ہے تو مجھے لگتا ہے جیسے اس نے تمہاری کچھ نہ کچھ شباہت ضرور چرائی ہے۔"

"اور جب آپ کے نزدیک ہوتا ہے تو مجھے لگتا ہے جیسے عبداللہ کی کشادہ پیشانی اور یہ تھوڑی سی اٹھی ہوئی اونچی ناک بالکل آپ جیسی ہے۔"

"بھئی، میرا تو بھتیجا ہے سو مشابہت سمجھ میں آتی ہے لیکن تمہاری مشابہت۔" وہ شرارت سے زہرہ بیگم کو دیکھتے۔

"وہ میرا بیٹا ہے اس لیے۔" زہرہ بیگم کی گردن میں خود بخود غرور آجاتا تھا۔ بیٹے کی ماں ہونے کا غرور۔ تب ہی تو انہوں نے عبداللہ سے کہا تھا کہ وہ انہیں امی جان کہا کرے ثمن اور انعم کی

طرح۔

بے شک انہوں نے اسے جنم نہیں دیا لیکن وہ ان کا ہی بیٹا ہے۔

خالی پیالیاں اور برتن ٹرے میں رکھتے ہوئے انعم نے سوچا۔

"آخر عبداللہ کو ایسے خواب کیوں آتے ہیں تواتر سے۔ امی جان کو شاید معلوم نہ ہو ابا جان کو ضرور پتا ہوگا۔ اگر عبداللہ کے بچپن میں کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے آس پاس کہیں۔"

گو اب گڑیاں کھیلنے کی عمر نہ تھی لیکن اب بھی وہ اور عبداللہ ایک دوسرے کے ساتھ دوستوں کی طرح ہی رہتے تھے۔ عبداللہ ہر مسئلہ اس سے ڈسکس کرتا تو وہ بھی اپنی ہر بات اس سے ہی کہتی تھی۔ اور عبداللہ کی ذرا سی پریشانی پر وہ پریشان سی ہو جاتی تھی۔ جیسے اب وہ مسلسل عبداللہ کے خوابوں کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔

"کمال ہے، عبداللہ نے پہلے کبھی اپنے خوابوں کا ذکر نہیں کیا۔" اس نے ٹرے اٹھا کر کچن کی طرف جاتے ہوئے سوچا۔

"شاید میری پریشانی کے خیال سے۔" اس کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی۔

ایک بار عبداللہ نے جانے کس بات پر کہا تھا۔ "ایک تو تم ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتی ہو انعم! اور بعض اوقات تمہاری پریشانی کے خیال سے میں تم سے کچھ نہیں کہتا۔

اور اس کی عادت تھی کہ وہ اپنی طبیعت کی خرابی یا کسی اور پریشانی کو محض سب کی پریشانی کے خیال سے چھپا جاتا تھا۔ اس لیے پچھلے سال اس کا ٹائیفائیڈ بگڑ گیا تھا۔ معمولی بخار کو اس نے قطعی اہمیت نہ دی تھی۔

"انعم بیٹا!" زہرہ بیگم نے اسے آواز دی۔ "قیمے میں کریلے ڈال لینا۔ عبداللہ کو پسند ہیں۔"

"جی امی جان! مجھے معلوم ہے۔"

عبداللہ کی پسند ناپسند وہ ہر بات سے یوں باخبر تھی جیسے اس کی اپنی پسند ناپسند ہو۔ حتیٰ کہ وہ اس کے چہرے سے اس کے موڈ کا اندازہ لگا لیا کرتی تھی۔ کب اس کا کیا موڈ ہوتا ہے اور کب وہ کیا پسند کرتا ہے۔

عبداللہ کے لیے اس کے دل میں موجود جذبے واضح نہ تھے۔ عبداللہ اس کا کزن تھا۔ وہ بچپن سے ایک ہی گھر میں رہے تھے۔ شاید عبداللہ اس کا اپنا سگا بھائی ہوتا تب بھی وہ اس کے لیے اتنی فکر مند رہتی۔ ان کے درمیان اتنی ہی دوستی محبت اور خلوص کا رشتہ ہوتا۔ بلکہ چند ماہ پہلے تک وہ عبداللہ کے متعلق بڑے فخر اور غرور سے اپنی سہیلیوں میں بات کرتی تھی۔

"عبداللہ ہے نا میرا بھائی، اس نے مضمون نویسی کے مقابلے میں ٹاپ کیا ہے۔"

"اور پتا ہے وہ جو عبداللہ ہے نا۔ سچی وہ ہم تینوں بہنوں سے اتنی محبت کرتا ہے کہ شاید ہی کوئی بھائی اپنی بہنوں سے کرتا ہو۔"

لیکن چند ماہ پہلے جب زہرہ بیگم نے اپنی کسی ملنے والی سے کہا تھا کہ "انعم کے لیے ماسٹر صاحب کا خیال عبداللہ کے لیے ہے۔ بیٹوں جیسا بھتیجا۔۔۔ اس سے بڑھ کر ہمارے لیے کون ہو گا۔" تو انعم کے دل میں موجود جذبوں نے اچانک ہی رنگ بدل ڈالے تھے۔ کئی دن تک وہ عبداللہ سے چھپی چھپی پھری تھی۔ تب عبداللہ نے ایک دن خود ہی اسے جالیا۔

"کیا بات ہے انعم! خیریت ہے۔ بہت دنوں سے تمہاری بولتی بند ہے۔ کوئی پریشانی کہیں کوئی سہیلی تو خفا نہیں ہو گئی؟"

اور انعم کے دل کی دھڑکنوں نے اتنا اودھم مچایا تھا کہ وہ کتنی ہی دیر تک نگاہیں نہ اٹھا سکی تھی۔

"کیا بات ہے انعم! کیا امی جان نے ڈانٹا ہے۔" عبداللہ اس کی خاموشی پر سچ مچ پریشان ہو گیا تھا۔

"نہیں تو یوں ہی سستی ہو رہی تھی۔"

"تو چلو پھر اٹھو۔ کومل ضد کر رہی ہے کارڈز کھیلنے کے لیے۔" وہ سادہ سے لہجے میں کہتا باہر چلا گیا تھا اور وہ گلگلوں ہوتے چہرے کے ساتھ بمشکل خود کو سنبھالتی ہوئی باہر آئی تھی۔۔۔

پھر ہولے ہولے وہ خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گئی۔۔۔ اور بظاہر پہلے کی طرح ہی عبداللہ کا خیال رکھنا۔۔۔ اس کے کپڑے استری کرنا اسے ناشتہ دینا اپنے معمول کے مطابق کرنے لگی تھی لیکن دل اس کی موجودگی میں کبھی کبھی بے تحاشا دھڑک اٹھتا اور پلکیں بوجھل ہو جاتیں۔۔۔ وہ اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھی۔

عبداللہ جیسا شخص اس کا شریک زندگی بننے والا تھا۔ اس کے ساتھ کا تصور ہی بڑا خوش کن اور دلربا تھا۔ اٹھارہ انیس سالہ انعم کو لگتا جیسے وہ اس روئے زمین کی سب سے خوش نصیب لڑکی ہو کہ اس کا نصیب عبداللہ کے نصیب کے ساتھ جڑا تھا۔

کریلے چھیلتے ہوئے وہ مسلسل عبداللہ کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼
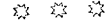
"نہیں مولوی صاحب! میں یہ سب نہیں کر سکتا۔ میرا کچھ پتا نہیں کب۔ کب پاؤں میں سفر کی زنجیر پڑ جائے۔" مولوی اللہ یار نے مولوی ہدایت اللہ کے پاس چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اور پھر یہ میرا کام نہیں ہے۔۔۔ میں تو اور طرح کا بندہ ہوں۔ یہ مسجد کی ذمہ داری' امامت۔۔۔ نہیں مولوی صاحب! یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ آپ کو پتا ہے نا' میں تو خود باقاعدگی سے نماز بھی نہیں پڑھتا۔"

"ٹھیک ہے بیٹا۔۔۔ میں کوئی ہمیشہ کے لیے تو تم پر یہ ذمہ داری نہیں ڈال رہا۔ چند دن کی تو بات ہے۔ ٹھیک ہو جاؤں گا تو خود ہی امامت کروایا کروں گا۔" مولوی ہدایت اللہ تکیے کے سہارے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور ان کی آواز میں نقاہت تھی۔

"اور پھر نماز تو فرض ہے۔ اسے تو ہر حال میں ادا کرنا ہے۔ میں جانتا ہوں۔ تم اللہ والے ہو' پاک ہو معصوم ہو لیکن بیٹا! نماز تو ہر کام سے افضل ہے۔ پہلے نماز پھر کچھ اور۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں مولوی صاحب! میں بھلا کہاں اللہ والا میں تو بڑا گناہ گار ہوں۔ دنیا دار ہوں۔ میرے دل میں تو دنیا ہی دنیا بھری ہوئی ہے۔"

"دین اور دنیا تو ساتھ ساتھ ہی چلتے ہیں بیٹا۔" مولوی ہدایت اللہ کی آواز میں نقاہت تھی' محبت تھی اور وہ محبت بھری نظروں سے انہیں تک رہے تھے۔ عبدالقادر ایک طرف مؤدب بیٹھا تھا۔

"پر مولوی صاحب میرا دل۔" مولوی اللہ یار نے کچھ کہنا چاہا تو مولوی ہدایت اللہ نے انہیں روک دیا۔

"چند دن کی تو بات ہے' حکیم صاحب کہہ رہے تھے' دو چار روز میں بخار اتر جائے گا۔"

"کیا کہا حکیم صاحب نے؟ ملیریا ہے یا ٹائیفائیڈ ہے یا۔" مولوی اللہ یار کے لہجے میں ہلکی پریشانی در آئی تھی۔

مولوی ہدایت اللہ مسکرا دیے تھے۔ یہ وہی اللہ یار تھا۔ جو جب آیا تھا تو ہوش و خرد سے بیگانہ سا' اپنے آپ میں گم رہتا تھا۔ نگاہیں خلاء میں ٹکائے نجانے کیا دیکھتا رہتا تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ اس شخص کو کوئی گہرا زخم لگا ہے جو رستا ہے اور درد بن کر آنکھوں سے جھانکتا ہے۔ وہ کہیں کسی اور ہی دنیا میں رہتا تھا لیکن مولوی ہدایت اللہ نے اسے دیکھتے ہی جان لیا تھا کہ وہ مجاز سے حقیقت کے سفر پر گامزن ہے۔ لیکن وہ بار بار پلٹ آتا ہے۔۔۔ واپس۔۔۔

ایک روز وہ اپنی منزل پر یوں چل پڑے گا کہ پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھے گا۔ یتیم خانے کی زندگی نے انہیں انسانوں کی پہچان اور سمجھ عطا کی تھی۔ اس کی خاندانی نجابت اس کی کشادہ اور روشن پیشانی سے جھلکتی تھی۔ اس کا لہجہ' اس کی جھکی نظریں بتاتی تھیں کہ وہ اعلا خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ جہاں اقدار کی پاسبانی کی جاتی ہے۔

ان کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ صرف دو بیٹیاں تھیں اور اسے دیکھتے ہی انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسے اپنا بیٹا بنا لیں گے۔ وہ ان کا جانشین ہو گا۔ اس کی بہکی بہکی باتیں انہیں بتا گئی تھیں کہ وہ ساری زنجیریں کاٹ کر اور سارے رشتے توڑ کر آیا ہے۔۔۔ واپسی کے لیے اس نے کوئی راہ نہیں

رکھی۔ اگر اُسے جانا بھی ہوا تو آگے ہی جائے گا۔

اللہ یار کا نام انہوں نے خود ہی اسے دیا تھا۔ یتیم خانے میں اللہ یار ان کا بہت اچھا دوست تھا۔ جب تک وہ یتیم خانے میں رہا۔ دونوں ہمیشہ ایک ساتھ رہتے تھے۔ لیکن ایک دن وہ استاد جی کی مار کھا کر بھاگ گیا۔۔۔ اس نے انہیں بھی ساتھ چلنے کو کہا تھا لیکن وہ بزدل تھے۔ کم از کم یتیم خانے میں وہ بھوکے تو نہیں رہتے تھے۔۔۔ سونے کے لیے بستر بھی تھا سر پر چھت بھی تھی۔ انہوں نے اللہ یار کو سمجھایا بھی تھا۔ لیکن اللہ یار کو مولوی فضل داد سے چڑ ہو گئی تھی جو قرآن کا درس دیتے تھے اور مولوی فضل داد بھی ذرا سی غلطی پر اسے دھن ڈالتے تھے۔ یوں ایک دن وہ مولوی صاحب کی مار کھا کر ایسا بھاگا کہ پھر دوبارہ کبھی مولوی ہدایت اللہ کی ان سے ملاقات نہ ہوئی تھی مگر وہ انہیں بھولا کبھی نہیں تھا۔ اس لیے تو بے اختیار ہی انہوں نے اجنبی جوان کو اللہ یار کا نام دے دیا تھا اور اجنبی نے بھی کوئی تردید نہیں کی تھی۔ وہ اپنے حواس میں ہی کب تھا۔۔۔ ان چند ماہ میں وہ اسے اپنے دل کے بہت قریب محسوس ہونے لگے تھے۔ وہ ہولے ہولے اسے پاس بٹھائے باتیں کرتے تھے۔

اللہ کی باتیں۔

اسلام کی باتیں۔

قرآن کی باتیں۔

کئی بار تو یوں ہوتا کہ وہ کسی آیت کی تفسیر بیان کرتے تو وہ ایک دم انہیں ٹوک کر بولنے لگتا تھا اور وہ حیران آنکھوں میں تحسین کی چمک لیے اسے سنتے رہتے تھے۔۔۔ اس کے پاس بہت علم تھا۔

کئی بار ایسا ہوا کہ انہوں نے جان بوجھ کر کچھ غلط مطلب نکالا تو وہ تڑپ اٹھا۔

"ایسا مت کریں مولوی صاحب! کیا آپ مجھے آزما رہے ہیں۔" ایک بار اچانک ہی اس نے کہا تو مولوی ہدایت اللہ سٹپٹا گئے۔

"میں نہ پاگل ہوں نہ دیوانہ۔۔۔ لیکن میرے راستے الجھ گئے ہیں۔ ایک راستہ اپنی طرف بلاتا ہے تو دوسرا اپنی طرف کھینچتا ہے۔"

"تو کوئی ایک راہ کیوں نہیں اختیار کر لیتے اللہ یار۔"

"کیسے۔۔۔ کیسے کروں اختیار۔ ایک راستہ بالکل بند ہے۔ جتنا بھی چلوں چلتا جاؤں۔۔۔ وہ بند ہی ملے گا ادھر جانے پر اختیار نہیں اور دوسرا راستہ۔ مجھے اپنا آپ اس راہ پر چلنے کے قابل نہیں لگتا۔ بڑی مشکل راہ ہے۔ بڑا اوکھا پینڈا ہے۔ میں تو اس راہ پر ذرا سا چل کر ہی ہمت ہار بیٹھا ہوں اور وہ جھونپڑی والا بابا کہتا تھا۔۔۔ اس نے تمہیں چن لیا۔ وہ راہ تمہاری نہیں۔۔۔ وہ بند گلی

تھی۔۔۔ یہ راہ تمہاری ہے اسی پر چل کر منزل پاؤ گے۔ پر مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ کون سی راہ پر چل کر منزل ملے گی۔ اور وہ اوپر آسمانوں پر بیٹھا مجھ پر ہنستا ہے۔ میرے اندر تو عجب طرح کی آگ لگی ہے جو جلاتی ہے اور راکھ کرتی ہے۔"

بات کرتے کرتے وہ پھر کھو گیا تھا اور ہاتھوں کی انگلیوں سے زمین پر لکیریں بنانے لگا تھا۔ لکیریں جو راستے تھے۔۔۔ راہیں تھیں۔۔۔ لیکن ہر راہ بند ملتی تھی۔

"یہ ہر راہ بند کیوں ملتی ہے عبدالقادر۔" ایک بار انہوں نے عبدالقادر سے پوچھا تھا۔

"پتا نہیں۔" عبدالقادر بھلا کیا جواب دیتا۔

"جھونپڑی والا بابا کہتا تھا' عبدالقادر یہ اس کی مرضی ہے چاہے تو ساری راہیں بند کر دے اور چاہے تو سب راستے کھول دے۔ بس صرف ایک راستہ۔۔۔ ایک گلی کھول دے وہ' اور باقی چاہے ساری راہیں سارے راستے بند کر دے۔"

"اللہ۔۔۔ اے اللہ۔"

وہ آسمان کی طرف چہرہ کیے با آواز بلند پکارنے لگا تھا اور پھر سخت زمین پر اس نے یوں پیشانی بار بار پٹخی تھی کہ کھال پھٹ گئی تھی اور خون رسنے لگا تھا اور عبدالقادر گھبرا کر مولوی ہدایت اللہ کو بلا لایا تھا اور اس کی پیشانی پر مرہم لگاتے ہوئے مولوی ہدایت اللہ ہولے ہولے اس کے کان میں کہتے رہے تھے۔

"ہولے ہولے میرے بچے سہج سہج کر قدم اٹھا۔ جلدی کرنے میں گرنے کا خطرہ ہے۔"

"میں تو نہیں چلا بالکل بھی۔" وہ معصومیت سے مولوی ہدایت اللہ کو دیکھنے لگا تھا۔

"میں تو اسے بلا رہا تھا۔" اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ "تاکہ بند گلی کھل جائے لیکن وہ میری آواز نہیں سنتا میری پکار اس تک نہیں پہنچتی۔"

"وہ سب کی سنتا ہے بیٹا! تیری بھی سنتا ہے بیٹا!"

"نہیں وہ میری نہیں سنتا۔" وہ مچل گیا۔۔۔ رونے لگا۔

مولوی ہدایت اللہ نے اسے سینے سے بھینچ لیا تھا اور تھپکنے لگے تھے اور اس رات جب وہ تہجد کے لیے اٹھے تو انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔

"یا رب العالمین! اس کی مشکل آسان کر دے۔ کوئی ایک راہ اس کے لیے کھول دے۔ اسے مجھے بخش دے۔ میں نے اپنے لیے آج تک تجھ سے کچھ نہیں مانگا۔ آج اس کے لیے مانگ رہا ہوں۔ اس کو ہوش و خرد عطا کر اس کی بے چینی دور فرما۔ اس کا اضطراب ختم کر دے میرے مولا۔ میں جانتا ہوں' وہ مجاز کی راہ سے بھٹک کر تیری طرف آ رہا ہے۔ لیکن مجاز کی کشش اور دل کی طلب اس کے پاؤں باندھتی ہے اور وہ رک رک جاتا ہے۔ اس کے راستے

آساں' کر دے اسے یقین عطا کر اپنا۔ اپنے ہونے کا ادراک بخش اور زندگی کو اس کے لیے آسان بنا دے۔"

شاید وہ کوئی لمحۂ قبولیت تھا یا ان کی دعا میں ہی اتنی تاثیر تھی کہ آج جو اللہ یار ان کے سامنے پریشان سا بیٹھا تھا۔ چند ماہ پہلے کے اللہ یار سے قطعی مختلف تھا۔

"اگر آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہے تو میں اور عبدالقادر آپ کو شہر لیے چلتے ہیں۔ وہاں ٹیسٹ ہوں گے تو پتا چل جائے گا' کس طرح کا بخار ہے۔"

"اوہ نہیں پتر۔۔۔ موسمی بخار ہے۔ ایک دو روز میں اتر جائے گا۔ تم فکر مند نہ ہو۔" اللہ یار کی فکر مندی ان کے چہرے پر سکون بن کر پھیل گئی۔ شاید اللہ نے ان کی دعا قبول کر لی تھی۔

"اچھا مولوی جی! میں چلتا ہوں اب۔"

"بیٹا! مجھے یہ اجنبیوں کی طرح مولوی جی مت کہا کرو' جب چاچا جی کہہ کر بلاتے ہو تو بہت اچھا لگتا ہے۔ اور ہاں بیٹھو' ابھی تمہاری چاچی روٹی پکا رہی ہو گی کھا کر جانا۔"

"نہیں چلوں گا۔" اللہ یار اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بے چین اور مضطرب سا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر روٹی بھجوا دوں گا مسجد میں لیکن اپنی چاچی سے مل کر جانا۔ تمہارے لیے اداس ہو گئی تھی۔ کتنے دن سے تم گھر نہیں آئے۔"

"جی بس وہ۔" اللہ یار خاموش ہو گیا تھا۔

بے خودی کی بات اور تھی لیکن اب اسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ جوان بچیوں کی موجودگی میں کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی وہ مولوی صاحب کے ہاں ہی رہے۔ گو آج تک اس نے مولوی صاحب کی بچیوں کو نہیں دیکھا تھا نہ ہی وہ کبھی اس کے سامنے آئی تھیں۔

"عشاء کی نماز پڑھا دینا بیٹا۔"

"فجر کی نماز آپ پڑھائیں گے نا۔" جاتے جاتے اللہ یار نے پوچھا۔

"ہاں۔ طبیعت ٹھیک ہوئی تو آ جاؤں گا۔"

اور اللہ یار نے عبدالقادر کے ساتھ واپس مسجد جاتے ہوئے کوئی چار بار کہا۔

"اللہ کرے مولوی صاحب جلدی ٹھیک ہو جائیں۔"

لیکن مولوی ہدایت اللہ کی بیماری تو طول پکڑ گئی تھی۔ بخار نے پورا مہینہ بھر جان نہ چھوڑی۔۔۔ اور اتر بھی گیا تو کمزوری باقی رہی۔ وہ خاموشی سے آ کر آخری صفوں میں کھڑے ہو جاتے اور نماز ادا کر کے چلے جاتے۔۔۔ مکمل صحت یاب ہونے تک اللہ یار چھوٹے مولوی کے نام سے گاؤں میں مشہور ہو چکا تھا۔

لوگ اس کی قرأت کی اس کے الحان کی تعریف کرتے۔۔۔ جمعہ کے روز خطبہ میں لوگ یوں دھیان سے سنتے اس کے بات کرنے کا انداز دل پذیر تھا اور لہجہ پر اثر۔ بولنے پہ آتا تو بولتا چلا جاتا ۔ حتیٰ کہ کوئی اسے احساس دلاتا کہ نماز کا وقت ہوا جاتا ہے۔۔۔ اور پھر دو ماہ بعد مولوی ہدایت اللہ مسجد آنے بھی لگے۔ امامت بھی کرانے لگے لیکن گاؤں کی عورتیں چھوٹے مولوی صاحب سے پانی دم کراتیں ان کے خیال میں چھوٹے مولوی صاحب کی زبان اور دعا میں تاثیر تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کا رنگ ڈھنگ بدل گیا تھا۔

وہ بچوں کو قرآن کا درس دیتا۔ مسجد کی دیکھ بھال کرتا۔ صبح صبح خود اٹھ کر پوری مسجد میں جھاڑو لگاتا اور اگر کبھی مولوی ہدایت اللہ نہ آپاتے تو نماز بھی پڑھا دیتا اور فالتو وقت میں تفاسیر و احادیث کی کتابیں پڑھا کرتا۔ بے ڈھنگے انداز میں بڑھی ہوئی داڑھی کو نفاست سے ترشوا لیا تھا۔ سیاہ داڑھی اس کے سرخ و سفید رنگ پر خوب بجتی تھی۔ کشادہ پیشانی پر سجدوں کا نشان دمکنے لگا تھا اور چہرے سے جیسے روشنی پھوٹتی تھی۔ رات کو دیر تلک جاگتا اور عبادت کرتا تھا۔

"چھوٹے مولوی صاحب نہایت نیک ہیں۔"

گاؤں کے لوگوں کا خیال تھا اور عبدالقادر تو اسے پیر اور ولی سمجھتا تھا۔

"وہ بہت اونچی باتیں کرتے ہیں۔ سمجھ سے بالاتر اور ناقابل فہم۔"

وہ جہاں کہیں دو چار لوگوں کے ساتھ مل کر بیٹھتا۔ مولوی صاحب کے متعلق ضرور کچھ نہ کچھ کہتا۔ جبکہ خود مولوی صاحب اس کی باتوں پر ہنستے تھے۔ جب وہ اپنے ابا کے لیے پانی دم کروانے آیا تھا۔ تو وہ کتنی ہی دیر تک چپ چاپ اسے دیکھتا رہا تھا۔

"آپ دعا کریں میرے ابا کے لیے۔ اس کی کمر میں سخت درد ہے اور پنڈا ابھی آگ کی طرح تپ رہا ہے۔ سب کہتے ہیں آپ کی دعا قبول ہوتی ہے۔ تاثیر ہے آپ کی زبان میں۔"

"جھلے ہیں سب۔" اس نے ہولے سے کہا تھا۔

"میری زبان میں تاثیر ہوتی اور میری دعائیں قبول ہوتیں تو۔۔۔ تو۔۔۔"

اور وہ خاموش ہو گیا لیکن اضطراب جیسے ہر موئے تن سے ٹپکنے لگا تھا۔

وہ کہاں ہے جس کی تلاش میں وہ نکلا تھا اور وہ یہاں بیٹھ کر بھلا کیا کر رہا تھا۔۔۔ کیا وہ اسے راضی کر رہا ہے جو اوپر بیٹھا انسانوں کی قسمتوں کے فیصلے لکھتا ہے اور وہ تو ہر جگہ ہے یہاں' وہاں۔ اسے راضی ہونا ہوتا تو وہاں ہی ہو جاتا۔ منزل اس کے ہاتھوں سے کیوں کھوتی۔۔۔ راستے بے نشان کیوں ہوتے۔

وہ یکایک بے چین ہو کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"مولوی جی! پانی دم کر دیں۔" عبدالقادر نے اسے بلایا تو اس نے چونک کر پانی پر پھونک

ماری۔
"دعا۔۔۔ دعا بھی کریں نا! ابا کو بہت تکلیف ہے۔"
وہ عبدالقادر کا دل نہ توڑنا چاہتا تھا سو دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔۔۔ مگر زبان اور دل کسی اور دعا کا ہی ورد کر رہے تھے۔ ہونٹوں پر کوئی اور ہی نام آتا۔۔۔ اور وہ ٹھٹک جاتا۔
"تو کیا تو اس لیے اس کے گھر کی چاکری کر رہا تھا۔ اس لیے راتوں کو جاگتا تھا کہ تجھے ابھی تک اسی کی طلب ہے۔ تو اس کے پردے میں اسے ہی پکارتا تھا وہ جو بند گلی کے موڑ پر کھو گئی تھی اسے۔" یکایک اس نے ہاتھ گرا دیے اور تیز تیز قدموں سے چلتا مسجد سے باہر نکل گیا۔
اگلے روز عبدالقادر گاؤں میں ہر ایک سے کہتا پھرتا تھا کہ چھوٹے مولوی صاحب کی دعا سے اس کا ابا بھلا چنگا ہو گیا ہے اور مولوی اللہ یار پوری رات کے رت جگے کے بعد صبح صبح مولوی ہدایت اللہ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا کہ انہیں خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو جائے کہ اب دل کو چین نہیں تھا اور اضطراب ایک جگہ بیٹھنے نہیں دے رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"سچ عبیر! تمہیں یہاں دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔" صدف نے چیمبر میں داخل ہوتے ہی عبیر کو مامون کی ٹیبل کے پاس کھڑے دیکھ لیا تھا اور دروازے کے پاس ہی رک کر اس نے عبیر کو خوش آمدید کہا تھا۔ جواباً عبیر مسکرا دی۔
"ویسے مجھے امید نہیں تھی ذرا بھی کہ تمہارے بابا جان اجازت دے دیں گے۔" صدف نے قریب آ کر اس سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔
"ہاں امید تو مجھے بھی نہیں تھی۔"
"ویسے عبیر! تم نے اپنے بابا جان کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ بڑا خوفناک تھا حالانکہ تمہارے بابا جان تو بالکل بھی ویسے نہیں ہیں۔" مامون نے تبصرہ کیا۔
"وہ ایسے ہی ہیں مامون۔ اپنے معاملات میں بہت سخت اور اصول پرست۔۔۔ ہاں میرے معاملے میں وہ ہمیشہ اپنے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ میرے لیے ان کے اصولوں میں لچک ہے لیکن اتنی ہی کہ اس سے ان کے اپنے وضع کردہ اصولوں اور روایات کو ٹھیس نہ لگے۔۔۔ جہاں ایسا ہونے کا ذرا بھی امکان ہو' وہاں میرے معاملے میں بھی وہ سخت ہو جاتے ہیں۔۔۔ میرے لیے یہ نرمی بھی شاید اس لیے ہے کہ ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ سارے ارمان وہ مجھ پر ہی پورے کرنا چاہتے ہیں۔ ورنہ ہمارے ہاں لڑکیوں کی تعلیم کا اتنا رواج نہیں ہے۔ بس زیادہ سے زیادہ بی۔ اے کر لیا۔ ماسٹر کی ڈگری میری پھوپھی نے لی تھی۔ وہ بھی دادا جان کی بہت لاڈلی اور تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں۔ شاید اس لیے۔۔۔ اس کے بعد تایا جان اور چچا جان نے اپنی بیٹیوں کو بس انٹر تک ہی تعلیم دلوائی ہے۔ اور تایا جان تو میری تعلیم کے بھی بہت خلاف تھے مگر اس معاملے میں بابا جان نے ان کی نہ سنی۔ تمہیں پتا ہے۔ بابا جان نے خود انگلش لٹریچر میں ماسٹر بھی کر رکھا ہے۔ یہ ان کا شوق تھا اور دادا جان کی خواہش پر انہوں نے ایم۔ بی۔ اے بھی کیا۔ وہ چاہتے تھے' میں بھی لٹریچر میں ماسٹر کر لوں یا پھر ایم۔ بی۔ اے لیکن پتا نہیں کیوں میں نے لاء کرنے کا سوچا۔ شاید میرے کچھ خواب تھے۔ کچھ عزائم تھے۔ حالانکہ۔۔۔" وہ بولتے بولتے یکدم خاموش ہو کر کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔
"مجھے تو تمہارے بابا جان بہت نرم خو اور محبت کرنے والے شفیق سے لگے تھے۔"
"ہاں' وہ نرم خو اور شفیق بھی ہیں۔" عبیر کے ہونٹوں پر ذرا سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی۔
"انہیں بھی تم سب بہت پسند آئے ہو۔ کہہ رہے تھے' عبیر تمہارے یہ بہن بھائی تو سب بہت اچھے ہیں۔"
"ہمارا تو چانس ہی مار دیا تمہارے بابا جان نے بھائی کہہ کر۔" دانیال جانے کب کمرے میں آیا تھا۔
"بہت بدتمیز ہو تم دانیال۔" عبیر نے مڑ کر اسے دیکھا۔
دانیال نے ایک گہری اور ٹھنڈی سانس لی۔ "تمہارے بابا جان نے جب کہا کہ بھئی! تم سب میرے لیے عبیر کے جیسے ہی ہو اور اس کے بھائیوں جیسے تو پھر دل ہی ڈوب گیا۔" وہ بدستور شرارت کے موڈ میں تھا۔
"مگر خیر میں نے شکر کیا کہ عبداللہ ہمارے ساتھ نہیں تھا۔"
"تم مار کھاؤ گے مجھ سے۔" عبیر جھینپ گئی۔
"ویسے دل میں تو تم نے بھی شکر کیا ہو گا کہ عبداللہ اس صف میں نہیں ہے جہاں تمہارے بابا جان نے ہمیں کھڑا کر دیا تھا۔"
"تم باز نہیں آؤ گے دانی۔" عبیر کے رخساروں پر کھلتے رنگوں میں عجب رعنائی اور چمک تھی۔ اندر داخل ہوتے عبداللہ کی نظر جوں ہی اس پر پڑی۔ ایک لمحہ کو تو جیسے نظر واپس آنا بھول گئی۔۔۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے نگاہیں جھکا لیں۔
"السلام علیکم۔" اس نے مشترکہ طور پر سب کو سلام کیا۔
"تمہیں یہاں دیکھ کر اچھا لگا۔ عبیر خوش آمدید۔" ایک لمحہ کے لیے عبیر کے پاس رک کر کہتا ہوا وہ اپنی ٹیبل کے پاس چلا گیا اور اپنی ٹیبل کی دراز کھولنے لگا۔
اگرچہ دانیال اسے پہلے ہی ساری تفصیل الف سے یے تک بتا چکا تھا۔۔۔ عبیر کے گھر جانا۔۔۔ اس کے بابا جان سے ملنا اور ان کا راضی ہو جانا۔ کھانے پر روکنا اور پھر واپسی پر سب کو

جوڑے دینا کہ یہ ان کی روایات میں سے تھا کہ پہلی بار کوئی گھر آئے تو اسے خالی نہیں لوٹاتے۔

گو عبھو کا چیمبر آنا اور انہیں جوائن کرنا متوقع تھا پھر بھی عبداللہ کو خوشگواری کا سا احساس ہوا جیسے ایک دم ہی فضا بہت خوشگوار ہو گئی ہو۔ اور کمرہ روشن روشن سا ہو۔

"دل کی کیفیات کس طرح اردگرد کے ماحول پر اثر انداز ہوتی ہیں۔" اس نے دراز سے فریدہ الیاس کے کیس کی فائل باہر نکالتے ہوئے سوچا۔

ابھی جب وہ ویگن سے اترا تھا تو اسے انتہائی گھٹن، حبس اور گرمی کا احساس ہو رہا تھا لیکن اب دل بہت خوشگوار انداز میں دھڑک رہا تھا۔

عبھو نے مڑ کر عبداللہ کو دیکھا اور اس کے چہرے کے رنگ اور گہرے ہو گئے اور وہ مامون کی ٹیبل کے پاس سے ہٹ کر صدف کی ٹیبل کے پیچھے بیٹھ گئی۔ دانیال بھی کوئی کتاب دیکھنے لگا تھا۔ عبداللہ نے فائل اٹھائی اور مامون کی ٹیبل کے پاس آکر اس سے ڈسکس کرنے لگا۔ تب ہی منشی نے اندر آکر فریدہ الیاس کے آنے کی اطلاع دی۔

"ہاں ہاں لے آؤ۔ میں اسی کا انتظار کر رہا تھا۔" عبداللہ نے مامون کے ہاتھ سے فریدہ الیاس کے کیس کی فائل لے لی۔

فریدہ الیاس جھجکتی ہوئی سی اندر داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک نوعمر سا لڑکا تھا۔

"آیئے پلیز۔ تشریف رکھیں۔" عبداللہ نے کھڑے ہو کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کچھ کچھ گھبرائی سی دیوار کے ساتھ لگے صوفوں پر بیٹھ گئی۔ وہ لڑکا بھی بیٹھ گیا۔ عبھو نے بغور اسے دیکھا۔ وہ دبلی پتلی سی بڑی بڑی آنکھوں والی گندمی رنگت کی ایک دلکش لڑکی تھی۔

"میں نے آپ کا کیس اسٹڈی کیا ہے۔ انشاءاللہ نہ صرف آپ کے بھائی بازیاب ہو جائیں گے بلکہ آپ کی جائیداد بھی مل جائے گی انشاءاللہ۔ سب سے پہلے تو آپ کو یہ کرنا ہے کہ کیس پولیس میں لے کر جانا ہے۔" اس نے نوجوان کی طرف دیکھا۔ اور ٹیبل پر پڑی CrimnalPakistanPenal Code کو کھولا۔

"اس میں یہ سارا پروسیجر ہے کہ پولیس میں کیس کیسے لے کر جانا ہے ابھی آپ کے آنے سے پہلے میں اسی کی اسٹڈی کر رہا تھا آپ کو سمجھاتا ہوں۔"

"دراصل وہ۔۔۔ وہ جی۔" نوجوان کچھ سہما اور گھبرایا ہوا سا تھا۔

"وہ جی مسئلہ یہ ہے کہ ہم کیس نہیں کرنا چاہتے۔ میرا مطلب ہے باجی فریدہ۔"

"کیوں؟" عبداللہ نے حیران ہو کر فریدہ کی طرف دیکھا جو سر جھکائے بیٹھی تھی اور آنسو نہایت خاموشی سے اس کی آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

اسے حقیقتاً "شاک لگا تھا۔ ملک صاحب نے یہ کیس اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا تھا۔

"عبداللہ! یہ تمہارا امتحان ہے۔"

سو وہ اور دانیال اس کیس پر بہت سنجیدگی سے کام کر رہے تھے۔

"ہم نے باجی فریدہ کو پناہ دی ہے۔ لیکن ہم۔۔۔ میرا مطلب ہے میرے والد صاحب اس سے زیادہ اور ان کی مدد نہیں کر سکتے۔۔۔۔ ہم دشمنی افورڈ نہیں کر سکتے۔" اب لڑکے کی آواز میں کچھ اعتماد آچلا تھا۔

"لیکن تمہارے والد خود فریدہ صاحبہ کے ساتھ مدد کے لیے ملک صاحب کے پاس آئے تھے پھر اب۔" عبداللہ نے بغور اسے دیکھا۔

"کیا کسی نے کوئی دھمکی دی ہے؟"

نوجوان سٹپٹایا۔ "وہ جی خوامخواہ پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے سے فائدہ۔"

عبداللہ سمجھ گیا کہ ضرور فریدہ کے ماموں نے ان لوگوں کو کسی طرح کی دھمکی دی ہے ورنہ دو دن پہلے جب فریدہ ان صاحب کے ساتھ آئی تھی تو وہ فریدہ کا حق دلوانے کے لیے خاصے پُرجوش تھے۔ اور کئی بار انہوں نے فریدہ کے والد کے ساتھ اپنے اچھے تعلقات کا ذکر کیا تھا۔

"اور آپ کے بھائی، کیا ان کی کوئی خبر، اطلاع ملی آپ کو؟" عبداللہ فریدہ کی طرف متوجہ ہوا۔

فریدہ کے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے اور اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر۔۔۔ پھر آپ کیس کیوں نہیں کرنا چاہتیں۔"

"دیکھیں جی اگر انہیں ہمارے گھر میں رہنا ہے تو پھر یہ کیس وغیرہ نہ کریں۔ میرے والد اور ہم اپنے طور پر بازیاب کروانے کی کوشش کریں گے ان کے بھائیوں کو۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے نہ دولت نہ جائیداد۔ میں محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بھائیوں کا پیٹ پال لوں گی بس مجھے میرے بھائیوں کا پتا مل جائے۔" وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

عبداللہ کی آنکھوں میں الجھن تھی وہ فریدہ الیاس کا مسئلہ سمجھ رہا تھا اور اس نوجوان کا بھی۔ وہ حقیقتاً "اس لڑکی کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن جب وہ خود ہی کچھ کرنے کے لیے تیار نہ تھی تو۔۔۔"

"بی بی! کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کے بھائی مل جائیں گے۔" دانیال نے پوچھا۔ وہ اور زیادہ شدت سے رونے لگی۔

"میں ان کا مسئلہ سمجھ گئی ہوں۔" عبھو اپنی جگہ سے اٹھ کر عبداللہ کے قریب آکھڑی ہوئی۔

"اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ لوگ جن کے ہاں اس نے پناہ لے رکھی ہے' یقیناً" وہ ڈرتے ہوں
گے کہ اگر اس کے ماموں کے نام سمن جاری ہوا اور اس کو پتا چلا کہ اس کی پشت پناہی یہ لوگ کر
رہے ہیں تو وہ شاید ان کے لیے کوئی مسئلہ نہ کھڑا کر دے۔"

"جی۔۔جی بالکل یہی بات ہے۔" نوجوان نے جلدی سے کہا۔

"باجی فریدہ کے ماموں کو کہیں سے سُن گُن مل گئی ہے کہ ابا انہیں وکیل کے پاس لائے ہیں تو
انہوں نے ابا کو دھمکی دی تھی کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو ہمارے حق میں اچھا نہ ہو گا۔۔۔
ہم تو جی شریف لوگ ہیں۔ ابا بیٹیوں کے باپ ہیں۔ سو ڈرنا چاہیے۔ ابا نے کہا ہے باجی فریدہ
ساری زندگی ان کے گھر رہیں' وہ ان کی شادی بھی کرا دیں گے کسی اچھے لڑکے کو دیکھ کر۔ دونوں
چھوٹوں کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کریں گے لیکن یہ کیس ویس مت کریں اور اپنی جائیداد
وغیرہ کو بھول جائیں۔"

"لیکن اپنا حق چھوڑنا کہاں کی عقلمندی ہے جناب۔" دانیال نے نوجوان کے کندھے پر ہاتھ
رکھا۔

"مجبوری ہے۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"آپ کیس مت تیار کیجیے گا۔ ہم صرف یہی کہنے آئے تھے۔"

"اس کا ایک حل ہے میرے پاس۔" عبیر ابھی تک عبداللہ کے قریب کھڑی تھی۔ "اگر
فریدہ پسند کرے تو میرے ساتھ میرے گھر چلے اور کیس عدالت میں جانے' فیصلہ ہونے تک
میرے پاس رہے۔"

فریدہ کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔ نوجوان نے سوالیہ نظروں سے فریدہ کی طرف دیکھا۔

"اور اگر میری وجہ سے آپ پر کوئی مصیبت آ گئی تو؟" فریدہ نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو
پونچھے۔

"ارے ان پر مصیبت نہیں آ سکتی۔ یہ تو دوسروں پر مصیبت لانے والے طبقہ سے تعلق
رکھتی ہیں۔" دانیال چہکا۔

عبیر نے مصنوعی غصے سے اسے گھورا۔

"جاگیردار جو ہیں تمہارے والد۔۔۔ اور یہ تم اس طرح نظروں کے تیر مت چلاؤ۔۔۔ میں نہیں
سہہ پاؤں گا۔" اس نے ایکٹنگ کی۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے تم اپنی اسی زبان سے میرے بابا جان کی تعریف کر رہے تھے۔"

"تو اب کیا میں نے کوئی برائی کی ہے۔ بلکہ میں نے تمہارے طبقے کی تعریف کی ہے۔" دانیال
کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"عبیر! کیا تم سنجیدہ ہو۔" عبداللہ نے عبیر سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ فریدہ اگر چاہیں تو ابھی میرے ساتھ چلیں۔"

"نہیں وہ میں انکل سے پوچھ کر آپ کے ساتھ چلوں گی۔" فریدہ نے فوراً کہا۔

"آپ کے لیے یہ بہت بہتر ہو گا۔ وہاں میرا مطلب ہے' عبیر کے گھر آپ کو کوئی خطرہ نہیں
ہو گا۔" عبداللہ نے اسے سمجھایا تو اس نے سر ہلا دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں کل۔۔۔ کل آ جاؤں گی انکل سے اجازت لے کر۔"

"او کے۔" عبداللہ نے مڑ کر عبیر کی طرف دیکھا۔

"تمہارے بابا جان کو تو اعتراض نہیں ہو گا۔"

"میرے خیال میں نہیں۔۔۔ ویسے بھی بابا جان کے اعتراض کی کوئی وجہ نہیں ہے۔"

"چلو جی۔ پہلا کیس تو ٹھپ ہوا۔" دانیال کرسی پر دھپ سے گرتے ہوئے بولا۔

"بھئی مامون تم سناؤ۔ فضل داد کے کیس کا حال۔۔۔"

"ٹھیک ہے چل رہا ہے' تم میری فکر میں دبلے مت ہوا کرو۔" مامون نے تیزی سے قلم
چلاتے ہوئے کہا۔

"یار! ہم تمہاری فکر میں دبلے نہیں ہوں گے تو اور کون ہو گا۔"

"بہت ہیں۔" مامون نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

"مثلاً" دانیال شرارت کے موڈ میں تھا۔

عبیر کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔ عبداللہ نے فائل بند کر کے دراز میں رکھی اور
ایک نظر عبیر پر ڈالی جو واپس صدف کے پاس جا کر بیٹھ گئی تھی۔ لبوں پر مسکراہٹ لیے دانیال
کی طرف دیکھتی وہ عبداللہ کو بہت دلکش لگی اور اندر کہیں دھڑکنوں نے اودھم مچایا تو اس نے
خود کو سرزنش کی۔

"نہیں۔۔۔ مجھے عبیر کے متعلق نہیں سوچنا چاہیے۔ کہاں وہ۔۔۔ ایک بڑے جاگیردار کی
بیٹی اور کہاں میں ماسٹر شفیق احمد ایک اسکول ٹیچر کا بھتیجا۔" لیکن دل یہ ساری مصلحتیں نہیں
جانتا۔ اس لیے عبیر کے نام پر بے تحاشا دھڑک اٹھتا۔ گو آج تک دونوں نے ایک دوسرے
سے اس طرح کی کوئی بات نہیں کی تھی کہ دلی جذبوں کا اظہار ہوتا لیکن شاید دونوں ہی اپنی اپنی
جگہ ایک دوسرے کی کیفیات سمجھتے تھے۔ عبداللہ کو اپنی کم مائیگی کا احساس تھا اور عبیر لڑکی
ہونے کے ناتے اظہار میں پہل سے گھبراتی تھی۔

گو دانیال اور مامون ڈھکے چھپے لفظوں میں دونوں پر چوٹیں کر جاتے لیکن دونوں ہی نظر انداز
کر دیتے تھے۔ کاش عبیر بھی اسی کی طرح ایک عام گھرانے کی عام سی لڑکی ہوتی۔

بے اختیار عبداللہ کے دل نے خواہش کی اور عجیب بے بسی سی محسوس کرتے ہوئے اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ آنکھیں یکدم سرخ ہو گئی تھیں۔

"کیا ہوا؟" عبیر کی نظر اچانک ہی اس پر پڑی تھی۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا عبداللہ۔" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"ہاں۔" عبداللہ نے خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کی "میں ٹھیک ہوں یوں ہی بس سر میں ہلکا درد محسوس ہو رہا تھا۔"

لاحاصل اور نارسائی کا درد اندر ہولے ہولے پھیل رہا تھا۔ اور یہ درد نیا نہیں تھا پہلی بار جب اس نے اپنے دل میں عبیر کے لیے کچھ اچھے جذبے محسوس کیے تھے۔ تو یہ درد بھی ساتھ ہی اٹھا تھا۔ اندر گہرائی میں کہیں یہ احساس شدت سے موجود تھا کہ اس کے راستے عبیر کے راستوں سے نہیں ملتے۔ اس لیے وہ کچھ کہنے سے گریز کرتا تھا۔ حالانکہ کئی بار اس نے عبیر کی نظروں میں شکوہ دیکھا جب اس نے دانستہ اسے نظر انداز کیا۔ اور یہی شکوہ اب بھی اس کی دلکش آنکھوں میں تڑپا تھا۔

"عبداللہ تم۔ اتنے اجنبی کیوں ہو جاتے ہو ہم سے۔ تم اپنی پریشانی شیئر کیوں نہیں کرتے۔ تم فریدہ الیاس کے کیس واپس لے لینے کے خیال سے پریشان ہو۔"

وہ اس کی بے خبری پر مسکرایا۔ ایسی مسکراہٹ جو ہمیشہ اس کے پورے چہرے کو روشن کر دیا کرتی تھی۔

"ایسا کچھ نہیں ہے عبیر۔" اس کے لہجے میں ہمیشہ جیسی نرمی تھی۔ عبیر کو اس کا نرم لہجہ بہت پسند تھا اور بولنے کا انداز بھی۔

"میرے سر میں واقعی درد ہے۔۔۔ اور فریدہ کیس واپس نہیں لے گی۔۔۔ مجھے یقین ہے۔"

"رئیلی۔" عبیر مسکرائی۔

"تو تم گھر چلے جاؤ۔ بلکہ ہم سب ہی چلتے ہیں۔" صدف نے بھی اپنی چیزیں اٹھا کر دراز میں ڈالیں۔

"یوں بھی ملک صاحب بھی نہیں ہیں۔۔۔ اور ٹائم بھی کافی ہو گیا ہے۔۔۔ عبیر! تم مجھے ڈراپ کر دو گی آج۔"

"یوں آج میں ڈراپ نہیں کر سکتا کیا۔" دانیال نے فوراً نوٹس لیا۔

"بھئی اب عبیر آ گئی ہے تو وہی ڈراپ کر دیا کرے گی مجھے۔" صدف نے لاپروائی سے کہا۔

"اور وہ جو میں نے تمہارے ابا سے وعدہ کیا تھا کہ ہر روز صحیح سلامت گھر کے دروازے پر چھوڑ جایا کروں گا۔ اس وعدے کا کیا ہو گا۔"

"وعدہ گھر پہنچانے کا تھا۔۔۔ تمہارا پہنچانا ضروری نہ تھا۔" صدف نے پرس ٹیبل سے اٹھایا۔

"تو چلیں عبیر۔"

"ہاں چلو۔۔۔" عبیر نے عبداللہ کی طرف دیکھا۔

"تم بھی آ جاؤ عبداللہ! میں ڈراپ کر دوں گی۔"

"نہیں۔ میں چلا جاؤں گا ٹیکسی سے۔"

عبیر کی آنکھوں میں وہی شکوہ نظر آیا۔

"ایسی آفرز ٹھکرایا نہیں کرتے ڈیئر! جاؤ۔" دانیال نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"عبداللہ نے لمحہ بھر کو کچھ سوچا اور پھر خاموشی سے عبیر اور صدف کے ساتھ چیمبر سے باہر نکل آیا۔

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے ماسٹر صاحب! جب سے آپ اسکول سے آئے ہیں مسلسل کچھ سوچ رہے ہیں۔" زہرہ بیگم نے چائے کا کپ شفیق احمد کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ کچھ نہیں بس یونہی۔" شفیق احمد نے نظریں اٹھا کر زہرا بیگم کو دیکھا۔

"بچیاں جاگ گئیں۔"

"ہاں۔ سوتی کہاں ہیں دوپہر میں۔ یوں ہی کمرے میں لیٹ جاتی ہیں۔ انعم البتہ آج یونیورسٹی سے آ کے سو گئی تھی کچھ دیر کو' پہلا دن تھا نا کچھ تھک گئی تھی۔"

"کوئی پرابلم تو نہیں ہوا۔"

"نہیں سب ٹھیک رہا۔ یہ بھی شکر ہے کہ اب لڑکیوں کی الگ یونیورسٹی ہے۔"

"الگ یونیورسٹی نہ بھی ہوتی تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا زہرا بیگم۔۔۔ اسٹوڈنٹس صرف اسٹوڈنٹس ہوتے ہیں۔۔۔ وہ لڑکے لڑکیاں نہیں ہوتے۔" انہوں نے چائے کا کپ اٹھا کر ایک چسکی لی۔

"یہ آپ کا خیال ہے۔۔۔ ورنہ آج کل کا ماحول آپ نہیں جانتے۔"

"جانتا ہوں سب' لیکن مجھے اپنی بچیوں پر اور اپنی تربیت پر اعتماد ہے۔"

وہ چائے پیتے ہوئے پھر سوچ میں پڑ گئے۔ زہرا بیگم سامنے بیٹھی غور سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

"ماسٹر صاحب! کوئی بات آپ کو پریشان کر رہی ہے کیا؟" ان سے صبر نہ ہوا تو وہ پھر پوچھ بیٹھیں۔

"نہیں کوئی بات پریشان نہیں کر رہی البتہ آج ایک عجیب بات ہوئی۔ میں اسکول سے آتے

ہوئے راستے میں بھائی شیر علی کی دکان پر رک گیا۔ تم نے چاول وغیرہ لانے کو کہا تھا نا تو مجھے لگا جیسے کوئی شخص مجھے دیکھ رہا ہے۔۔۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک تقریباً اکیاون سال کی عمر کا آدمی تھا۔۔۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی اور وہ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔۔۔ میں منتظر رہا کہ شاید وہ مجھ سے بات کرے۔ لیکن وہ دور سے ہی مجھے دیکھتا رہا۔ میں شیر علی کی دکان سے ہٹ کر رمضو حجام کے پاس جا بیٹھا۔ بال بنوائے تو بھی وہ کچھ فاصلے پر کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں کچھ ڈسٹرب سا ہو گیا ہوں۔“

”کمال کرتے ہیں آپ بھی ماسٹر صاحب! اس میں ڈسٹرب ہونے کی کیا بات تھی۔۔۔ اتنا عرصہ ہو گیا آپ کو پڑھاتے ہوئے۔۔۔ سینکڑوں شاگرد ہوں گے آپ کے‘ کسی کا باپ بھائی ہو گا۔۔۔ آپ کو دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو گا۔ ممکن ہے سالوں پہلے کبھی آپ سے اپنے بچے وغیرہ کے سلسلہ میں ملا ہو۔ آپ کو خود پوچھ لینا چاہیے تھا اس سے کہ وہ کون ہے۔“

”ہاں۔ شاید تم صحیح کہتی ہو۔ شاید کسی شاگرد کا کوئی عزیز ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے ایک پرانا اسٹوڈنٹ آیا اسکول میں‘ آج کل آرمی میں کرنل ہے۔ پہچان ہی نہیں پایا اس کو میں۔۔۔ جب اس نے تعارف کروایا تو مجھے یاد آیا کہ جن دنوں میں نیا نیا اس اسکول میں آیا تھا تو یہ بچہ آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا اور حساب کے سوال حل نہ کرنے پر روز مجھ سے سزا پاتا تھا۔“ انہوں نے کپ میں بچی باقی ماندہ چائے ایک ہی گھونٹ میں پی کر خالی کپ زہرا بیگم کو پکڑاتے ہوئے بغور انہیں دیکھا۔

”زہرا بیگم! اگر کبھی عبداللہ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا تو کیا تم رہ لوگی عبداللہ کے بغیر۔“

”ماسٹر صاحب! آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ عبداللہ بھلا ہمیں چھوڑ کر کیوں جائے گا۔ پھر اس کا ہمارے سوا اور ہے بھی کون۔“ زہرہ بیگم کے لہجے میں ناراضی تھی۔ لگ رہا تھا کہ انہیں شفیق احمد کی بات اچھی نہیں لگی۔

”اس کے ننھیال والے۔“ شفیق احمد نے پر خیال انداز میں کہا۔

”ننھیال والوں نے آج تک اتنے برسوں میں خبر نہیں لی۔ اب یکا یک کیا ان کی محبت اُمڈ آئے گی۔ پھر نانا نانی تو ہیں نہیں جن کے دل میں بیٹی کی اولاد کی چاہ ہوتی۔۔۔ اور جب تک زندہ رہے تب کون سا بھاگ بھاگ کر آتے رہے‘ عبداللہ کو دیکھتے رہے۔ ماموں خالہ تو سب اپنی اپنی اولادوں میں بھول بھی بیٹھے ہوں گے کہ کوئی بہن کی اولاد بھی تھی۔ بیٹی کی قبر یہاں ہوتی تو شاید کبھی قبر پر آنے کے بہانے عبداللہ کو بھی دیکھنے آ جاتے مگر اماں اور بھائی ضد کر کے لاش بھی لے گئے قصور دفن کرنے۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ بھابھی جان کی قبر یہاں ہی ہونا چاہیے تھی۔ بھائی جان کے ساتھ۔۔۔“

”خیر جس کے نصیب میں جہاں کی مٹی ہوتی ہے۔ وہی ملتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ لاشیں اس پوزیشن میں تھیں ہی نہیں کہ انہیں یہاں لایا جاتا مگر اماں جان کی خاطر میں بھائی جان کی ڈیڈ باڈی لے آیا یہاں‘ جبکہ فیصلہ یہ ہی ہوا تھا کہ لاہور میں ہی دفنا دیا جائے۔ اور بھائی جان کے سسر نے کہا تھا کہ یہاں لاہور میں کون ہے ہمارا۔ کوئی قبر پر فاتحہ پڑھنے والا بھی نہیں ہو گا تو قصور میں لے جاتے ہیں اور مجھے کوئی اعتراض بھی نہیں ہوا تھا اس پر۔۔۔ اور وہ تو عین وقت پر جب سب انتظام ہو گیا قصور لے جانے کا تو اماں جان نے فون پر کہہ دیا کہ بھائی صاحب کو وہ یہاں ہی دفن کریں گی تو یوں وہ بھابھی جان اور۔۔۔“

اتنے سارے سالوں بعد بھی بھائی اور بھابھی کی جوان موت کا ذکر کرتے ہوئے شفیق احمد کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کیے۔ زہرہ بیگم کا دل بھی بھر آیا۔ میکہ بھی کوئی لمبا چوڑا نہ تھا اور سسرال میں ایک جیٹھ تھے‘ وہ بھی یوں جوانی میں چلے گئے۔

کبھی کبھی کومل اور ثمن کو اس کا بہت احساس ہوتا تھا کہ ان کے کوئی قریبی عزیز نہیں۔ خالائیں دونوں بیاہ کر کراچی اور حیدر آباد گئی تھیں سالوں بعد کہیں ملاقات ہوتی۔ ماموں ملک سے باہر تھے۔

”پھر بھی زہرا بیگم اگر کبھی عبداللہ نے خود چاہا‘ اس کے دل میں خواہش ہوئی اپنے ننھیالی رشتہ داروں سے ملنے کی۔“ آنسو پونچھ کر کچھ توقف کے بعد پھر ماسٹر شفیق احمد نے پوچھا۔

”آپ کی سوئی ابھی وہاں ہی اٹکی ہوئی ہے۔ آخر اتنے سال ہو گئے کبھی عبداللہ نے ایسا کچھ نہیں کہا۔“

”لیکن زہرا بیگم! اپنے عزیزوں سے ملنے کی خواہش پیدا ہونا تو فطری سی بات ہے۔“

”تو کیا ہوا۔۔۔ اگر دل چاہے گا اس کا تو مل آئے گا اپنے عزیزوں رشتہ داروں سے‘ لیکن بیٹا تو وہ ہمارا ہے۔ ہم نے اسے پالا ہے۔ وہ ہم سے کتنی محبت کرتا ہے یہ آپ جانتے ہیں۔ وہ ہمیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔“ زہرا بیگم نے بہت یقین سے کہا۔

”اور پھر اس کے جانے کی کوئی تک نہیں بنتی۔ پتا نہیں آپ کے دل میں یہ خیال کیونکر آ گیا۔“

”یونہی بس خیال آ گیا۔ خیال کا کیا ہے جانے کیسے کیسے خیال آتے ہیں۔“ شفیق احمد ابھی بھی کسی گہری سوچ میں تھے۔

”اس بیماری نے اصل میں آپ کو شکی کر دیا ہے۔ فضول باتیں آپ کے دماغ میں گھسی رہتی

ہیں۔"

"اچھا خیر چھوڑو' عبداللہ کہاں ہے۔"

"اپنے کمرے میں ہی آرام کر رہا ہے۔ دو بجے آ گیا تھا گھر' کورٹ سے۔ پھر انعام کو لینے چلا گیا۔"

"بیگم۔" ماسٹر شفیق احمد نے پرخیال انداز میں پوچھا۔ "کبھی عبداللہ نے اپنے ننھیال کے متعلق پوچھا' کبھی بات کی ان کے متعلق؟۔"

"اُفوہ! ماسٹر صاحب! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔" زہرہ بیگم نے زچ ہو کر کہا۔

"عبداللہ نے آج تک کبھی اس کے متعلق بات نہیں کی۔"

"کس کے متعلق بات نہیں کی امی جان۔" عبداللہ اپنی آستینوں کو کہنیوں تک موڑتا ہوا اندر داخل ہوا۔

"کچھ نہیں بیٹا۔" زہرا بیگم ابھی تک جھنجلائی ہوئی تھیں۔

"یہ تمہارے چچا جان کو ہی ہول اٹھا ہے کچھ۔"

"کیا؟" عبداللہ نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

شفیق احمد نے تنبیہی نظروں سے انہیں دیکھا۔ لیکن وہ جو ماسٹر شفیق احمد کی اس طرح کی مسلسل گفتگو سے جھنجلا گئی تھیں۔ انہوں نے ان کی تنبیہہ کو نظر انداز کرتے ہوئے عبداللہ کو صاف کہہ دیا۔

"یہی کہ کہیں تم ہمیں چھوڑ کر اپنے ماموں یا خالہ کے پاس نہ چلے جاؤ۔"

"چچا جان!" عبداللہ کو یکدم شاک سا لگا۔ لمحہ بھر تو وہ یونہی سکتے کی سی کیفیت میں کھڑا رہا۔ پھر جب بولا تو اس کی آواز میں غم کا تاثر گہرا تھا اور لمحہ بھر پہلے چہرے پر جو مسکراہٹ کا تاثر تھا وہ سنجیدگی میں ڈھل گیا تھا۔

"آپ نے ایسا سوچا ہی کیوں۔۔۔ یہ خیال ہی کیوں آیا آپ کے دل میں۔ کیا مجھ سے کہیں کوئی کوتاہی ہوئی۔ کیا میری محبت اور اطاعت میں کہیں کوئی کمی محسوس کی آپ نے۔"

وہ یکدم شفیق احمد کے پاؤں کے پاس زمین پر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ ان کے گھٹنوں پر رکھ دیے۔ خوبصورت آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

"میں نے تو کبھی اپنے آپ کو اس گھر سے اور آپ کے وجود سے الگ نہیں سمجھا۔۔۔ آپ کے وجود کا حصہ جانا خود کو۔ بتائیے نا چچا جان! مجھ سے کیا کوتاہی ہوئی۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں میری جان۔" ماسٹر شفیق احمد نے بے اختیار اپنے بازو اس کے گرد حمائل کر دیے۔

"تم سے کوتاہی نہیں ہوئی بیٹا! یوں ہی۔ بس یوں ہی خیال آ گیا تھا کہ شاید تمہارا دل چاہتا ہو' اپنے ننھیالی رشتہ داروں سے ملنے کو۔"

"چچا جان۔" عبداللہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور جب وہ بولا تو اس کا لہجہ بہت نکھرا نکھرا تھا۔

"اگر میرے کوئی ماموں یا خالہ ہیں بھی تو میں نے ان کے متعلق کبھی نہیں سوچا۔ اس لیے کہ انہوں نے کبھی میرے متعلق نہیں سوچا۔ کبھی ان بیس بائیس سالوں میں میری خبر نہیں لی۔ میری خیریت معلوم نہیں کی۔۔۔ اور اگر معلوم کر بھی لیتے تو میرا ان سے اتنا ہی تعلق ہوتا جتنا انعم' کومل اور ثمن کا اپنے ماموں خالہ سے ہے۔ بس کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی۔۔۔ میں تو آپ کا خون ہوں۔ میری جگہ تو یہاں ہی ہے چچا جان آپ کے قدموں میں۔۔۔" اس نے اپنا سر ان کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔

"میری جان! تمہاری جگہ میرے دل میں ہے۔" ماسٹر شفیق احمد نے بے اختیار اپنے ہونٹ اس کے گھنے بالوں والے سر پر رکھ دیے۔

"تم تو میرا بازو ہو' میرا سہارا ہو' میرے جینے کا آسرا ہو۔" بے اختیار امڈ آنے والے آنسوؤں سے ان کا گلا رندھ گیا۔

"چچا جان۔" عبداللہ نے سر اٹھا کر ہولے سے ان کے ہاتھ تھپتھپائے۔

"پتا نہیں آپ کے دل میں یہ خیال کیوں آیا۔ میں نے تو آج تک کبھی امی جان سے یہ تک نہیں پوچھا کہ میرے کتنے ماموں ہیں۔ کتنی خالائیں ہیں۔ کہاں رہتی ہیں۔"

"بیٹا! تمہارے دو ماموں اور دو ہی خالہ ہیں۔ جب بھائی صاحب کی شادی ہوئی تو صرف تمہارے ایک ماموں کی شادی ہوئی تھی تب وہ وہاں قصور میں ہی تھے۔۔۔ بعد کا پتا نہیں۔ کون کہاں ہے۔" زہرہ بیگم نے تفصیل بتائی تو عبداللہ مسکرایا۔

"امی جان! مجھے کچھ جاننے کی چاہ بھی نہیں ہے۔"

"لگتا ہے' بیماری نے تمہارے چچا جان کو۔۔۔"

"کوئی بیمار شیمار نہیں ہوں میں۔ ہاں۔۔۔" شفیق احمد آنسو پونچھ کر مسکرائے اور اپنے ہاتھوں پر رکھے عبداللہ کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا۔

"میں کہتی ہوں ماسٹر صاحب۔" زہرہ بیگم کے لہجے میں شوخی در آئی۔

"آپ ریٹائرمنٹ لے لیجیے۔"

"اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے خاتون کہ میں نے جو نوکری میں توسیع کے لیے درخواست دی تھی' وہ منظور ہو گئی ہے۔"

"بہت خوب۔" عبداللہ کھل کر ہنسا۔

"چچا جان! ابھی دس سال اور نوکری کر سکتے ہیں۔ بالکل فٹ ہیں۔"

"تو اور کیا۔" شفیق احمد نے محبت پاش نظروں سے عبداللہ کو دیکھا اور اپنے پاس بیٹھنے کے لیے کہا۔

"نہیں چچا جان! مجھے یہاں ہی اچھا لگ رہا ہے بیٹھنا۔"

"نہیں بیٹا! ادھر میرے پاس بیٹھو۔" انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا۔ عبداللہ ہنستا ہوا ان کے پاس بیٹھ گیا۔ شفیق احمد اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

"بیٹا! چائے بناؤں تمہارے لیے۔" زہرہ بیگم نے پوچھا۔

"جی امی جان! میں چائے پی کر ذرا عبیر کی طرف جاؤں گا۔ کل فریدہ الیاس نے پیش ہونا ہے عدالت میں۔"

"ہاں اللہ اس بچی کے بھائیوں کو اس سے ملا دے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر نماز کے بعد اس کے لیے دعا کرتی ہوں۔" زہرا بیگم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"امید تو بہت ہے۔"

"اللہ سے ہمیشہ اچھی امید رکھنا چاہیے بیٹا! پھر یتیموں کی آہیں تو عرش ہلا دیتی ہیں۔" انہوں نے جاتے جاتے مڑ کر ماسٹر شفیق احمد کی طرف دیکھا۔

"لگتا ہے' آج ان کو سوچنے کا دورہ پڑا ہے پھر کھو گئے ہیں۔"

"چچا جان! کیا سوچ رہے ہیں آپ۔" زہرا بیگم کے باہر جانے کے بعد عبداللہ نے پوچھا۔

"میں سوچ رہا تھا کہ اب تمہاری شادی بھی ہو جانا چاہیے۔۔۔ کیوں کیا خیال ہے تمہارا؟"

عبیر کا خوبصورت سراپا اس کی آنکھوں میں لہرایا اور ساتھ ہی دل میں ایک ہُوک سی اٹھی۔ درد۔ گہرا اور دل کو چھیلتا ہوا سا محسوس ہوا۔

"تم میرا نصیب نہیں ہو عبیر' پھر کیوں۔۔۔ کیوں تمہارا خیال دل میں یوں بیٹھ گیا ہے کہ کسی بھی لمحہ دل سے نہیں نکلتا اور مجھے لگتا ہے' کسی روز میں بے اختیار ہو کر حالِ دل تم سے کہہ بیٹھوں گا۔ تب۔ تب پتا نہیں کیا ہو گا۔"

اس نے ایک گہری سانس لے کر شفیق احمد کی طرف دیکھا۔

"نہیں چچا جان! ابھی نہیں۔۔۔ ابھی کم از کم دو سال تو مجھے سیٹل ہونے میں لگیں گے یا شاید کچھ زیادہ لیکن دو سال تک تو میں اس موضوع پر سوچنا بھی نہیں چاہتا۔"

"اچھا بیٹا! جیسے تمہاری مرضی۔ یوں ہی سوچا تھا زندگی کا کیا بھروسا۔۔۔ تم لوگوں کی خوشیاں دیکھ لوں۔"

"آپ انشاءاللہ سب کی خوشیاں دیکھیں گے۔" عبداللہ نے انہیں حوصلہ دیا اور پھر ایک بہت گہری نظر ان پر ڈالی۔

"کیا کوئی بات آپ کو پریشان کر رہی ہے چچا جان۔" ماسٹر شفیق احمد کو اس کی نظریں اپنے اندر اترتی ہوئی سی محسوس ہوئیں اور انہوں نے نظریں چرا لیں۔

"نہیں۔۔۔ شاید تمہاری ماں صحیح کہتی ہے کہ میں اس بیماری سے کچھ وہمی اور سنکی ہو گیا ہوں۔"

"حالانکہ یہ کوئی ایسی بیماری نہ تھی اتنی خطرناک کہ۔۔۔ آپ زندگی سے مایوس ہو جائیں۔ آپ ضرور اپنی کوئی پریشانی مجھ سے چھپا رہے ہیں۔"

"زندگی تو بہت بے ثبات سی شے ہے۔ کسی بھی لمحہ یہ جام ٹوٹ سکتا ہے۔ اور تم سے میں کیا چھپاؤں گا بھلا۔ یوں ہی انسانی دماغ میں الٹے سیدھے خیالات آتے رہتے ہیں ورنہ کوئی خاص ایسی بات نہیں۔" عبداللہ کچھ دیر خاموش رہ کر کچھ سوچتا رہا پھر آہستہ لیکن مضبوط آواز میں بولا۔

"چچا جان! میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ کو کیا پریشانی ہے لیکن ایک بات کا یقین رکھیے گا کہ میں اپنی زندگی کا آخری سانس بھی یہاں اس گھر میں لینا چاہوں گا۔"

ماسٹر شفیق احمد کا چہرہ یکدم پر سکون سا ہو گیا اور ابھی انہوں نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ کومل نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

"بھئی جان۔" جب وہ لاؤڈ میں ہوتی تو اسی طرح کہتی۔ "آپ کا فون ہے۔"

وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

"کس کا فون ہے۔"

"آواز تو بڑی خوبصورت ہے۔" اس نے آنکھیں مٹکائیں۔

"تم بہت شریر ہوتی جا رہی ہو چھوٹی۔" عبداللہ نے پیار سے اس کی پونی کھینچی اور ماسٹر شفیق احمد نے بڑے فخر اعتماد اور مان سے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور اپنے اندر ایک گہری طمانیت اترتے محسوس کی اور تکیے سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

☆ ☆ ☆

"اللہ یار ابھی تک سکتے کی سی حالت میں بیٹھا تھا۔ اسے خبر نہیں ہوئی تھی کہ کب چوہدری نیاز کا منشی باہر گیا تھا اور مولوی ہدایت اللہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھے۔ وہ تو مولوی ہدایت اللہ صاحب سے رخصت ہونے اور اجازت لینے آیا تھا۔ دل پھر مضطرب اور بے چین ہو گیا تھا۔ عجیب آگ سی لگی تھی۔ دل چاہتا گریبان چاک کر کے جنگلوں کی طرف نکل

جائے۔۔۔ وہ تو ساری زنجیریں کاٹ کر نکلا تھا پھر پتا نہیں کیسے یہاں زنجیر ہو گیا تھا۔ وہ تو نارسائی اور لاحاصلی کی آگ میں جل رہا تھا۔ دور تک صحرا تھا' سراب تھے اور اس کے پیاسے ہونٹ تھے۔ پیاس سے ابھی بھی اس کے ہونٹ تڑخ رہے تھے پھر پتا نہیں کیوں وہ صحرا میں ڈیرا ڈال کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ چشمہ کہاں تھا جو اسے سیراب کر دیتا۔ وہ تو کسی چشمے کی تلاش میں نکلا تھا۔

مولوی ہدایت اللہ نے ابھی چند لمحے پہلے کیا کہا تھا۔ اس نے سُن ہوتے ذہن کے ساتھ سب کچھ یاد کرنے کی کوشش کی۔۔۔ وہ دستک دے کر اندر آیا تھا۔

مولوی ہدایت اللہ کے پاس کوئی اور بھی تھا۔ چوہدری نیاز کا منشی۔۔۔ وہ اس شخص کو نہیں جانتا تھا اس نے اس سے پہلے کبھی اسے مولوی ہدایت اللہ کے پاس آتے نہیں دیکھا تھا۔

"آؤ۔۔۔ آؤ بیٹا! آجاؤ۔" مولوی ہدایت اللہ جیسے اسے دیکھ کر خوش ہو گئے تھے۔

"منشی جی! یہ ہے اللہ یار۔۔۔ میرا داماد' میرا بھتیجا۔ اسی سے نکاح کیا ہے میں نے اپنی بیٹی کا۔" منشی کچھ متذبذب سا تھا۔

"پر مولوی جی! ہم نے تو کوئی سُن گن نہیں سنی نکاح شکاح کی۔"

"منشی جی! غریب آدمی ہوں۔ کون سا دھوم دھڑکا کیا۔۔۔ بیمار پڑا تو چار آدمی بلا کر اللہ یار سے نکاح کر دیا خدیجہ بیٹی کا۔ بس اب گھر والی کچھ کپڑا لتا تیار کر رہی ہے۔ دو چار روز میں رخصت بھی کر دوں گا۔"

"تم نے جلدی کی مولوی! ورنہ عیش کرتی تمہاری بیٹی۔"

منشی ایک عجیب سی نگاہ اللہ یار پر ڈالتا باہر چلا گیا اور مولوی ہدایت اللہ اپنی جگہ سے اٹھ کر خاموش بیٹھے اللہ یار کے پاس آبیٹھے۔

"یہ منشی تھا۔۔۔ چوہدری نیاز کا۔۔۔ یہ اپنے بیٹے کے لیے خدیجہ کا رشتہ لایا تھا اور اس کا بیٹا۔" مولوی ہدایت اللہ کی آواز بھرا گئی۔

"نشہ باز ہے اور۔۔۔ اور چاروں شرعی عیب ہیں اس میں۔۔۔ مجھے معاف کر دینا بیٹا! میرے پاس اور کوئی راستہ نہ تھا۔"

"آپ انکار کر دیتے مولوی صاحب! اپنی بیٹی کا رشتہ کرنے کے لیے آپ آزاد ہیں۔" اللہ یار کو اپنی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"وہ۔۔۔ وہ چوہدری نیاز کی طرف سے پیغام لایا تھا اور انکار کا مطلب۔۔۔ وہ تو خدیجہ کو اپنے غنڈوں سے اٹھوا لیتا۔۔۔ میں۔۔۔ مجھے کوئی اور راستہ سمجھ میں نہ آیا۔۔۔ بیٹا!۔۔۔ بیٹا! میری عزت بچا لو۔ ابھی اسی وقت خدیجہ سے نکاح کر لو۔"

اور اللہ یار ساکت بیٹھا تھا خاموش۔ وہ تو رخصت لینے آیا تھا۔۔۔ اس نے تو ہر زنجیر کاٹ دی تھی۔ سارے ناتے توڑ دیے تھے۔۔۔ پھر۔

"نہیں۔" وہ کسمسایا۔

"نہیں مولوی صاحب! میں تو۔۔۔"

"بیٹا! انکار نہ کرنا۔" مولوی ہدایت اللہ اٹھ کر اس کے قدموں میں آبیٹھے تھے۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔" اس نے یکدم گھبرا کر انہیں اٹھانے کی کوشش کی تو مولوی ہدایت اللہ نے اس کے پاؤں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

"بیٹا! میرے جھوٹ کو نبھاؤ۔"

"مت کریں۔۔۔ مت کریں ایسا۔" اللہ یار کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔

مولوی ہدایت اللہ اٹھ کر خاموشی سے باہر چلے گئے اور پھر اسی رات حکیم صاحب۔ عبدالقادر کے باپ اور چند دوسرے لوگوں کی موجودگی میں مولوی اللہ یار کا نکاح خدیجہ بنت ہدایت اللہ سے ہو گیا۔

نکاح نامے پر کچھ دن پہلے کی تاریخ ڈال دی گئی۔۔۔ اور رات گئے تھکا تھکا اللہ یار مسجد کے صحن میں آکر بیٹھ گیا۔ اوپر چمکتا آسمان تھا۔ ستاروں سے بھرا۔۔۔ وہ کتنی ہی دیر تک سر اوپر اٹھائے دیکھتا رہا پھر عجیب طرح سے ہنسا۔

"میں زنجیریں کاٹتا ہوں تو ڈال دیتا ہے۔ مولا! سب کچھ تیری مرضی پر چلتا ہے۔ میں نے کہا تھا۔ وہ نہیں تو کوئی نہیں۔ اور جھونپڑی والا بابا سچ کہتا تھا۔ تو کیا اور تیرے فیصلے کیا۔ فیصلہ تو اس کا ہے۔ میں تو تیری دنیا کو تیاگ کر صرف تیرا ہونا چاہتا ہوں پر تو مجھے پھر دنیا میں دھکیل دیتا ہے۔ نہ تو نے مجھے قبول کیا۔ نہ اس نے۔"

وہ اٹھا اور مسجد کے صحن میں ٹہلنے لگا اور ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا تو دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور آنسو خود بخود اس کی آنکھوں میں آگئے۔ پہلے آنکھیں نم ہوئیں اور پھر وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ اور اتنا رویا کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

کتنا عرصہ ہو گیا تھا اس کی آنکھیں خشک صحرا بنی ہوئی تھیں۔ دور دور تک ریت اڑتی تھی جیسے۔ جب رابی سے وہ آخری بار ملا تھا اور رابی چلی گئی تھی ہمیشہ کے لیے۔ اس کا جی چاہا تھا وہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ اپنی محبت کے بچھڑ جانے پر' اس نقصان پر جو ہو گیا تھا لیکن اندر آگ دہک رہی تھی اور دور دور تک کہیں کوئی آنسو نہ تھا اور وہ آگ اسی طرح دہک رہی تھی آج تک۔۔۔ اور اب یہ آنسو۔۔۔ اسے لگا جیسے اس کے جلتے سینے میں ٹھنڈک سی پڑ گئی ہو۔

دیوار سے ٹیک لگائے لگائے اس نے آنکھیں موند لیں۔ ہچکیاں رک بھی گئیں لیکن آنسو

یوں ہی اس کی آنکھوں سے بہتے رہے۔ ہولے ہولے اور پھر وہ یونہی دیوار سے ٹیک لگائے لگائے جانے کب سو گیا۔

صبح جب مولوی ہدایت اللہ مسجد میں آئے تو ان کی اذان کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی۔ وہ خاموشی سے اٹھا وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اور پھر نماز کے بعد بھی بہت دیر یونہی بیٹھا رہا۔ خاموش' مولوی ہدایت اللہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے' بہت خاموشی سے جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ کافی دیر بعد اس نے نظریں اٹھا کر مولوی ہدایت اللہ کی طرف دیکھا۔

"میں بہت شرمندہ ہوں تم سے بیٹے! مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے اپنا مفاد سوچا اور تمہارے متعلق سوچا ہی نہیں۔ نہ تمہارے متعلق کبھی کچھ پوچھا۔

تم پابند ہو شاید۔ میں۔ تم۔ تمہیں خدیجہ کا ساتھ منظور نہیں تو۔ مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔ میں تو جبر کا مرتکب ہو گیا بیٹا! تم چاہو تو۔"

وہ خاموش ہو گئے۔ اپنی زبان سے طلاق کا لفظ نکالنا مشکل ہو گیا۔

"مجھے تمہاری مرضی جانے بغیر یہ فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"فیصلے تو اوپر ہوتے ہیں مولوی صاحب! ہم کیا اور ہمارے فیصلے کیا۔"

اس نے نگاہیں جھکا لیں' مولوی ہدایت اللہ نے ابھی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ منشی نے مسجد کے دروازے کے پاس سے ہی آواز دی۔

"مولوی صاحب چوہدری نیاز نے ڈیرے پر بلایا ہے۔"

مولوی ہدایت اللہ کا رنگ زرد پڑ گیا۔

"کب؟" وہ بولے تو ان کی آواز میں ہلکی کپکپاہٹ تھی۔

"ابھی۔"

منشی دروازے سے ہی پلٹ گیا تو مولوی ہدایت اللہ اٹھے ساتھ ہی اللہ یار بھی کھڑا ہو گیا۔

"میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں مولوی صاحب۔"

مولوی ہدایت اللہ کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو چمکے جنہیں انہوں نے چھپا لیا اور سر جھکا کر آہستگی سے کہا۔

"شکریہ بیٹے۔"

سارا راستہ وہ اپنے آپ سے ہی جھگڑتا رہا۔ نہ اس نے مولوی ہدایت اللہ کی باتوں کی طرف دھیان دیا تھا اور نہ ہی اس نے چودھری نیاز کے ڈیرے پر جا کر آس پاس بیٹھے لوگوں کو دیکھا تھا بس خاموشی سے ایک طرف جا کر بیٹھ گیا تھا۔

"مولوی! سنا ہے تو نے میرے منشی کو اپنی بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ کیا تجھے خبر

نہیں تھی کہ وہ۔ میرا منشی ہے۔ چوہدری نیاز کا۔"

"چوہدری صاحب! میری بیٹی کا نکاح ہو چکا تھا پھر کیسے جی۔"

"کدھر ہے نکاح نامہ اور کون تھے گواہ ذرا بتانا تو۔"

"حکیم صاحب تھے جی۔ رانجھا تھا اور جی۔"

"اوئے نور خان! تو تو کہتا تھا مولوی جھوٹ بولتا ہے۔" چوہدری نیاز نے مولوی ہدایت اللہ کی بات کاٹتے ہوئے منشی کی طرف دیکھا۔ اور حکیم صاحب کو جو ایک طرف بیٹھے تھے' انہیں مخاطب کیا۔

"وہ چوہدری جی! میرا خیال تھا کہ۔"

"چل چپ اوئے! اپنا خیال اپنے پاس رکھ۔" چوہدری نیاز نے اسے ڈانٹا۔ "کیوں حکیم صاحب! مولوی صحیح کہہ رہا ہے؟"

"جی چوہدری جی! میں گواہوں میں تھا۔ لڑکے کی طرف سے۔"

"اب بتا اوئے۔" چوہدری نیاز پھر منشی سے مخاطب ہوئے۔

"وہ جی ابھی رخصتی تو نہیں ہوئی نا۔ مولوی اللہ یار طلاق دے دے۔ وہ جی میرا پُتر کہتا ہے کہ جی وہ ادھر ہی شادی کرے گا۔"

"کیا خیال ہے مولوی تیرا۔؟"

چوہدری نیاز نے پوچھا تو انہوں نے گھبرا کر اللہ یار کی طرف دیکھا۔ اللہ یار کھڑا ہو گیا۔

"اچھا یہ ہے مولوی اللہ یار' تیرا داماد۔ کیوں مولوی! طلاق دو گے؟"

اللہ یار نے نظریں اٹھائیں۔ رات کی مسلسل گریہ زاری اور رت جگے سے آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں۔ اور خوبصورت چہرے سے عجب جلال ٹپکتا تھا۔

"خدا کو جائز کاموں میں سے یہ فعل سب سے زیادہ ناپسند ہے جناب۔"

آواز آہستہ مگر لہجہ مضبوط تھا ایک لمحہ کے لیے تو چوہدری نیاز اس کے چہرے سے نظریں نہ ہٹا سکا۔ پھر منشی کی طرف دیکھا۔

"مولوی کی ایک اور بیٹی بھی تو ہے۔ اس سے کر لے اپنے بیٹے کا رشتہ۔"

"نہیں نہیں۔ وہ تو ابھی صرف سات سال کی ہے چوہدری جی۔" مولوی ہدایت اللہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

"او تو پہلے سویا ہوا تھا؟" چوہدری نیاز نے منشی کو ڈانٹا۔ "اب نکاح شدہ لڑکی کا رشتہ مانگنے چلا ہے۔ کہیں اور دیکھ لے بیٹے کا رشتہ' لیکن رشتہ دینے سے پہلے پوچھ لینا۔ کسی بیاہی بچوں کی ماں کا رشتہ نہ پوچھ بیٹھنا اپنے مہینوال کے لیے۔"

چوہدری نیاز ہنسا یوں جیسے کسی ٹین کے کنستر میں ایک ساتھ بہت سے پتھر لڑھک رہے ہوں۔ اور مولوی ہدایت اللہ کے جسم میں جیسے جان پڑ گئی۔

وہ اللہ یار کے ساتھ جب گھر کی طرف پلٹے تو بہت دنوں بعد انہیں ایسے لگا جیسے جسم میں ایک نئی طاقت عود کر آئی ہو۔

"اللہ یار! ایک رات میں نے تمہیں خدا سے مانگا تھا اپنے لیے اور خدا نے تمہیں مجھے دے دیا۔"

اللہ یار نے بہت شاکی نظروں سے انہیں دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

"کسی کی صرف ایک رات کی دعا مستجاب ہو جاتی ہے اور کوئی سر پٹخ پٹخ کر تھک جاتا ہے۔ دعائیں مانگتے مانگتے اس کا حلق خشک ہو جاتا ہے ہاتھ اٹھے اٹھے تھک جاتے ہیں اور تو اس کے لیے درِ قبولیت نہیں کھولتا۔"

اس نے چلتے چلتے رشک سے مولوی صاحب کو دیکھا جن کی ایک ہی بار کی مانگی دعا قبول ہو گئی تھی۔

"لیکن بیٹا! میں نے اس طرح نہیں سوچا تھا۔ جبر مجبوری اور زبردستی سے۔ میں تو تیری رضا سے تجھے اپنا بنانا چاہتا تھا۔ میں نے تو اپنے مولا سے۔۔۔"

اور مولوی اللہ یار کو چلتے چلتے ٹھوکر لگی اور جب انہوں نے سنبھل کر نظریں اٹھائیں تو جیسے زمین و آسمان کی گردش رک گئی۔ ہر چیز ساکت ہو گئی۔ نگاہیں حویلی کے گیٹ سے اندر جاتی ہستی پر پڑی تھیں۔ دل نے مچل مچل کر اسے آوازیں دی تھیں۔

"رابی۔۔۔! رابی۔۔۔! رابی!" لیکن آواز ہونٹوں سے باہر نہیں نکلی تھی۔

جسے کھوجتے کھوجتے، تلاشتے تلاشتے وہ اس منزل تک آ پہنچا تھا اور وہ ملی بھی تو تب، جب پاؤں میں زنجیریں پڑ گئی تھیں اور ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔

"میرے مولا! تیرے رنگ نیارے ہیں اور تیرے فیصلے، ان کی حکمت تو خود ہی جانتا ہے۔ چاہے تو بھرے سمندر سے پیاسا لے آئے۔ چاہے تو تپتے صحرا میں چھاگل بھر دے۔ چاہے تو دل لبالب بھر دے، چاہے تو خالی کر دے چاہے تو ایک گھونٹ سے عمروں کی پیاس بجھا دے اور چاہے تو سمندروں سے پیاس نہ بجھے۔۔۔ میرے مولا۔"

وہ ہولے سے ہنسا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔

مولوی ہدایت اللہ نے ازحد حیرت سے اسے دیکھا اور گھبرا کر پکارا۔

"اللہ یار۔۔۔! اللہ یار!"

اس کے چہرے کو پانے، دیکھنے کی خواہش میں کتنی زنجیریں کاٹی تھیں اس نے۔۔۔ کتنے دل لہو

کیے تھے۔ اماں جان، ابا جان۔ ہولے ہولے سب چہرے آنکھوں کے سامنے آتے گئے اور پھر عزیز از جان ماموں کی بیٹی۔۔۔ فرح۔۔۔ مستقبل کی ڈاکٹر فرح ناز۔

اور اماں جان کی آرزو۔

اور۔۔۔ اور خدیجہ بنت ہدایت اللہ۔

بار بار چہرے آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔

تراشیدہ لبوں، دلکش قامت اور خوبصورت سی گلابی رنگت والی فرح ناز، اعتماد سے بات کرتی۔ ہنستی ہوئی۔۔۔

اور چادر میں لپٹی گھبرائی سہمی، عام سی شکل و صورت والی سترہ سالہ خدیجہ بنت ہدایت اللہ۔۔۔

وہ یونہی ہنستے ہنستے پتھریلی زمین پر بیٹھ گیا۔

"اللہ یار۔۔۔ اللہ یار۔۔۔! کیا ہوا؟" مولوی ہدایت اللہ بھی ان کے قریب ہی بیٹھ گئے تھے۔

پہلے آنکھیں نم ہوئیں پھر چہرہ آنسوؤں سے تر ہوا اور پھر وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ تڑپنے لگا۔ اور مولوی ہدایت اللہ اسے دونوں بازوؤں کے حلقے میں لیے سینے سے لگائے کہہ رہے تھے۔

"حوصلہ۔۔۔ اللہ یار! حوصلہ کرو۔"

اور وہ ان کے بازوؤں میں تڑپ رہا تھا بلک رہا تھا۔ مچل رہا تھا اور وقفے وقفے سے اس کے منہ سے آوازیں نکل رہی تھیں۔

"اللہ۔۔۔ اللہ۔۔۔"

☼ ☼ ☼

عبیر کے ڈرائنگ روم میں بالکل اس کے مقابل بیٹھا عبداللہ بہت دیر سے خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔

ایک گہری اور طویل خاموشی دونوں کے درمیان تھی۔ ایک چپ تھی جس میں ہزاروں باتیں تھیں، ہزاروں کہانیاں تھیں بعض اوقات خاموشی سے بڑھ کر اور کوئی زبان نہیں ہوتی۔ عبیر گاہے بگاہے نظر اٹھا کر عبداللہ کو دیکھ لیتی تھی۔ وہ اپنے دل کی دھڑکنیں صاف سن رہی تھی، دل پر کسی کو اختیار نہیں ہوتا۔ محبت خود بخود دل کے اندر سے کہیں سے کسی کے لیے پھوٹ پڑتی ہے۔ خود رو پودوں کی طرح۔ پہاڑوں سے خود بخود پھوٹ پڑنے والے چشموں کی طرح۔ عبیر کو بھی خود پر اختیار نہ تھا۔

عبداللہ کے لیے اس کے دل میں تین سال پہلے محبت کی جو کونپل پھوٹی تھی۔ وہ تناور درخت بن چکی تھی۔ نظروں نے بارہا ایک دوسرے کو محبت کے پیغام دیے تھے لیکن ہونٹوں نے ابھی

اظہار کو معنی نہیں پہنائے تھے کہ ایک کمزور لمحے نے بے اختیار اسے عیاں کر دیا تھا اور اب وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"**عبیر**!" بڑی دیر بعد عبداللہ نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کے لب بھینچے ہوئے تھے اور آنکھوں میں ہلکی سرخی تھی جیسے وہ ضبط کی انتہائی منزلوں سے گزر رہا ہو۔

"اور میں اسی لمحے سے ڈرتا تھا کہ یہ لمحہ جب میری زندگی میں آیا تو میں اس کا کیسے سامنا کروں گا۔" اس کی آواز بھاری اور جذبات کی شدت سے بوجھل ہو رہی تھی۔

"شاید میں راکھ ہو جاؤں' شاید میرا اپنا آپ باقی نہ رہے۔ **عبیر**! تم ــــ تمہاری تو صرف تمنا کرنا ہی اعزاز ہے اور یہ اعزاز میں کب سے لیے پھر رہا تھا۔ اس تمنا کو تم سے ــــ سب سے چھپائے کہ تمہیں پانا تو آسمان کے ستاروں کو چھو لینا ہے اور میں جانتا ہوں ستارے انسانوں کی دسترس سے بہت دور ہوتے ہیں ــــ لیکن دل پر تو کسی کا اختیار نہیں ہوتا نا **عبیر**! جو ستاروں کو مٹھی میں بھر لینے کی چاہ کرتا ہے۔ میں نے بھی ستاروں کو مٹھی میں بھرنے کی چاہ کی تھی اور اس چاہ کو تم سے چھپا نہیں سکا۔ اب ایک لٹا پٹا دہقان ہوں۔ مجھے میرے دل کی کڑی عدالت میں پیش ہونا ہے اور مجھے جو سزا ہو گی' اس سے بہت خوفزدہ ہوں۔ راستوں کی کٹھنائیوں سے آگاہ ہونے کے باوجود **عبیر** میں نے ہاں میں نے ــــ" وہ بات کرتے کرتے خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھیں کسی انجانی آگ سے دہک رہی تھیں۔ اندر نارسائی پنجے گاڑے بیٹھی تھی۔

"عبداللہ!" **عبیر** نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

یہ وہ شخص تھا جس کے ساتھ ہمیشہ رہنے کی ہر آن دل نے چاہ کی تھی۔

"تم اپنی محبت پر شرمندہ ہو؟"

"نہیں۔" عبداللہ نے تڑپ کر **عبیر** کو دیکھا۔

"محبت شرمندگی نہیں ہوتی' اعزاز ہوتی ہے۔ فخر ہوتی ہے ــــ مان ہوتی ہے۔ میں صرف اس لمحے سے خوفزدہ ہوں جب یہ تمہاری جھولی نارسائی کے کانٹوں سے بھر دے گی ــــ میں صرف تمہارے دکھ سے خوف کھا رہا ہوں ــــ میں نے آج تک اپنے جذبوں کو اس لیے بھی خود سے چھپائے رکھا کہ اگر کچھ کہہ بیٹھا تو تمہارے راستے کھوٹے کر دوں گا۔"

"یہ تم نے کیسے سوچا عبداللہ! میرا تو ہر راستہ تمہاری طرف ہی جاتا ہے۔"

"مگر **عبیر**! میرا اور تمہارا سوشل اسٹیٹس ــ میں ایک غریب ماسٹر کا بیٹا اور تم مل اونر اور بڑے جاگیردار کی اکلوتی بیٹی ــــ ہمارے راستے کبھی ایک نہیں ہو سکتے **عبیر**! یہ تم نے کیا کیا ــــ خود بھی ضبط کھو بیٹھیں اور مجھے بھی عیاں کر دیا۔" عبداللہ کی آنکھوں میں اداسی کا غبار سا پھیل گیا

تھا۔

"نہیں۔ نہیں عبداللہ ــــ! ایسا نہیں ہے۔ ہمارے راستے ہمیشہ سے ایک ہیں۔ ایک ہی رہیں گے انشاءاللہ۔" **عبیر** نے بڑے یقین سے کہا۔

اسے یقین تھا کہ اس کے بابا جان اس سے اتنی محبت کرتے ہیں اور وہ اس کی کوئی بات نہیں ٹالتے کبھی بھی۔ اور یہ تو زندگی اور موت کا مسئلہ تھا پھر بھلا بابا جان کیوں چاہیں گے کہ وہ موت کے سفر پر گامزن ہو اور اس نے اپنا یقین عبداللہ کے دل میں بھی اتار دیا' اور عبداللہ کو لگا جیسے اس وقت روئے زمین پر شاید اس سے زیادہ خوش نصیب کوئی نہیں ہو گا۔

"**عبیر**!"

وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ مامون' دانیال' صدف شور مچاتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

"یہ حضرت پہلے سے ہی یہاں بیٹھے ہیں اور ہم خوامخواہ اسے پک کرنے کے لیے خوار ہوتے رہے۔" دانیال نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مگر تم نے کل شام اس طرح کی کوئی بات تو نہیں کی تھی کہ تم مجھے پک کر لو گے۔" عبداللہ نے اپنے پہلے آنے کا جواز دیا۔

"یوں بھی میں گھر سے نکلا ہوا تھا ــــ فریدہ کی طرف جانا تھا مجھے ــــ سو ادھر سے ہی ادھر آ گیا۔"

"کیسی ہے وہ ــــ سیٹ ہو گئی اپنے گھر میں؟" صدف نے پوچھا۔

"ہاں' بہت خوش ہے۔ اس نے دور کی ایک عزیزہ کو اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ جو بیوہ ہیں۔ وہ ہم سب کی دعوت کرنا چاہ رہی تھی لیکن میں نے منع کر دیا۔ مجھے مناسب نہیں لگا۔"

"ہاں تم نے صحیح کیا۔" صدف نے کہا اور **عبیر** کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"یار! مجھے تو اس کیس کی کامیابی کی خوشی میں کئی روز سے نیند ہی نہیں آ رہی۔" مامون نے بھی عبداللہ کے قریب پڑ ہوئے کہا۔

"سلیپنگ پلز لیا کرو۔" صدف نے مشورہ دیا۔

عبیر کولڈ ڈرنکس منگوانے کے لیے اٹھ گئی۔

فریدہ الیاس کے کیس کی کامیابی کی خوشی میں آج **عبیر** نے سب کی دعوت کی تھی۔ سو وہ آج سب یہاں جمع تھے۔ وہ سب ہی اس کیس کے سلسلے میں بہت ایکسائیٹڈ ہو رہے تھے اور درحقیقت سب نے ہی محنت کی تھی۔

"ویسے یار! وہ فریدہ الیاس کا ماموں تھا بڑا کائیاں۔ مجھے اُمید نہیں تھی کہ وہ بچوں کے سلسلے میں مان جائے گا۔ بس یہ تو محض اتفاق ہی تھا کہ وہ ہوٹل والا اس وقت آ گیا جب میں اس کے

پاس بیٹھا تھا اس کی گھبراہٹ سے ہی میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے اور جب اس نے کہا جو بچے آپ نے ملازم رکھوائے تھے ان میں سے ایک بیمار ہے صاحب۔" دانیال نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں! تمہیں تو پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ہونا چاہیے تھا۔ خوامخواہ وکیل بن گئے۔" صدف نے لقمہ دیا۔

"یار! یہ میرا خاندانی پیشہ ہے۔ میں اسے کیسے چھوڑ سکتا تھا۔"

"تو خاندانی وکیل صاحب! آپ کب دعوت دے رہے ہیں۔" مامون نے پوچھا۔

"جب کہیں، بندہ حاضر ہے۔"

یہ حقیقت تھی کہ وہ سب ہی بہت خوش تھے نہ صرف یہ کہ فریدہ کے دونوں چھوٹے بھائیوں کا پتا چل گیا تھا بلکہ اس کا گھر بھی اسے مل گیا تھا۔ بہت کچھ نہیں بھی ملا تھا۔ نقد رقم، زیورات۔ لیکن جو مل گیا وہ بھی غنیمت تھا۔ شقی القلب آدمی نے اپنے سگے بھانجوں کو کسی ہوٹل پر ملازم رکھوا دیا تھا۔۔۔ ایک ہی دن لاک اپ میں رہنے کے بعد اس نے سب اگل دیا تھا۔ سو یہ مقدمہ ان کی توقع سے بہت پہلے ختم ہو گیا تھا۔

"یقین نہیں آتا نا عبیر! کہ لوگ اتنے ظالم بھی ہو سکتے ہیں۔" صدف نے عبیر کے واپس آنے کے بعد کہا۔

"بی بی! اس سے بھی زیادہ ظالم ہوتے ہیں لوگ۔ تم رہتی کس دنیا میں ہو۔ یہ وڈیرے، جاگیرداران کے ڈرامے وغیرہ نہیں دیکھتی ہو۔" مامون نے جان بوجھ کر عبیر کو چھیڑا۔

"اب یہ اپنی عبیر ہی کو دیکھ لو۔ اس نے اپنی آنکھوں سے ظلم کی کئی کہانیاں دیکھی ہوں گی۔ کیوں عبیر۔۔۔؟"

"میرے بابا جان ایسے نہیں ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی پر زیادتی نہیں کی۔" عبیر نے احتجاج کیا۔ "اور اب وہ دور بھی نہیں رہا جاگیرداروں کے ظلم و ستم کا۔"

"یار! کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ سندھ میں، پنجاب میں سب کچھ ویسا ہی ہے۔ ساری خرابی سسٹم میں ہے۔ وڈیرا آج بھی وہی ظلم کر رہا ہے۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ اخبار دیکھا تم نے آج کا۔" مامون نے سینٹر ٹیبل سے اخبار اٹھایا۔

"اور یہ خبر۔۔۔ پڑھی، یہ خبر۔" اس نے اخبار کھول کر عبیر کو دکھایا۔

"ملتان کے ایک نواحی گاؤں میں ایک بڑے زمیندار نے ایک غریب مزارعے کی کسی بات پر خفا ہو کر اس کے خاندان کی تمام عورتوں کو پورے گاؤں کے بازاروں میں ننگا کر کے گھمایا۔"

مامون کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"قصوروار مزارعہ تھا یا اس کے خاندان کی عورتیں۔ اسے قتل کروایا ہوتا بلکہ کروا دیا ہو گا پھر یہ کیسا انتقام ہے۔۔۔؟ اس اسلامی ریاست میں ایسا کرنے والوں کے خلاف کیا قانون ہے؟ کیا سزا ہے؟۔ گھٹنوں میں منہ دیئے دوپٹوں اور چادروں سے چہروں کو چھپائے چند عورتوں کی تصاویر چھاپ کر فرض ادا ہو گیا ہے کیا؟ چند دن اخباروں میں واویلا ہو گا اور پھر سب ختم۔ پولیس کی جیب گرم ہو جائے گی۔"

سب کے مسکراتے چہرے بجھ سے گئے تھے۔ ملازم کولڈ ڈرنکس سرو کر رہا تھا عبیر کی نظر اچانک ہی عبداللہ پر پڑی تھی۔

اس نے مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں اور آنکھیں یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی ان سے خون ٹپک پڑے گا۔ سختی سے دانتوں پر دانت جمائے وہ ضبط کی انتہائی منزلوں سے گزر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور اعصاب پر کوڑے برس رہے تھے۔

"عبداللہ! کیا ہوا؟"

عبیر نے گھبرا کر پوچھا تو وہ جیسے کسی گہرے خواب سے بیدار ہوا۔ اس نے چونک کر سب کی طرف دیکھا۔ ہولے ہولے بند مٹھیاں کھولیں اور سر جھٹکا۔

"نہیں کچھ نہیں۔" ملازم لڑکے کے ہاتھ سے کولڈ ڈرنک کا گلاس لے لیا۔

اس نے خود کو کمپوز کرنے کی شعوری کوشش کی لیکن اندر ایک دم وحشت اتر آئی تھی۔

ملتان کے کسی نواحی گاؤں میں جن عورتوں کی بے حرمتی ہوئی تھی، وہ کون تھیں۔ وہ نہیں جانتا تھا لیکن اس کا سینہ جل رہا تھا۔ ایک انجانی سی آگ جیسے اس کے پورے وجود کو کھائے جا رہی تھی۔ وہ سب ہنس رہے تھے۔ ایک دوسرے کو چھیڑ رہے تھے لیکن عبداللہ کا دھیان بار بار اس نواحی گاؤں کی ان عورتوں کی طرف چلا جاتا تھا۔

اتنی ذلت۔۔۔ اتنی بدنامی کے بعد کیسے جئیں گی وہ۔۔۔

شاید انہوں نے خودکشی کر لی ہو۔

یا اگر وہ زندہ بھی ہوئیں تو زندگی ان کے لیے تہمت بن جائے گی۔ کیا کبھی وہ خود سے نظر ملا سکیں گی۔

اور کیا ان کے خاندان کے مرد کبھی گھر سے باہر نکل سکیں گے اور کیا ؟

"یار عبداللہ!" مامون نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونکا۔

"وہ ملک صاحب تمہاری بہت تعریف کر رہے تھے کہہ رہے تھے کہ پتا نہیں کیا بات ہے۔ عبداللہ بہت اپنا اپنا سا لگتا ہے، دل میں اس کے لیے خود بخود ایک محبت سی پیدا ہو گئی ہے۔ کل تم چیمبر نہیں آئے تھے تو کتنی ہی بار انہوں نے تمہارا پوچھا۔ یار! ایک ہم ہیں کہ دس دن بھی

نہ آئیں تو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ اور دانیال اور صدف کو دیکھا۔

"حتیٰ کہ یہ دونوں بھی نہیں۔"

"نہیں خیر' ایسی بات بھی نہیں ہے۔" دانیال کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ "ہم ایک آدھ بار تو تمہیں یاد کر ہی لیں گے کیوں صدف؟"

"ہاں جب دانی کے ہاتھوں میں کھجلی ہوگی اور اسے اپنے مکّے کی طاقت آزمانا ہوگی اور جب دانی کی جیب خالی ہوگی اور اسے کے۔ ایف۔ سی جانا ہوگا۔"

"جانتا ہوں۔۔۔ جانتا ہوں میں تم سب کو' اتنی ہی قدر ہے تمہارے دل میں میری۔۔۔" اس نے مزید مظلوم ہونے کی ایکٹنگ کی۔ "ویسے یار! عبداللہ تم ہو بڑے لکی۔"

"مثلاً" "کس طرح؟" عبداللہ کی ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ آکر معدوم ہوگئی۔

"مثلاً" یہ کہ ملک صاحب تمہیں چاہتے ہیں۔ دانی ہے' صدف میں اور۔۔۔ اور عبیر۔۔۔ ایک بے چارہ میں۔۔۔"

"زیادہ بے چارے نہ بنو۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ نہیں تمہیں چاہتی ہے اتنا زیادہ۔۔۔"

"ہائے کون؟" مامون نے دل پر ہاتھ رکھا۔

"وہ ہی۔۔۔ وہ نسرین۔" صدف نے نچلے ہونٹ کا دایاں کونا دانتوں تلے چبا کر بے حد شرارت سے اسے دیکھا۔

"کون۔۔۔ کون۔۔۔ نسرین؟" مامون نے بہت اشتیاق سے پوچھا۔

"ہائے بے چاری سارا دن تو کھڑی تمہیں دیکھتی ہے اور تمہیں خبر ہی نہیں۔" دانیال قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"یار وہی۔۔۔ جس نے کل شام تمہاری بلائیں لی تھیں۔"

"مائی گاڈ۔۔۔" مامون نے غصے سے اپنے بال نوچے۔

"اب یہ رہ گئی ہے میری اوقات۔"

عبیر اور عبداللہ بھی ہنس رہے تھے۔ ملک صاحب کے چیمبر کے سامنے والے فلیٹس میں سے ایک میں تیسری جنس کے لوگ رہتے تھے اور اکثر شام کو بن سنور کر بالکونی میں کھڑے رہتے تھے۔ ایک بار جب مامون چیمبر سے باہر آرہا تھا تو ان میں سے ایک نے مامون کی بلائیں لی تھیں۔

"ہائے میں صدقے جاؤں۔ کچھ ہم غریبوں کو بھی دے دلا جاؤ۔ ہمارا تو کاروبار ہی ٹھپ ہوگیا ہے۔ آج کل بہت مندا ہے۔ جب سے یہ ڈش اور کیبل لگی ہے' ہم تو بھوکوں مر رہے ہیں کچھ

اپنی جان کا صدقہ ہم کو بھی دے جاؤ۔"

اور مامون نے پچاس کا نوٹ نکال کر اسے دے دیا۔ اور تب سے سب نے مامون کی چڑ بنالی تھی اور وہ سچ مچ چڑنے لگا تھا۔ جب سے مامون نے اسے پچاس کا نوٹ دیا تھا' وہ کبھی کبھار جب فارغ ہوتے تو دس پندرہ منٹ کو وہ چیمبر آتی تھی اور اس نے اپنا نام نسرین بتایا تھا۔۔۔ مامون تو بھڑک اٹھتا تھا۔ مصیبت بن گیا تھا۔

"تو نسرین نام ہے اس کا۔" مامون نے دانت کچکچائے۔

"ہاں۔۔۔ کچھ اور معلومات بھی چاہیں تو مل سکتی ہیں۔" دانیال ابھی بھی شرارت پر آمادہ تھا۔

"فار گاڈ سیک! میرا اچھا خاصا موڈ غارت نہ کرو۔" مامون نے ہاتھ جوڑ دیئے تو عبداللہ نے دانیال کو منع کیا کہ وہ اب مزید تنگ نہ کرے اسے اور موضوع بدلنے کے لیے صدف سے پوچھا۔

"تم نے پھر بتایا نہیں کہ کرن کی شادی کی کیا تاریخ طے ہوئی ہے۔"

"تاریخ ابھی طے نہیں ہوسکی۔" صدف تھوڑی افسردہ ہوگئی۔

"کیوں تم تو کہہ رہی تھیں اس روز کہ کرن کے سسرال والوں نے آنا ہے تاریخ طے کرنے۔"

"ہاں لیکن۔۔۔" وہ چپ کر گئی۔

"کوئی پرابلم؟" دانیال نے پوچھا۔

"کوئی خاص نہیں۔" وہ زبردستی مسکرائی۔ "کچھ مطالبات ہیں ان کے جو فی الحال ہم پورے نہیں کرسکتے۔ سو فی الحال شادی ملتوی ہوگئی ہے۔"

"تو اتنے لالچی لوگ ہیں کرن کے سسرال والے۔" مامون کو افسوس ہوا۔

"ہاں۔"

"تو تم لوگ ایسے لالچی لوگوں کو کرن کا رشتہ ہی مت دو۔۔۔" دانیال نے غصے سے کہا۔

"اچھے رشتے آسانی سے نہیں ملا کرتے دانی! تم لڑکے ہو تم اس عذاب کو نہیں سمجھ سکتے۔"

"کیا کرتے ہیں موصوف؟"

"واپڈا میں ملازم ہیں۔"

"میں سمجھتا تھا کہ ہمارے ملک میں ایسا نہیں ہوتا۔ لیکن۔۔۔" عبداللہ نے آہستگی سے کہا۔

"سب تو نہیں لیکن تھرٹی پرسنٹ تو ایسے ہوتے ہوں گے نا جو اپنے لڑکوں کو کیش کرواتے ہیں۔ بلینک چیک سمجھتے ہیں اپنے بیٹوں کو۔" صدف کے لہجے میں تلخی تھی۔

عبیر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ملازم لڑکے نے اندر آکر چوہدری امتیاز خان کے فون کی اطلاع دی۔

"کارڈلیس دو مجھے۔" عبیر نے کہا۔

"کیا بابا جان گھر پر نہیں ہیں؟" صدف نے پوچھا۔

"نہیں وہ گاؤں گئے ہوئے ہیں۔" عبیر نے بتایا۔

"انہیں اچانک جانا پڑا اور انہوں نے معذرت کی تھی کہ وہ آپ لوگوں کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہو سکے۔" بات مکمل کر کے اس نے ملازم کے ہاتھ سے کارڈلیس لیا اور بات کرنے لگی۔

☆ ☆ ☆

انعم ہولے ہولے گنگناتے ہوئے عبداللہ کے کپڑے استری کر رہی تھی۔ پاس ہی دُھلے کپڑوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ آج اتوار تھا اور انعم ناشتے سے فارغ ہو کر کپڑے استری کرنے بیٹھ گئی تھی۔ اس کی عادت تھی کہ چھٹی والے روز وہ سب دھلے کپڑے استری کر دیتی تھی۔ سو آج بھی جب سب ناشتہ کر کے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تو وہ کپڑے استری کرنے لگی تھی۔ پاس ہی کومل بیٹھی اپنا ہوم ورک کر رہی تھی۔

"اجنبی کیوں یاد آتے ہو۔"

انعم اپنے دھیان میں گنگنا رہی تھی کہ کومل نے اسے بلایا۔

"آپی! آپ کی آواز اچھی ہے اور آپ گاتی بھی اچھا ہیں۔"

"اچھا۔" انعم مسکرا دی۔

"او، وہ جو عبیر ملک ہیں' ان کی آواز بھی بہت خوبصورت ہے اور فون پر تو اتنی پیاری لگتی ہے کہ جی چاہتا ہے سنتے جائیں۔"

"اچھا تو کیا تم سے فون پر بھی گفتگو ہوتی ہے۔" انعم نے پوچھا۔

"نہیں تو فون پر بھلا کہاں گفتگو ہوتی ہے؟ وہ تو بس دو تین بار ان کا فون آیا تھا عبداللہ بھائی کے لیے تو میں نے اٹینڈ کیا تھا۔۔۔ اور تب تو مجھے پتا بھی نہیں تھا کہ وہ عبیر ملک ہیں وہ تو رات کو انہوں نے خود ہی پوچھا تھا کہ وہ جو فون پر کہتی ہے۔ آپ ہولڈ کریں بھئی جان ابھی آتے ہیں وہ تم ہی ہو تو مجھے پتا چلا تھا اور پتا ہے آپی۔۔۔"

اس نے قلم کتاب کے اندر رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"عبیر ملک بہت خوبصورت ہیں۔ اتنی خوبصورت کہ بس انہیں دیکھتے رہو۔ حالانکہ انہوں نے میک اپ بھی نہیں کیا ہوا تھا پھر بھی ان میں ایک عجب طرح کی بیوٹی تھی۔ آسمانی کلر کے

سادا سے کاٹن کے سوٹ میں یہ عالم تھا کہ جو نگاہ ایک بار ان کی طرف اٹھتی تھی ٹھہری جاتی تھی۔"

انعم اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ کل رات سے لے کر اب تک وہ تقریباً سولہ مرتبہ عبیر کی خوبصورتی' اس کے حسن اور اس کی گفتگو کی تعریف کر چکی تھی۔ دراصل کل سیٹرڈے تھا اور عبداللہ کو چیمبر نہیں جانا تھا سو زہرا بیگم نے عبداللہ سے کہا تھا کہ وہ کومل کو اس کی فرینڈ ثنا کے گھر چھوڑ دے اور واپسی پر پک بھی کر لے۔

کومل کئی دنوں سے ان کے پیچھے پڑی ہوئی تھی کہ اسے اپنی فرینڈ کی بہن کی منگنی کے فنکشن میں شرکت کی اجازت دی جائے۔ مسئلہ صرف چھوڑنے اور لانے کا تھا۔ شفیق احمد کی طبیعت ابھی مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہوئی تھی وہ اسکول سے آکر زیادہ تر اپنے کمرے میں لیٹے آرام ہی کرتے تھے۔ اس کا پھولا منہ دیکھ کر عبداللہ نے یہ ذمہ داری سنبھالی تھی اور وہاں ہی ثنا کے گھر کے گیٹ کے پاس عبداللہ اور کومل کی ملاقات عبیر سے ہوئی تھی۔ ندا دراصل اس کی کالج فیلو تھی اور لاء میں داخلہ لینے سے پہلے دونوں میں کافی دوستی تھی۔ سو عبیر بھی اس فنکشن میں شرکت کرنے کے لیے آئی تھی۔

عبداللہ نے کومل کا تعارف اس سے کروایا تھا اور پھر عبیر کو وہ اتنی اچھی لگی تھی کہ وہ سارا وقت اسی کے ساتھ چپکی رہی تھی اور اس کی ایک ایک بات وہ کتنی ہی بار ثمن اور انعم کو بتا چکی تھی۔

"پتا ہے آپی! میں نے عبیر ملک سے کہا تھا کہ وہ کسی روز ہمارے گھر آئیں تو انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ آئیں گی کسی روز۔ آپ سب سے ملنے۔ آپ پہلے کبھی نہیں ملیں ان سے۔"

"بس اتفاق ہی نہیں ہوا۔" انعم نے عبداللہ کی شرٹ استری کرتے ہوئے جواب دیا۔

"اب آئیں گی تو مل لیں گے تمہاری عبیر ملک سے۔"

"وہ عبداللہ بھائی کی کولیگ ہیں' وکیل ہیں۔ چیمبر میں ان کے ساتھ ہی بیٹھتی ہیں۔" اس نے گویا ایک اور اطلاع فراہم کی اور انعم پھر مسکرا کر کپڑے تہہ کرنے لگی۔

"لگتا ہے۔ تم زیادہ ہی متاثر ہو گئی ہو۔" انعم نے کپڑوں کے ڈھیر سے اپنی شرٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کون کس سے متاثر ہو گیا ہے بھئی!"

عبداللہ نے اپنے کمرے سے باہر آتے ہوئے پوچھا تو انعم نے یکدم مڑ کر عبداللہ کو دیکھا۔ وہ آستینوں کو فولڈ کرتا ہوا کومل کے پاس ہی تخت پر آکر بیٹھ گیا۔

"عبیر ملک سے اپنی کومل بہت متاثر ہو گئی ہے۔ کل سے ان ہی کی تعریف ہو رہی ہے۔"
انعم نے بتایا تو عبداللہ نے ہولے سے کومل کے بال کھینچے۔

"کیوں چھوٹی! کہیں عبیر نے تعریف کرنے کے لیے کوئی رشوت تو نہیں دی۔"

"جی نہیں۔" کومل نے فوراً کہا۔ "وہ ہیں ہی تعریف کے قابل۔"

"ضرور عبیر نے تمہیں کوئی رشوت دی ہے۔" عبداللہ نے اسے چھیڑا۔

"جی نہیں۔ کوئی رشوت وشوت نہیں دی۔ آپ سچ بتائیں کیا وہ پیاری نہیں ہیں۔ کوئی ہے ان جیسا پیارا۔

"یہ میری کیوٹ سی بہن ہے پیاری پیاری سی۔"

"نہیں سچ بتائیں نا۔" وہ ٹھنکی ۔ "کبھی آپ نے ان سے زیادہ خوبصورت لڑکی دیکھی ہے۔

"دیکھی ہے۔" عبداللہ بہت خوشگوار موڈ میں تھا۔ انعم بظاہر کپڑے استری کر رہی تھی لیکن اس کا سارا دھیان دونوں کی طرف تھا۔

"کون؟" کومل نے بے حد اشتیاق سے پوچھا۔

"ہماری چھوٹی۔" عبداللہ نے پھر پیار سے اس کے بالوں کی لٹ کھینچی۔

"نہیں میرے علاوہ۔" کومل نے کاپی بند کر کے گھٹنوں کے نیچے رکھ لی تھی اور پوری طرح عبداللہ کی طرف متوجہ تھی۔

"یہ تو سوچنا پڑے گا۔" عبداللہ نے پرخیال انداز میں سر ہلایا۔

اس میں سوچنے والی کیا بات ہے۔ بھئی! ان عبیر ملک سے زیادہ خوبصورت کوئی ہو ہی نہیں سکتا اور پتا ہے' جب آپ گیٹ پر عبیر باجی کے ساتھ کھڑے تھے تو آپ دونوں ساتھ ساتھ کھڑے اتنے اچھے لگ رہے تھے کہ میں نے فوراً ہی سوچ لیا تھا کہ میں تو بس عبیر باجی کو ہی اپنی بھابھی بناؤں گی۔۔۔ آپ بتائیں نا عبیر ملک کیسی لگتی ہیں آپ کو۔"

عبداللہ نے سٹپٹا کر انعم کی طرف دیکھا۔ جس کا دل اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر ابھرا تھا۔ اور اس نے بھی یکدم ہی نگاہ اٹھا کر عبداللہ کو دیکھا تھا اور پھر نگاہیں جھکا کر استری کرنے لگی تھی۔ مگر دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ یوں جیسے ڈوب ڈوب کر ابھر رہا ہو۔

"بھلا کومل کو کیا خبر۔" اس نے گویا دل کو تسلی دی اور اپنی تمام تر سماعتیں عبداللہ کے جواب کی طرف لگا دیں۔

"یہ تم نے میری شادی کا شعبہ کب سے سنبھال لیا' یہ تو امی جان کا ڈیپارٹمنٹ ہے۔" دل کی چور دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے عبداللہ نے کومل سے پوچھا۔

اندر ایک شور مچ گیا تھا۔ کومل کی ذرا سی بات سے جلترنگ بج اٹھے تھے اور ہونٹوں پر خود بخود ایک شوخ سی مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی تھی اور جب میں عبیر کو بتاؤں گا کومل کی بات تو۔ عبیر کا گلابی ہوتا چہرہ اس کے تصور میں آ گیا اور اس کی دلکش آنکھوں کی سنہری چمک کے خیال سے اس کے ہونٹوں پر ٹھہری مسکراہٹ اور گہری ہو گئی تھی۔

"ہے تو امی جان کا ہی ڈیپارٹمنٹ لیکن وہ کب گھر سے اتنا نکلتی ہیں۔ لڑکیاں تو ہم ہی آپ کے لیے دیکھیں گے نا! میں انعم آپی اور ثمو باجی۔ بس آپ بتائیں آپ کو عبیر باجی پسند ہیں

"بھئی! ہماری بہن کی پسند' ہماری پسند۔" عبداللہ کے اندر خوشی کے عجب سے رنگ بکھر گئے تھے۔ یوں جیسے اندر کوئی دھنک کے سارے رنگ بکھیرے دے رہا ہو۔ خوشی نے اس سے پہلے کبھی اس کے اندر اس طرح رنگ نہیں کھیلے تھے۔

"ہماری بہنا کو اگر بھنگن بھی پسند آ جائے گی تو ہم اس کی خوشی میں خوش۔" وہ ترنگ سے بولا۔

"بھنگن کیوں پسند کروں گی بھلا میں۔ میرے بھائی جان اتنے خوبصورت ہیں تو ان کی بیوی بھی ایسی ہی ہونی چاہیے نا۔ خوبصورت سی بالکل عبیر ملک جیسی ہے نا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" سارے جہاں کی خوشی اس کے لہجے میں اتر آئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس نے اپنی محبت کو پا لیا ہے' اس نے تصور میں عبیر کو اپنے سنگ کھڑے دیکھا اور بھرپور انداز میں مسکرایا۔

اور انعم کو لگا جیسے اب کی بار جو اس کا دل ڈوبے گا تو ابھر نہیں پائے گا اور یہ بے وقوف کومل۔ اس نے اسے تنبیہہ کرنا چاہی تو آنکھیں دھندلی ہو گئیں اور سوئچ آف کرتے ہوئے وہ تیزی سے مڑی اور عبداللہ کی نظر اچانک ہی اس پر پڑی۔ نم آنکھیں۔ لرزتے ہونٹ۔

"یہ۔۔۔ یہ انعم کو کیا ہوا۔ شاید اچانک طبیعت خراب ہو گئی ہے۔" اس نے سوچا اور آواز دی۔

"انو۔۔۔ انو!"

لیکن انعم تیزی سے اپنے کمرے میں گھس گئی۔ اسے لگا جیسے اگر اس نے مڑ کر دیکھا تو خود پر اختیار کھو بیٹھے گی۔ ابھی چند دنوں کی ہی تو بات تھی جب اس نے دل کے اندر عبداللہ کا سراپا سجایا تھا۔

"عبداللہ میرا ہے۔۔۔ میرا ہم سفر۔"

ابا جان نے کہا تھا۔

"زہرا بیگم! تمہیں انو کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے بہت پہلے میں

عبداللہ کا انتخاب کر چکا ہوں۔"

"یہ کومل تو بے وقوف ہے۔ یونہی الٹی سیدھی منہ میں آتا ہے کہہ دیتی ہے لیکن عبداللہ ـــــ"

عبداللہ کی آنکھوں کی چمک' وہ شوخ مسکراہٹ' وہ لہجہ' میں خوشی کی کھنک۔ وہ تو زیادہ تر سنجیدہ رہتا تھا ایسے رنگ تو اس نے کبھی اس کے چہرے پر نہیں دیکھے تھے گو وہ بہنوں کے ساتھ ہنستا بولتا شرارتیں بھی کرتا تھا لیکن۔۔۔

اور کیا خبر وہ بھی عبیر ملک کو پسند کرتا ہو۔ دل کے اندر جیسے کسی نے سوئی چبھوئی ہو۔ اس کی نئی نویلی محبت جس نے ابھی اس کے دل میں ہولے سے چٹک کر ہنسی بکھیری تھی۔ جیسے کسی نے اس کلی کو مسل دیا ہو۔

وہ اپنے بیڈ پر بیٹھ کر رونے لگی۔ ہولے ہولے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے۔

ابھی تو اس کلی کے ہونٹوں پر پہلی مسکان آئی تھی۔ ابھی تو وہ اس جذبے کی خوبصورتی کو محسوس ہی کر رہی تھی۔ ابھی تو دل نے دھڑکنا سیکھا تھا اور اس کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔

باہر عبداللہ نے حیرانی سے کومل سے پوچھا۔

"یہ۔ یہ ایک دم انعم کو کیا ہوا۔ کیا طبیعت خراب تھی۔"

"نہیں تو۔۔۔" کومل نے نفی میں سر ہلایا۔

"اچانک کوئی کام یاد آ گیا ہو گا۔ ورنہ ابھی تو ٹھیک ٹھاک باتیں کر رہی تھیں' بلکہ انہیں بھی بہت اشتیاق ہو رہا تھا عبیر باجی سے ملنے کا۔

"اچھا۔۔۔!"

عبداللہ کچھ الجھ سا گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے محسوس ہوا تھا جیسے اس کی آنکھیں نم ہوں اور آنسو امنڈنا ہی چاہتے ہوں۔"

"آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ شاید طبیعت خراب ہو گی۔ کومل تو بچی ہے۔ ابھی جا کر پوچھتا ہوں۔ یا پھر ممکن ہے کوئی یونیورسٹی کا مسئلہ ہو۔" عبداللہ تھوڑا سا پریشان ہو گیا۔

بہر حال انعم بچپن سے اپنا ہر مسئلہ اس سے ہی ڈسکس کرتی تھی۔ اس نے خود کو مطمئن کیا۔

اور اب بھی اگر کوئی مسئلہ ہے تو ظاہر ہے وہ اس سے ہی کہے گی۔ یوں بھی وہ بہت حساس تھی' چھوٹی چھوٹی باتوں پر اکثر پریشان ہو جاتی تھی جب کہ ثمن معمولی باتوں پر پریشان نہ ہوتی تھی۔ اس میں انعم کی نسبت زیادہ اعتماد تھا۔ ثمن کا خیال آتے ہی اس نے کومل سے پوچھا۔

"یہ ثمو کہاں ہے' صبح سے نظر نہیں آئی۔ ناشتہ بھی نہیں کیا اس نے۔"

"ثمو آپی! سو رہی ہیں۔ رات دیر تک پڑھتی رہی تھیں۔ اس لیے ان کا آرڈر تھا کہ صبح چھٹی ہے لہٰذا وہ گیارہ بجے تک سوئیں گی۔"

کومل نے تفصیل بتائی اور پھر قدرے سرگوشی کے سے لہجے میں پوچھا۔

"آج امی جان کو بتاؤں کہ آپ کو عبیر ملک پسند ہیں۔"

"تم بہت شریر ہو گئی ہو چھوٹی! فی الحال میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے' پہلے تم تینوں کو ٹھکانے لگاؤں گا۔ پھر اپنے متعلق سوچوں گا اور امی جان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے سمجھیں۔"

اس کے سر پر چپت لگاتا ہوا وہ اٹھ کھڑا ہوا کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔

ابھی ساڑھے دس بجے تھے اور اسے اپنی بائیک لینے مکینک کے پاس جانا تھا' کافی دنوں سے کچھ گڑبڑ کر رہی تھی۔ سو کل رات کومل کو گھر چھوڑ کر وہ بائیک بابو کے حوالے کر آیا تھا۔ بابو محلے کا ہی لڑکا تھا اور عبداللہ کے ساتھ اس کی کافی گپ شپ تھی۔ اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ صبح بارہ بجے تک بائیک تیار ہو گی۔ دوپہر کا کھانا انہیں صدف کے ہاں کھانا تھا۔ کرن کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی تھی۔ اور اس خوشی میں اس نے آج سب کی دعوت کی تھی۔

"چچا جان کمرے میں ہیں یا بٹ صاحب کی طرف چلے گئے ہیں۔"

"نہیں۔ ابو جان تو گھر پر ہی ہیں۔"

کومل نے بتایا تو اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا وہ ماسٹر شفیق احمد کے کمرے میں چلا آیا۔

وہ تکیے سے ٹیک لگائے اخبار دیکھ رہے تھے۔

"آؤ۔۔۔ آؤ بیٹا! آجاؤ۔"

وہ اخبار ایک طرف رکھ کر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"آپ اخبار پڑھ رہے تھے۔" وہ ان کے پاس ہی ان کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"ارے بیٹا! یہ اخبار پڑھتے کہاں ہیں چاٹتے ہیں۔" زہرا بیگم نے قرآن جزدان میں لپیٹتے ہوئے کہا۔

"دو گھنٹے سے اٹھائے ہوئے ہیں۔"

"ایک چھٹی والے دن ہی تو اخبار دیکھتا ہوں' وہ بھی تمہیں اچھا نہیں لگتا۔"

"اسے دیکھنا کہیں گے بھلا۔" انہوں نے اٹھ کر قرآن پاک الماری میں رکھا۔

"بھئی! تمہاری امی جان شروع دن سے اخبار سے چڑتی ہیں۔" ماسٹر شفیق احمد نے مسکرا کر عبداللہ کو دیکھا۔

"ہونا کیا ہے بیٹا! اخبار میں۔ چوری' ڈاکہ' بم دھماکے' قتل مار دھاڑ' میں تو کبھی غلطی سے

اخبار دیکھ لوں تو میرا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا ہے۔ آج ہی بس غلطی سے نظر پڑ گئی اخبار پر، ابھی تک دھڑکن نارمل نہیں ہوئی دل کی۔"

"ایسی کون سی خبر پڑھ لی تھی تم نے۔"

"ارے وہی اس بچی والی۔" زہرا بیگم نے افسردگی سے کہا۔

"کون سی خبر، چچا جان۔"

عبداللہ نے اخبار اٹھالیا اور پھر پہلے ہی صفحے پر اسے وہ خبر نظر آ گئی۔ گینگ ریپ۔" اس نے اخبار واپس چارپائی پر رکھ دیا۔

"ایسے لوگوں کے لیے سزائے موت سے کم کوئی سزا نہیں ہونی چاہیے۔" ماسٹر شفیق احمد نے عبداللہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں چچا جان! یہ لوگ تو سنگسار کر دیئے جانے کے قابل ہیں۔ لیکن ہوتا کیا ہے۔۔۔ بچ جاتے ہیں یہ لوگ کاش۔۔۔ اے کاش۔۔۔! اس نے مٹھیاں بھینچیں اس کے ماتھے کی رگیں تن گئی تھیں۔

"میں ان لوگوں کو ایسی سزا دیتا ہوں کہ آنے والی نسلیں یاد رکھتیں۔"

"یہ ایک اسلامی ملک کا حال ہے اور یہ مسلمان ہیں۔"

ماسٹر شفیق احمد کے لہجے میں افسردگی اتر آئی تھی اور چہرے کی لکیروں سے درد جھلکنے لگا تھا۔

"میری ہمت، نہیں ہوئی کہ میں پوری خبر پڑھتا۔"

ان کی آواز مدھم ہو گئی تھی اور عبداللہ کا خون کھول رہا تھا۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا، اس نے خود بھی پوری خبر نہیں پڑھی تھی۔ پتا نہیں وہ لڑکی کون تھی؟ کن مظلوم والدین کی بیٹی تھی۔ کس جگہ، کس شہر سے اس کا تعلق تھا؟ لیکن اس کا دل اس انجانی لڑکی کے لیے خون کے آنسو رو رہا تھا۔

"اللہ سب بچیوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔" زہرا بیگم نے دعا کی اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"ماسٹر صاحب! آج کیا پکائیں؟"

"بھئی، جو مرضی پکالو۔ میں نے پچیس سال اعتراض نہیں کیا تو اب کیا کروں گا۔"

انہوں نے ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے خوش کن لہجے میں کہا۔

"ہاں، عبداللہ سے پوچھ لو۔"

"نہیں۔۔۔ مجھے آج کہیں اور جگہ کھانا ہے۔ صدف نے سب کو دعوت دی ہے۔"

عبداللہ نے اپنے خیال سے چونک کر زہرا بیگم کی طرف دیکھا۔ اور خود کو کمپوز کرنے کی

کوشش کی۔

"اور یہ آپ کہاں چلیں۔ آپ کے دل کی دھڑکن معمول سے تیز ہے تو آپ آرام کریں، بچیاں پکالیں گی۔" ماسٹر شفیق احمد نے انہیں روکا۔

"نعم ہی کرے گی سب میں صرف بتانا چاہ رہی تھی اس کو کہ کیا پکائیں۔ ورنہ طبیعت کافی خراب ہے میری۔"

"تو امی جان! ایسا ہے کہ آپ تیار ہو جائیں میں رکشہ لاتا ہوں تو ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔"

"نہیں بیٹا! ڈاکٹر کیا کرے گا یہ دل تو بس یونہی ہر کھٹکے، ہر آہٹ پر ہولنے لگتا ہے۔ خدا تینوں کو اپنے اپنے گھر کا ساتھ خیریت کے کر دے۔"

"اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ زہرا بیگم۔ اور پھر ابھی تو بچیاں پڑھ رہی ہیں اور یہ میں نے تم سے کل بھی کہا تھا کہ اکیس مرتبہ سورۂ طارق پڑھ کر چینی پر دم کر کے رکھ لو اور جب دھڑکن بے اعتدال ہو، کھالیا کرو اور ویسے بھی پانی بھی دم کر کے پیو انشاء اللہ ٹھیک ہو جاؤ گی۔ ویسے اس عمر میں یہ دھڑکنوں کا بے اعتدال ہونا کچھ۔۔۔۔" ماسٹر شفیق احمد کے لہجے میں ہلکی شوخی تھی۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں ماسٹر صاحب بچہ بیٹھا ہے اور آپ کو مذاق سوجھا ہے۔" وہ جھینپ گئیں۔

"ارے اپنا ہی بچہ ہے بیگم! غیر تو نہیں۔"

شفیق احمد ہولے سے ہنسے تو عبداللہ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے بیٹھو بیٹا! کہاں چل دیے۔" شفیق احمد نے روکا تو اس نے ان کی طرف دیکھا۔

"بس ذرا بابو کی طرف جاؤں گا بائیک لینی ہے اس سے۔"

بیٹا یوں کرو اس بائیک کی اور تمہاری عمر تو اب برابر ہی ہو گی۔ اسے فروخت کر ڈالو اور نئی لے لو۔ جو پیسے کم پڑیں وہ لے لینا مجھ سے۔"

اس بائیک پر ماسٹر شفیق احمد اسکول جایا کرتے تھے لیکن جب سے عبداللہ نے ملک صاحب کو جوائن کیا تھا ماسٹر شفیق احمد نے اسے عبداللہ کو ہی دے دیا تھا۔ خود وہ وین پر جایا کرتے تھے۔ اس سے قبل بھی اکثر بائیک عبداللہ کے استعمال میں ہی رہتی تھی۔

"جی چچا جان! کچھ عرصے بعد لے لوں گا نئی۔"

وہ جانے کے لیے مڑا گو وہ کچھ دیر بیٹھنے کے لیے آیا تھا۔ جب بھی وہ فارغ ہوتا تو ماسٹر شفیق احمد کے پاس بیٹھنا اور ان سے باتیں کرنا اسے اچھا لگتا تھا۔ ان کی باتیں اسے زندگی کرنا

سکھاتی تھیں۔ ایمان افروز واقعات اس کا ایمان مضبوط کرتے تھے اور ان کی باتیں حوصلہ بڑھاتی اور امید دلاتی تھیں لیکن آج یکدم ہی اس کا جی برا ہو گیا تھا۔ ایسی خبریں ہمیشہ ہی اس کی طبیعت خراب کر دیتی تھیں دل بوجھل ہو جاتا تھا۔

"بیٹا! انعم سے کہنا' دوپہر کے لیے دال چاول بنا لے اور رات کے لیے کوفتے بنا لے۔ میں نے صبح قیمہ فریزر سے نکال کر رکھ دیا تھا۔"

زہرہ بیگم اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی تھیں۔

"جی کہہ دوں گا۔"

انعم منہ ہاتھ دھو کر دوبارہ کپڑے استری کرنے لگی تھی اور کومل اپنی کتابیں اٹھا کر کہیں جا چکی تھی۔

زہرہ بیگم کا پیغام دے کر عبداللہ نے بغور انعم کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔

"انعم! تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔"

"جی۔۔" انعم نے سر جھکائے استری کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی پرابلم۔۔"

"نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔"

اس نے لہجے کو بشاش رکھنے کی کوشش کی۔

"نہیں کوئی بات تو ہے' تمہاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں' روئی ہو۔"

"نہیں تو۔۔" اس نے پھر انکار کیا۔

"انو۔۔! ادھر دیکھو میری طرف۔"

عبداللہ دیوار سے ٹیک لگائے اسے دیکھ رہا تھا۔

انعم نے ذرا کی ذرا پلکیں اٹھائیں اور پھر فوراً ہی جھکا لیں۔ لیکن ان آنسوؤں کا کیا کرتی جو بغاوت کر بیٹھے تھے۔

"انو۔۔!" عبداللہ سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"پلیز جو بھی ہے بتاؤ' صرف بھائی ہی نہیں دوست بھی ہوں تمہارا۔"

"وہ۔۔ وہ سر میں درد ہو رہا ہے' بہت' برداشت نہیں ہو رہا۔" انعم نے بہانا بنایا۔

"سچ کہہ رہی ہو۔" عبداللہ کو یقین نہیں آیا کہ وہ محض سر درد سے رو پڑی ہو۔

"جی۔۔" اس نے سر ہلایا۔

"تو پھر ڈسپرین لے لو۔ اور آرام کرو' ڈسپرین ہے گھر میں یا لے آؤں۔"

"لی ہے۔"

"تو پھر یہ استری کرنا ضروری ہے کیا۔"

"وہ آج چھٹی ہے نا تو پھر ہفتہ بھر پڑے رہیں گے۔"

"اگر بہت ضروری ہیں تو لاؤ۔ میں کر دیتا ہوں۔" عبداللہ نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے استری لے لی۔

"نہیں۔۔ میں کر لوں گی۔"

"شاباش' جاؤ تم کمرے میں آرام کرو اور ثمن سے کہہ دینا' وہ کھانا بنا لے گی۔"

انعم نے استری لینا چاہی تو عبداللہ نے نرمی سے استری کی طرف بڑھتا اس کا ہاتھ پیچھے کر دیا اور انعم کو یوں لگا جیسے پورے وجود میں بجلی دوڑ گئی ہو۔

وہ یونہی ساکت کھڑی تھی کہ مین گیٹ پر بیل ہوئی۔

"میں دیکھتا ہوں کہ کون ہے اور خبردار جو تم نے استری کو ہاتھ بھی لگایا آرام کرو جا کر۔"

اسے سرزنش کرتا ہوا وہ گیٹ کی طرف بڑھ گیا آنے والا اس کے لیے اجنبی تھا۔

"ماسٹر شفیق احمد ہیں۔"

"جی میں ہوں شفیق احمد۔"

ماسٹر شفیق احمد نے جو بیل کی آواز سن کر باہر نکلے تھے عبداللہ کے پیچھے سے کہا تو عبداللہ ایک طرف ہٹ گیا۔

"السلام علیکم ماسٹر صاحب!۔"

"وعلیکم السلام۔۔" ماسٹر شفیق احمد نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے اپنی عینک درست کی اور یکدم چونکے یہ تو وہی تھا۔ کل والا شخص جو مسلسل انہیں گھورتا رہا تھا۔

"ماسٹر صاحب! آپ نے مجھے پہچانا۔" لہجہ مودب تھا۔

"نہیں بھائی! میں نہیں پہچان سکا۔"

"ماسٹر صاحب بہت پہلے وہ ویگن کا حادثہ یاد ہے آپ کو وہاں ملاقات ہوئی تھی آپ سے۔"

"اوہ۔۔ ہاں۔۔ ہاں۔۔"

ماسٹر شفیق احمد نے نہ صرف اسے پہچان لیا تھا بلکہ ان کی پیشانی سے پسینہ یوں پھوٹ رہا تھا جیسے پانی ہو۔ انہوں نے گھبرا کر عبداللہ کی طرف دیکھا' اور پھر تھوک نگلتے ہوئے عبداللہ سے کہا۔

"بیٹا اندر سے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دو۔"

"جی۔۔"

عبداللہ واپس مڑ گیا اس نے ماسٹر شفیق احمد کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ جنہوں نے اجنبی کو ہاتھ کے اشارے سے ڈرائنگ روم کے بیرونی دروازے کی طرف چلنے کو کہا تھا۔ اور ان کے ہاتھ میں واضح لرزش تھی۔

"آیئے ادھر سے۔" اور اجنبی عبداللہ کو بغور دیکھتا ہوا ماسٹر شفیق احمد کے پیچھے چل پڑا۔

☼ ☼ ☼
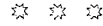
مولوی اللہ یار نے مسجد میں جھاڑو لگا کر ایک تنقیدی نظر ساری مسجد پر ڈالی۔ مسجد صاف ستھری تھی اور کوزے ترتیب سے پڑے تھے جھاڑو ایک طرف رکھ کر انہوں نے مسجد کا دروازہ بند کیا اور باہر آ کر پیپل کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

یہ ان کا روز کا معمول تھا' جب فجر کی نماز کے بعد بچے قرآن وغیرہ پڑھ کر چلے جاتے تو وہ مسجد میں جھاڑو دیتے۔ حوض میں دیکھتے کہ پانی ہے یا نہیں' کوزے ترتیب سے رکھتے اور پھر کچھ دیر تک باہر آ کر پیپل تلے بیٹھے رہتے۔ کبھی کبھار اپنے گھر کا یا مولوی ہدایت اللہ کے گھر کا چکر بھی لگا لیتے۔

مولوی ہدایت اللہ تو اب تقریباً" دو سالوں سے مسجد سے بالکل ہی الگ ہو گئے تھے بس نماز جماعت کے ساتھ ادا کر لیتے تھے۔ باقی ساری ذمہ داری انہوں نے مولوی اللہ یار پر ڈال دی تھی۔ اور پچھلے چند دنوں سے تو وہ پھر کچھ بیمار سے بھی تھے۔ جوڑوں کے درد نے انہیں تقریباً" بستر کا ہی کر دیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے انہوں نے سوچا کہ وہ جا کر مولوی صاحب کا حال دریافت کر لیں لیکن پھر پیپل سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ذہن کچھ پراگندہ سا ہو رہا تھا۔ دکان پر جانے کا موڈ بھی نہیں تھا۔

وادا صبح ہی دکان کھول کر بیٹھ جاتا تھا۔ درمیان میں فارغ ہو کر وہ بھی چلے جاتے تھے۔ دو سال قبل انہوں نے خدا کی رضا کے آگے سر جھکا دیا تھا یوں خدیجہ بنت ہدایت اللہ ان کی زندگی میں شمولیت کرنے چلی آئی تھی۔ جس کو وہ جانتے نہ تھے اور جس کے متعلق کبھی زندگی میں انہوں نے سوچا تک نہ تھا۔ حکیم صاحب کے مشورے پر انہوں نے حکیم صاحب کا ہی پرانا مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ عبدالقادر کے ساتھ قریبی قصبے میں جا کر اپنی قیمتی گھڑی فروخت کر کے انہوں نے دلہن کے لیے کپڑے خریدے اور حق مہر ادا کر کے گھریلو استعمال کی ضروری چیزیں خریدی تھیں۔ اور پھر حکیم صاحب کے مشورے پر ہی گھر کے باہر والے کمرے میں چھوٹی سی دکان کھول لی تھی۔ پہلے یہاں حکیم صاحب بیٹھا کرتے تھے۔

عبدالقادر ہر ماہ شہر جا کر سودا خرید لاتا تھا یوں ایک گھر کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ کبھی کبھی انہیں بہت ہنسی آتی۔

"واہ! زنجیریں تڑا کر بھاگا تھا کیسے پکڑا ہے تیرے رب نے تجھے۔ اجنبی زمین پر اجنبی لوگوں کے درمیان۔"

کبھی کبھی سودا تولتے ہوئے بھی وہ بااختیار ہنس پڑتے۔ کس کو خبر تھی کہ پانچ پانچ دس دس روپے کا سودا تولنے والا مولوی اللہ یار ماسٹرز کی ڈگری رکھتا ہے۔

اور خدیجہ بنت ہدایت اللہ......

عام سی شکل و صورت والی سادا سی لڑکی۔۔۔ انہوں نے کبھی دھیان سے اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ سامنے ہوتی تو ان کی آنکھیں کہیں اور دیکھ رہی ہوتیں۔

وہ کبھی مسکراتے۔ کبھی سرگوشی کرتے' لیکن ان کی آواز خدیجہ نہ سن پاتی۔

"رابی۔۔۔!"

خدیجہ حیرت سے انہیں تکا کرتی۔ وہ ایک خاموش طبع لڑکی تھی۔ پڑھنا لکھنا اسے مولوی صاحب نے سکھایا تھا۔ سمجھ دار تھی اور مولوی ہدایت اللہ نے اسے سمجھایا تھا۔

"خدیجہ! قسمت نے تیرا مقدر جس کے ساتھ جوڑا ہے وہ ہیرا ہے۔ خدا نے تجھے بہت نوازا ہے۔ مالا مال کر دیا ہے تجھے ایسے ہیرے نصیب والوں کو ہی ملتے ہیں۔ تو بہت بخت آور ہے۔ خدیجہ۔۔۔! لیکن اللہ یار کو ٹوکنا نہیں۔ کسی بھی بات پر واویلا نہیں کرنا۔ ابھی وہ کسی اور دنیا میں رہتا ہے۔ اس کا سفر مکمل نہیں ہوا۔ جلدی مت کرنا' وہ دھیرے دھیرے تیری طرف لوٹ آئے گا۔ اس کی پیشانی چمکتی ہے۔ وہ جلد ہی ساری منزلیں طے کر لے گا تو پھر پریشانی نہیں ہو گی۔"

سو خدیجہ بھی خاموش ہی رہتی تھی۔ کبھی کبھی جب اچانک اس کے ہاتھ تھامے محبت سے اسے تکتے تکتے وہ اسے جھٹک کر الگ کر دیتے تیز تیز قدموں سے ٹہلنے لگتے اور دوران چہل قدمی سرخ آنکھوں سے اسے دیکھتے یا کبھی رابی کہہ کر بے چین ہو کر اس کی طرف لپکتے تو وہ لب سی لیتی تھی۔

اس نے کبھی ان سے سوال نہیں کیا تھا۔ کبھی کچھ پوچھا نہیں تھا کبھی جھگڑا نہیں کیا تھا۔

ایک بار انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"خدیجہ! تم نے کبھی مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ میں کون ہوں۔۔۔ میرا خاندان کیا ہے۔ کس کا بیٹا ہوں' عورتیں تو بڑی متجسس ہوتی ہیں۔ تم نے کبھی مجھ سے کوئی جھگڑا بھی نہیں کیا۔ میں کوشش تو کرتا ہوں کہ اپنے فرائض میں کوتاہی نہ کروں پھر بھی میں نے تم سے کہا تھا نا کہ اگر کوتاہی ہو جائے تو مجھے معاف کر دینا۔ میں جانتا ہوں۔ تمہارا ظرف بہت بلند ہے۔ لیکن مجھے حیرت ہوتی ہے کہ تم نے کبھی کوئی سوال نہیں کیا۔۔۔ کیوں؟"

"ابا جان نے کہا تھا کہ آپ کا سفر ابھی مکمل نہیں ہوا آپ ابھی آدھی راہ میں ہیں۔ میں تنگ

نہ کروں آپ کو۔"

اوران کے اندر جیسے شور مچ گیا تھا۔ آنسو بے تحاشا آنسو۔"

"کب' کب مکمل ہو گا یہ سفر خدیجہ! کب؟ چلتے چلتے میرے پاؤں میں آبلے پڑ گئے ہیں لیکن سفر مکمل نہیں ہو پاتا۔ نہ آگے جا پاتا ہوں نہ پیچھے' سارے راستے بند ملتے ہیں۔ تم نے خدیجہ! تم نے پوچھا نہیں تھا مولوی صاحب سے کب ہو گا میرا سفر مکمل۔؟"

ان کی آنکھیں بے تحاشا سرخ ہو رہی تھیں اور اندر آگ جل اٹھی تھی۔ پیاس۔۔۔ بے تحاشا پیاس۔ اور آنسو نہ یہ پیاس بجھا پا رہے تھے اور نہ آگ۔ پھر کتنے ہی دن وہ گھبرائے گھبرائے سے گاؤں کی گلیوں کا چکر لگاتے رہے۔ کبھی راتوں کو اٹھ کر دروازہ کھول کر باہر نکل جاتے۔ اور بے خودی میں چوہدری نیاز کی حویلی کے گیٹ تک پہنچ جاتے۔

"کیا یہاں ہے میری منزل۔ کیا یہاں ہی میرا سفر ختم ہونا ہے ؟"

وہ خود سے پوچھتے۔

کوئی چہرہ جیسے حویلی کے گیٹ میں گم ہو جاتا وہ لپکتے بند گیٹ کے اندر کوئی نہ ہوتا۔

"سب الوژن ہے۔" وہ خود سے کہتے۔ اور یہ ساری دنیا ایک وہم ہے ایک الوژن' ایک خواب' ایک خیال۔ اور حقیقت کیا ہے۔"

"حقیقت تو صرف وہی ہے' وہی جس نے آدھے راستے میں لا کر چھوڑ دیا تھا۔ اور کشورِ دل کے ہر کنگرے سے اللہ اللہ کی آوازیں آنے لگتیں۔ ہاں حقیقت تو صرف وہی ہے باقی سب وہم ہے گمان ہے۔" اور وہ بے حال سے ہو کر کہیں کسی جگہ گر پڑتے سسکیاں' ہچکیاں' آنسو' آہیں۔ کوئی دیکھ لیتا تو مولوی ہدایت اللہ سے ضرور کہتا۔

"مولوی صاحب! آپ نے یہ کس کو خدیجہ بیٹی کا رشتہ دے دیا اسے تو اپنے حال کی خبر نہیں۔" اور وہ مسکرا دیتے۔

"اسے آزمایا جا رہا ہے۔ تپ کر کندن بن جائے گا۔"

لیکن اللہ یار کو تو یوں لگتا تھا جیسے وہ راکھ ہوئے جاتے ہوں۔ کبھی کبھی طبیعت میں ٹھہراؤ آ جاتا تو وہ خدیجہ سے بہت نرمی اور محبت سے بات کرتے اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگتے۔

اور چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے۔ خدیجہ بھی خوش ہو کر اپنی ننھی ننھی خوشیاں ان سے شیئر کرتی۔

"مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا مولوی صاحب! میرا جی چاہتا تھا کہ میں بھی کالج میں پڑھوں۔"

"اچھا کہاں تک پڑھا ہے تم نے۔"

"ابا نے گھر میں ہی پڑھا کر آٹھویں کا امتحان دلوا دیا تھا۔"

"میں کتابیں منگوا کر تمہیں پڑھا دوں گا۔ پہلے تم پرائیویٹ میٹرک کر لینا پھر تمہیں کالج میں داخل کروا دوں گا۔"

"آپ۔۔۔ آپ مجھے کالج میں داخل کروا دیں گے اور آپ مجھے پڑھائیں گے بھی۔" خدیجہ کی آواز خوشی سے بھرا جاتی۔

"ہاں۔۔۔" وہ سرہلا دیتے۔

اس کی خوشی انہیں اچھی لگتی۔ وہ اس کی آنکھوں کی چمک دیکھے جاتے۔ دیکھے جاتے۔ پھر جیسے کوئی چھم سے ان کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔

"رابی! جب تم خوش ہوتی ہو نا تو تمہاری آنکھیں دمکنے لگتی ہیں۔ یوں جیسے ہزاروں کرمکِ شب ان آنکھوں میں اتر آئے ہوں۔"

"مگر آپ مجھے کیسے پڑھائیں گے۔" خدیجہ کی آنکھوں کی چمک ماند پڑنے لگتی۔ "آپ کا سفر ختم ہو گیا کیا؟"

"سفر۔ ہاں سفر۔۔۔" وہ کھو جاتے۔ "ہر سفر کا اختتام ہوتا ہے کہیں نہ کہیں۔ مگر میرا سفر ختم کیوں نہیں ہوتا خدیجہ۔" وہ روہانسے ہو جاتے۔ دل کی گھبراہٹ سے الجھ کر خدیجہ کے پاس سے اٹھ جاتے اور پھر وہی بے چینی وہی اضطراب وہی نامعلوم سی طلب۔

اور وہ جھونپڑی والا بابا کہتا تھا۔

"اس سفر کی کوئی منزل نہیں ہے۔ بس سفر ہی سفر ہے آرزو ہے۔ اشتیاق ہے۔ دیدار ہے۔ اور بس وصل نہیں ہے۔ تڑپ ہی تڑپ ہے۔ ہجر ہی ہجر ہے۔"

اور مولوی ہدایت اللہ نے خدیجہ سے کہا تھا۔

"اس کا سفر مکمل نہیں ہوا۔ مکمل ہو جائے گا تو وہ تیری طرف لوٹ آئے گا۔"

اور جھونپڑی والے بابا نے کہا تھا۔

"ہجر۔ صرف ہجر کا سفر ہے اور اس سفر میں یا تو کندن بن جائے گا یا راکھ۔"

"پتا نہیں یہ ہجر کتنا طویل ہے۔"

انہوں نے پیپل کے تنے سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں موند لیں اور سوچا دارا نے دکان تو کھول لی ہو گی دارا گلیوں میں سارا دن آوارہ پھرتا تھا ایک دادی کے سوا اس کا کوئی نہیں تھا۔ نعیم صاحب ہی ایک دن اسے ان کے پاس لائے تھے۔

"مولوی صاحب! اسے دکان پر بٹھا لیں۔ کچھ خرچا پانی دے دیا کریں۔ آپ کو بھی آسانی ہو جائے گی اپنی نماز اور عبادت کی اور اس کا بھی بھلا ہو جائے گا۔"

اور یوں دارا نے کافی حد تک دکان سنبھال لی تھی۔ سو کبھی کبھی تو وہ ظہر کی نماز تک ہی پیپل

تلے بیٹھے رہتے تھے۔

آج بھی ان کا اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ چند دن قبل گاؤں میں جو واقعہ ہوا تھا اس نے ان کے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ زرینہ ایک غریب کمہار کی بیٹی تھی۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی یہی سولہ سترہ برس کی ہوگی۔ چھ سات دن قبل وہ گھر سے باہر چوہدریوں کی حویلی کی طرف گھڑے وینے گئی تھی پھر واپس نہیں آئی۔ اس کا غریب باپ رات گئے ان کے پاس دعا کروانے آیا تھا۔ سیدھے سادھے معصوم دیہاتیوں کے پاس دعا کے سوا اور کیا تھا۔ لیکن زرینہ نہیں ملی اور دو دن بعد اس کی لاش گاؤں کے باہر خاردار جھاڑیوں میں پڑی ملی تھی۔

"یہ ظلم ہے۔" وہ تڑپ اٹھے تھے۔ "قاتلوں کو سزا ملنی چاہیے۔"

لیکن اس کے گھر والوں نے خاموشی سے اسے دفن کر دیا تھا۔ کوئی ایف آئی آر نہیں کٹوائی گئی تھی۔ عبدالقادر نے چپکے سے انہیں بتایا تھا کہ چوہدری نیاز کا بڑا بیٹا شوقین آدمی ہے۔ اور تین چار دن قبل وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ شکار گاہ میں تھا گاؤں والوں کا خیال ہے کہ یہ کارنامہ چوہدری اعجاز کا ہے۔ لیکن چوہدریوں کے خوف سے کوئی زبان پر نہیں لاتا۔

"شکار گاہ" بھی ایک چھوٹا سا بنگلہ تھا' جدید سہولیات سے آراستہ' گاؤں سے ذرا ہٹ کر تھا۔ اکثر چوہدری اعجاز اور چوہدری نیاز وغیرہ کے دوست احباب آتے رہتے تھے۔ اور شکار کی غرض سے یہاں ہی ٹھہرتے تھے۔ ارد گرد اور ہرن وغیرہ بکثرت مل جاتے تھے۔ تیتر اور مرغابیاں بھی تھیں۔ سو اس بنگلے کا نام شکار گاہ پڑ گیا تھا۔

اور کل جمعہ کے خطبے سے پہلے انہوں نے اس واقعہ پر تقریر کی تھی اور گاؤں کے لوگوں سے کہا تھا کہ ظلم کے خلاف نہ بولنا آواز نہ اٹھانا گویا ظلم کے ہاتھ مضبوط کرنا ہیں۔ زرینہ کے قاتلوں کو سزا ملنی چاہیے۔ اگر کوئی اس بات سے باخبر ہے تو اسے پولیس کے پاس جانا چاہیے۔ وہ اس کا ساتھ دیں گے۔

اور بڑی عجیب بات ہوئی تھی' سب سے پہلے تو مولوی ہدایت اللہ نے ہی ان کو سمجھایا تھا۔

"اللہ یار! تمہیں یہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا۔ خوامخواہ میں چوہدریوں کی دشمنی مول لے لو گے۔"

"لیکن میں نے تو کسی کا نام نہیں لیا بس قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی بات کی ہے۔"

"پھر بھی بیٹا! سب ہی جانتے ہیں' کس کا ہاتھ ہے اس میں۔"

مولوی ہدایت اللہ کے علاوہ بھی کئی اور افراد نے حتی الامکان دبے لفظوں میں ان کو تنبیہہ کی اور وہ حیران تھے کہ کیسے لوگ ہیں جو ظلم کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں حتی کہ آج صبح جب زرینہ کے قتل کے بعد انہوں نے فضل دین کمہار سے کہا کہ وہ پولیس میں رپورٹ کرا دے تو

اس نے انکار کر دیا۔

"ہماری دھی تو مر گئی مولبی صاحب! ایسا ہی نصیب لکھوا کر لائی تھی اب ہم کہاں خجل خوار ہوں' وہ تو واپس آنے سے رہی۔"

"مگر فضل دین! کل کو گاؤں میں پھر کوئی ایسا واقعہ ہو گیا تو قاتلوں کو تو تمہاری خاموشی سے شہ ملے گی کل کو۔"

"نہ جی! ہم تھانے کچہریوں جوگے نہیں ہیں اور آپ بہت بھولے ہو مولبی جی! آپ کو نہیں پتا یہ پولیسے' تفتیش کے بہانے ہماری عورتوں کو تھانے میں بٹھائے رکھیں گے۔ نہ جی' نہ ہماری اور بھی بیٹیاں ہیں ایک زرینہ نہیں تھی جی۔ ایک نقصان تو جو ہوا سو ہوا۔ مزید نقصان کا یارا نہیں ہے ہم میں۔"

اور وہ حیران سے فضل دین کو جاتا دیکھتے رہے اور اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرتے رہے اور اب بھی وہ پیپل سے ٹیک لگائے سوچ رہے تھے کہ ایک بار پھر فضل دین سے بات کریں گے۔ ایک لڑکی پر اتنا ظلم ہوا۔ اور پھر اسے مار دیا گیا اور سب خاموش ہیں۔ تب ہی عبدالقادر نے ان کے قریب آ کر سلام کیا۔ تو انہوں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"وعلیکم السلام عبدالقادر۔۔۔۔ بیٹھو۔"

عبدالقادر سر جھکائے ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اس کی اب بھی عادت تھی کہ جب بھی اسے موقع ملتا ان کے پاس آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ اور ان کی باتیں سنتا۔ اور سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ میٹرک کے بعد وہ کالج جا کر پڑھنا چاہتا تھا۔ شروع سے اس کی خواہش تھی لیکن اس کے باپ نے اسے حویلی میں چوہدری نیاز کے پاس رکھوا دیا تھا ان کے ذاتی کاموں کے لیے' مولوی اللہ یار کو پتا چلا تو انہیں افسوس ہوا تھا۔

"تم تو کالج میں پڑھنا چاہتے تھے عبدالقادر۔"

"بس جی ہم غریب لوگ اتنے خرچے برداشت نہیں کر سکتے۔"

"تجھے شوق ہے نا تو شہر میں میرا ایک دوست ہے' اس کی طرف چلا جا۔ خط دوں گا تجھے' وہ تجھے داخلہ دلوا دے گا۔ رہائش کا بندوبست بھی کر دے گا اور تیرا خرچ میں دوں گا سب۔"

اور عبدالقادر کے دل میں ان کی عقیدت و محبت اور بھی بڑھ گئی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ چوہدری یہ پسند نہیں کرے گا اس کے باپ نے اس سے کہہ دیا تھا۔

"تو بھول جا اپنی آرزو۔۔۔ اور صرف یہ یاد رکھ کہ تیرا ایک بوڑھا باپ ہے اور جوان بہنیں ہیں۔ تو چوہدری نیاز کو پسند آ گیا ہے۔ تھوڑا پڑھا لکھا ہے نا اسے اپنی ذاتی کاموں کے لیے چاہیے۔"

سو وہ تب سے چوہدری نیاز کے پاس تھا۔ شہر کے چھوٹے موٹے کام عدالتوں کے چکر اور دوسرا حساب کتاب رکھنے کے علاوہ بوقت ضرورت وہ چوہدری کے ساتھ شہر بھی جاتا رہتا تھا۔

"آج اس وقت کیسے آنا ہوا عبدالقادر؟"

"وہ جی چوہدری صاحب نے بھیجا ہے آپ کو بلانے۔"

"مجھے۔۔!" مولوی اللہ یار نے اپنی طرف اشارا کیا۔

"ہاں جی آپ کو بہت غصے میں ہیں۔"

"کیوں غصے میں کیوں ہیں؟"

"وہ جی کل آپ نے جو تقریر کی تھی نا! اس کی وجہ سے بس آپ معافی مانگ لینا۔"

"کس بات کی معافی عبدالقادر۔؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ جی چوہدری صاحب ناراض ہیں نا آپ کی تقریر پر۔"

"لیکن میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کی تھی عبدالقادر۔"

"وہ تو جی ٹھیک ہے پر آپ معافی مانگ لیں۔"

مولوی اللہ یار خاموشی سے کھڑے ہوگئے اور عبدالقادر کے ساتھ حویلی کی طرف چل پڑے۔

چوہدری نیاز آج حویلی کے مردانے حصے میں تھا۔ مولوی اللہ یار نے دوسری بار چوہدری نیاز کو دیکھا تھا۔ وہ پیشانی پر شکنیں ڈالے چھڑی گھماتا انہیں گھور رہا تھا۔

"سنا ہے مولوی! تیرے بھی پر نکل آئے ہیں' زبان لگ گئی ہے تجھے۔ مشورے دینے لگا ہے۔ لوگوں کو اکساتا ہے ہمارے خلاف۔ کہانیاں سناتا ہے۔ زبان گدی سے کھنچوا لوں گا۔ بوٹی بوٹی کر کے چیل کوؤں کے آگے ڈال دوں گا۔ بڑا آیا عالم فاضل۔"

چوہدری نیاز بول رہا تھا اور مولوی اللہ یار سوچ رہے تھے۔

"اے رب! یہ تیرا خلیفہ ہے تو نے اسے اپنا نائب بنا کر زمین پر بھیجا ہے اور یہ خدا بن بیٹھا ہے مولا۔"

"سن مولوی! پہلی بار ہے۔ اس لیے معاف کر رہا ہوں لیکن آئندہ ریفارمر بننے کی کوشش نہ کرنا۔"

وہ خاموش کھڑے تھے۔ انہوں نے ایک نظر عبدالقادر کو دیکھا جو سر جھکائے کھڑا تھا۔ اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ نظر کھلے دروازے سے باہر حویلی کے گیٹ تک چلی گئی۔ کوئی رنگین آنچل لہرایا تھا اور وہ کسی الوژن کا شکار ہو کر یکدم چپ ہو گئے تھے۔ نگاہیں عبدالقادر کی طرف تھیں لیکن آنکھیں کچھ اور دیکھ رہی تھیں۔

"بہرا ہو گیا ہے مولوی یا سن لیا ہے تو نے؟"

چوہدری نیاز دھاڑے تو مولوی اللہ یار نے نظریں اٹھائیں۔ گہری اندر تک اترتی نظریں۔ پتا نہیں کیا تھا ان آنکھوں میں' ان نظروں میں کہ ایک لمحہ کو تو چوہدری نیاز بھی خاموش ہو گیا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے ہاتھ میں پکڑی چھڑی سے انہیں جانے کا اشارا کیا۔

"جا مولوی! اور آئندہ محتاط رہنا۔ کچھ بولنے سے پہلے سوچ لینا۔ تو وہی ہے نا جس کی بیوی پر ہمارے منشی کے مہینوال کا دل آگیا تھا۔ اور ہم نے تجھ پر رحم کھایا تھا ورنہ۔۔۔"

مولوی اللہ یار کا جسم ہولے سے کانپا اور سارا خون سمٹ کر آنکھوں میں آگیا۔ انہوں نے آسمان کی طرف نگاہ کی۔ اور واپس پلٹے۔

"تیرا مولوی ڈر گیا ہے عبدالقادر۔" کنستر کے اندر پتھر لڑھکے۔

"پھر بھی تو اچھی طرح سمجھا دینا اسے۔" عبدالقادر نے سر جھکا دیا۔

"جی چوہدری جی۔"

"مسجد میں تو بڑی تقریر کرتا ہے اور یہاں زبان پر تالے لگ گئے تھے۔" چوہدری نیاز نے عبدالقادر کو دیکھا۔

"اللہ والے ہیں جی! سمجھ گئے ہیں آپ کی بات۔"

"اچھا تو زیادہ بڑبڑ نہ کر۔"

چوہدری نیاز نے اسٹک گھمائی اور اسے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے اسٹک کی ضرب سے خود کو بچاتا پیچھے ہٹا اور باہر نکل گیا مولوی اللہ یار سر جھکائے بیرونی گیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ یوں جیسے خواب کے عالم میں چل رہے ہوں۔

سرمئی آنچل آنکھوں کے سامنے لہراتا اور غائب ہو جاتا۔ کیا ہے؟ کیا ہے یہ۔ کیوں بار بار میں وہم کا شکار ہوتا ہوں۔ میرے مولا! مجھے اس الوژن سے نجات دلا۔ اس وہم سے آزاد کر دے۔ انہوں نے دل ہی دل میں دعا کی۔ تب ہی اندرونی گیٹ سے کوئی باہر نکلا۔ سرمئی آنچل سر پر تھا اور کندھوں پر سے سفید شال ڈھلک رہی تھی۔ شال درست کرتے ہوئے اس نے نگاہیں اٹھائیں اور پھر بے اختیار دو قدم آگے بڑھ آئی۔

ماہ و سال پیچھے چلے گئے تھے اگر اس چہرے پر یہ سیاہ ڈاڑھی نہ ہوتی اور اگر اس خوبصورت چہرے پر اتنا حزن نہ ہوتا تو۔۔ تو۔۔ بے اختیار لبوں سے نکلا۔

"منصور۔۔!"

"منصور علی۔۔!" آواز سرگوشی سے بلند نہ تھی۔ لیکن سر جھکائے چلتے مولوی اللہ یار رک گئے۔ نگاہیں اچانک اٹھیں اور پھر جھکنا بھول گئیں۔ بے اختیار قدم اس سمت اٹھے تھے اور

انہوں نے صدا دی تھی۔

"رابی۔۔۔!"

"منصور۔۔۔!"

وہ دو قدم اور آگے بڑھی تھی اور دونوں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے اور وقت جیسے پیچھے چلا گیا تھا۔

"رابی۔۔۔! میں تمہارے بغیر کیسے جیوں گا۔ خدا کے لیے کچھ کرو رابی! میں نے صرف تمہارے سنگ زندگی گزارنے کا سوچا ہے رابی! صرف تمہارے سنگ۔"

"یہ ممکن نہیں ہے منصور!" رابعہ کی آنکھیں جل تھل ہوگئی تھیں۔

"بابا نہیں مان رہے۔۔۔ اور انہوں نے میرا رشتہ طے کر دیا ہے۔۔۔ آج کے بعد۔۔۔"

"نہیں رابی! کچھ مت کہنا۔۔۔ میں تو ایک لمحہ بھی تمہارے بغیر جینے کا تصور نہیں کر سکتا اور تم عمر بھر کی جدائیاں دے رہی ہو۔ تم نے مجھے قتل کر دیا رابی۔"

"منصور!"

اس کے لب پھر ہلے تھے اور آنکھوں میں کنکر سے چبھنے لگے تھے۔

"تم یہاں۔۔۔؟" موتی پلکوں پر اٹک گئے تھے۔

"رابی! تم مت رویا کرو۔ تمہارے آنسو میری فصیل دل ڈھا دیتے ہیں۔"

انہوں نے بے اختیار ہاتھ آگے بڑھایا تھا جیسے پلکوں پر اٹکے موتی چن لینا چاہتے ہوں اور پھر ہاتھ ایک دم نیچے کر لیا اور نگاہیں جھکا لیں۔

بظاہر ایک قدم کا فاصلہ تھا لیکن دونوں کے بیچ صدیوں کی دوری حائل تھی۔ وہ بالکل ویسی ہی تھی۔ ہاں جسم تھوڑا سا پہلے سے فربہ ہو گیا تھا۔ ہاتھوں میں انگوٹھیاں تھیں اور گلے میں لاکٹ۔ رابی نے تو کبھی زیور نہیں پہنا تھا۔ وہ تو بہت سادہ سی رہتی تھی۔

مولوی اللہ یار کی نظریں پھر اٹھی تھیں تب ہی اندرونی گیٹ دوبارہ کھلا تھا۔ وہ بہت پیاری سی بچی تھی۔ بالکل اس کا بچپن۔ وہ بھاگتی ہوئی آئی تھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تھا۔

"ممی۔۔۔! ممی! آج ادھر ہی رک جائیں۔ نانو کہہ رہی تھیں۔"

نظریں جھک گئیں۔۔۔ بیڑیاں صرف ان کے پاؤں میں نہیں تھیں، زنجیریں ادھر بھی پڑی تھیں۔ اندر دور تک جو ایک دھند سی پھیلی تھی۔ اس دھند میں راستہ واضح ہو رہا تھا۔

"تو کیا سفر تمام ہوا؟" انہوں نے خود سے پوچھا۔

"نہیں۔ سفر تو اب شروع ہوا ہے۔ پہلے بے سمت چل رہے تھے۔ اب سمت متعین ہوئی۔" ان کے اندر سے کوئی آواز اٹھی تھی۔

پر چل رہے تھے۔ وہ تو سالوں سے دوراہے پر کھڑے تھے۔ ایک راستہ اپنی طرف کھینچتا تھا، دوسرا اپنی طرف۔ جانتے تھے، ایک طرف بند گلی ہے اور دوسری طرف منزل غیر واضح اور دور۔۔۔ پھر بھی قدم بار بار بند گلی کی طرف اٹھتے تھے۔ راستہ بند پا کر پلٹتے تو پھر کوئی پیچھے سے دامن کھینچتا۔ لیکن یکدم ہی آج برسوں بعد سامنے کا راستہ روشن اور واضح ہو گیا تھا۔ انہوں نے آنکھیں بند کر کے قدم اس راستے پر رکھ دیئے آج بند گلی سے کسی نے دامن نہیں کھینچا تھا۔ وہ یکدم پلٹے اور بیرونی گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

"منصور۔۔۔! منصور پلیز، ایک منٹ رکو۔ یہ تم ہی ہو نا۔"

رابعہ کی آواز میں سسکیاں تھیں۔ آنسو تھے لیکن مولوی اللہ یار نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

"وصل تو کہیں بھی نہیں نہ اس رستے پر نہ اس رستے پر۔۔۔ بس ہجر ہی ہجر ہے، فراق ہی فراق ہے۔ تو پھر آنکھیں بند کر کے کسی ایک راہ پر کیوں نہیں چل پڑتا ہے۔ کیوں دونوں طرف بھاگتا ہے۔ ایک راہ چن لے پگلے! کیوں اوہام میں پڑتا ہے۔ حقیقت تیرے سامنے ہے اور تو وہموں میں گھرا ہے۔" جھونپڑی والے بابا نے کان میں سرگوشی کی۔

پہلے آرزو، پھر دید اور پھر ہجر ہی ہجر لا انتہا ہجر۔۔۔ فراق ہی فراق تڑپ ہی تڑپ۔

"منصور!"

رابعہ اس کی طرف لپکی۔ اس کی پکار میں درد بھی تھا اور آنسو بھی اور سالوں کی جدائی کا نوحہ بھی لیکن مولوی اللہ یار کے اندر ہجر کی جو آگ جل اٹھی تھی۔ دیدار کی جو طلب جاگ اٹھی تھی جو تڑپ تھی اس نے انہیں پیچھے مڑ کر نہ دیکھنے دیا اور وہ بیرونی بڑے گیٹ کی کھڑکی سے باہر نکل گئے۔

رابعہ کے اٹھتے قدم رک گئے۔

اس نے ایک ہاتھ کی پشت سے رخساروں پر بہتے آنسو پونچھے اور دوسرا ہاتھ تڑپتے مچلتے دل پر رکھا اور اپنے پیچھے کھڑے عبدالقادر کو دیکھا۔

"یہ کون تھا عبدالقادر؟"

"یہ مولوی صاحب تھے بی بی جی! اپنے مولوی اللہ یار۔ بڑے چوہدری صاحب نے بلایا تھا جی انہیں۔"

"مولوی اللہ یار!" رابعہ کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔

"ہاں جی، بڑے مولوی صاحب کے بھتیجے لگتے ہیں۔ جی سات آٹھ سال پہلے آئے تھے ادھر۔ تب تو دیوانے ہی لگتے تھے جی۔ سب سے پہلے میں نے ہی انہیں دیکھا تھا۔" عبدالقادر تفصیل بتانے لگا۔

"ربی! میں پاگل ہو جاؤں گا۔ مجھے لگتا ہے' میں دیوانہ ہو رہا ہوں۔۔۔ اتنی محبت میں نے اللہ سے کی ہوتی تو اسے پالیتا۔۔۔ تمہیں کھونے کا تصور ہی اتنا جان کش ہے تو تمہیں کھو کر کیا حال ہو گا میرا۔"

بہت پہلے منصور نے ایک بار کہا تھا۔

"میں تو مجنوں کی طرح لیلیٰ لیلیٰ پکارتا پھروں گا تمہیں' تم نے تو مجھے میرا اپنا بھی نہیں رہنے دیا رابعہ!"

"بڑے اللہ والے ہیں جی۔ میرا ابا بیمار ہوا تھا تو ان کی دعا سے ٹھیک ہو گیا۔" عبدالقادر مولوی اللہ یار کے متعلق بات کرتے ہوئے ہمیشہ جذباتی ہو جاتا تھا۔

"رات رات بھر گلیوں میں چکراتے پھرتے ہیں۔ لوگ تو کہتے ہیں جی۔۔۔"

اور رابعہ پوری بات سنے بغیر یکدم پلٹی۔ اسے لگا جیسے اس کا پورا وجود اس محبت کی حدت سے جل کر راکھ ہو گیا ہے۔ جس نے منصور علی خان کو مولوی اللہ یار بنا دیا تھا۔ عبدالقادر نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ لیکن وہ تیزی سے چلتی ہوئی اندرونی گیٹ کو دھکیلتی اندر چلی گئی۔

عبدالقادر سر جھٹک کر کچھ نہ سمجھتے ہوئے باہر کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

عبداللہ ملک غضنفر علی کے آفس سے باہر نکلا تو عبیر' مامون اور دانیال کو سنجیدگی سے کام کرتے پایا۔

"تو صدف آج بھی نہیں آئی؟" اس نے فائل اپنے سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" عبیر نے جو کچھ ضروری نوٹس لے رہی تھی۔ سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"وہ دراصل ابھی تک بہت اپ سیٹ ہے۔"

"نیچرل بات ہے۔" اس نے آہستگی سے کہا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور فائل کھولی۔

یہ قتل کا ایک کیس تھا۔ عابد نامی لڑکے پر الزام تھا کہ اس نے اپنے چچازاد بھائی کو قتل کر دیا ہے جبکہ عابد کے والد کا بیان تھا کہ عابد قاتل نہیں ہے اور ملک غضنفر نے اس کے کیس کی فائل عبداللہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا تھا۔

"یہ سچ ہے کہ عابد نے قتل نہیں کیا اور تمہیں اس کی بے گناہی ثابت کرنے میں اپنی صلاحیتیں آزمانی ہیں۔"

چند ضروری باتیں پوچھ کر وہ باہر آیا تھا۔ تو عبیر اور مامون بھی آچکے تھے۔ آج وہ ذرا جلدی آگیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ جلدی اٹھ بھی جائے گا کیونکہ ماسٹر شفیق کی طبیعت پچھلے چند دن

سے پھر خراب تھی اور زہرا بیگم کو گھبراہٹ ہوتی تھی۔ عبداللہ گھر پر سوتا تو انہیں تسلی رہتی تھی۔

وہ کیس اسٹڈی کرنے لگا تو مامون نے اپنے سامنے پڑے کاغذات الٹتے پلٹتے ہوئے دانیال کو مخاطب کیا۔

"یہ لوگ اتنے کمینے کیوں ہوتے ہیں دانی۔"

"بس ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے۔"

آج صدف نہیں تھی تو دانی بھی سنجیدہ تھا یا اس پر بھی صدف کی بہن کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی کا اثر تھا کہ کل سے وہ چپ چپ سا تھا۔ وہ سب لوگ صدف کے گھر گئے تھے اور صدف نے کتنے شوق اور خوشی سے دعوت دی تھی انہیں۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچے تو پتا چلا کہ کرن کے سسرال والوں نے رشتہ توڑ دیا ہے۔

"لیکن صدف! تم نے تو بتایا تھا کہ تم لوگوں نے ان کی مطلوبہ لسٹ کے مطابق جہیز دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔"

"ہاں لیکن انہوں نے کہا ہے کہ انہیں اپنے بیٹے کے لیے ایسا رشتہ مل گیا ہے جو سلامی میں ان کے بیٹے کو کار دے رہے ہیں اور۔۔۔" صدف کی آواز بھرا گئی تھی۔

"اور پہلے یہ رشتہ کہاں تھا؟" عبیر کو غصہ آ رہا تھا۔ "کس نے ان کو حق دیا تھا کہ وہ اس طرح ایک لڑکی کی بے عزتی کریں۔"

"ابا نے کہا بھی تھا کہ وہ کوشش کریں گے کہ سلامی میں گاڑی دے سکیں۔ لیکن پھر بھی انہوں نے رشتہ ختم کر دیا اور منگنی کی انگوٹھی واپس کر دی اور جو کپڑے اور انگوٹھی کرن کو دی تھی واپس لے لی۔"

"لعنت بھیجو ایسے لالچی لوگوں پر۔ کرن کبھی بھی وہاں خوش نہ رہتی۔۔۔ اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ اپنی کرن کو اس سے اچھا رشتہ مل جائے گا صدف پریشان مت ہو۔" دانیال نے اسے تسلی دی تو اس نے دانیال کی طرف دیکھا۔

"تم کیا سمجھتے ہو کہ اس کے بعد پھر کہیں سے کرن کا رشتہ آئے گا۔۔۔ نہیں۔۔۔ دانی۔۔۔ اب وہ ساری عمر میکے کی دہلیز پر ہی بیٹھی رہے گی۔ اس سے تو اچھا تھا' اس کی منگنی نہ ہوتی۔ اب تو لوگ ہزاروں باتیں کریں گے کہ آخر سسرال والوں نے کچھ دیکھا ہو گا۔۔۔ کوئی غلط بات۔۔۔ جو رشتہ توڑ دیا۔ کس نے ہماری بات پر یقین کرنا یا پوچھنا ہے۔"

وہ رونے لگی تو سب ہی اسے سمجھانے لگے تھے۔

"پلیز صدف! ٹیک اٹ ایزی۔" عبیر نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

"ریلیکس صدف! یہ زندگی ہے نا تو اس میں ایسے حادثات تو آتے ہی رہتے ہیں۔"
پھر وہ کچھ دیر بعد سنبھل گئی تھی۔ گو اس نے کھانے کا انتظام بھی کر رکھا تھا لیکن کسی سے کچھ کھایا نہ گیا۔ حالانکہ صدف کے ابا نے بہت کہا۔
"بیٹا! کھانا کھاؤ۔۔۔ ہو سکتا ہے' کرن کے حق میں اچھا ہی ہوا ہو۔۔۔ ہمارے اختیار میں جو تھا۔ ہم نے کیا اور باقی کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔"
پورے گھر میں واحد اس کے ابا ہی تھے جو راضی بہ رضا دکھائی دیتے تھے' باقی سب ہی اترے چہروں کے ساتھ پریشان تھے۔ اس کی دونوں چھوٹی بہنیں اور بھائی بھی چپ چپ تھے کرن تو سامنے ہی نہیں آئی تھی۔
کرن سب سے بڑی تھی پھر صدف تھی پھر بھائی تھا اور پھر دونوں چھوٹی بہنیں تھیں۔
وہ سارے ہی حساس تھے اور گداز دل رکھتے تھے۔ اس لیے اداس تھے اور صدف تو اس روز کے بعد سے چیمبر میں ہی نہیں آئی تھی۔
"اور کچھ لوگ اتنے کمینے کیوں ہوتے ہیں دانی۔" مامون نے جرح کی۔
"اس لیے کہ ان کی نیچر ہی ایسی ہوتی ہے۔ لالچی اور گھٹیا۔"
"تو کیا اب کرن کی کبھی شادی نہیں ہو سکے گی۔"
"پتا نہیں یار۔" دانیال اب جھنجلا گیا۔ "مجھے کام کرنے دو۔"
لیکن کچھ دیر بعد مامون نے قلم میز پر بجا کر اسے پھر اپنی طرف متوجہ کیا۔
"سنو دانیال! اگر میں کرن سے شادی کر لوں تو۔۔۔"
"کیا! تم سنجیدہ ہو مامون؟"
دانیال نے حیرت سے اسے دیکھا۔ عبیر اور عبداللہ بھی اسے ہی دیکھ رہے تھے۔
"ہاں بالکل سنجیدہ ہوں۔ کرن کافی خوش شکل لڑکی ہے۔۔۔ پڑھی لکھی بھی ہے۔ بہت کیئرنگ اور لونگ بھی ہے بقول صدف کے اور کھانے بھی اچھے پکاتی ہے تو پھر غیر سنجیدگی والی تو کوئی بات نہیں ہوئی نا۔"
عبداللہ کی آنکھوں میں تحسین تھی۔ اس نے مامون کی بات کو بہت سراہا۔
"اور وہ تمہارے ڈاکٹر والد صاحب اور والدہ صاحبہ وہ تو ضرور روڑے اٹکائیں گے۔ انہیں تو تمہارے لیے کسی ڈاکٹر لڑکی کی تلاش ہو گی اور پھر بھلا وہ ایک متوسط طبقے کی لڑکی کو کہاں قبول کریں گے۔"
"یار! میرے والد صاحب پہلے ہی مجھ سے مایوس ہو چکے ہیں اور انہوں نے اپنا دستِ شفقت اسی وقت میرے سر سے اٹھا لیا تھا جب ان کی خواہش کے برعکس میں نے ڈاکٹری کے

بجائے لاء پڑھنے کو ترجیح دی تھی اور میری والدہ اس معاملے میں بہت نائس ہیں۔"
"اور وہ کیا نام ہے۔۔۔ اس بے چاری کا کیا ہو گا نسرین کا۔۔۔"
دانیال نے ہاتھ نچاتے ہوئے معصومیت سے پوچھا تو مامون نے فائل اٹھا کر اسے ماری جسے اس نے ہاتھوں میں کیچ کرتے ہوئے بل کھا کر بہت ادا سے اسے دیکھا۔
"ہائے میں صدقے جاواں میں تے مر جاواں گی۔" اس نے تالی بجائی تو عبداللہ مسکرا کر فائل پر جھک گیا اور مامون نے جھنجلا کر کہا۔
"تم سنبھال لینا نسرین کو۔"
"سنبھالنے کو تو سنبھال لوں لیکن پھر صدف کا کیا بنے گا۔ ہر کوئی مامون تو نہیں ہوتا نا۔" اس کی نظروں میں ستائش تھی۔ وہ یکدم سنجیدہ ہو گیا۔
"تمہارے اس فیصلے سے مجھے بہت خوشی ہوئی ہے مامون! تم یقیناً" ایک اعلا ظرف شخص ہو۔"
"اب مکھن مت لگاؤ یار! شادی تو مجھے کرنا ہی تھی تو کرن سے ہی سہی۔"
"تمہارا فیصلہ بہت عمدہ ہے مامون! کرن بہت اچھی ہے اور تم کرن جیسی لڑکی کے ساتھ یقیناً" ایک کامیاب زندگی گزارو گے۔" عبیر نے بھی رائے دی۔
"میں جب بھی کرن سے ملی اس کی کسی نہ کسی خوبی نے مجھے متاثر کیا۔"
"میں فون کر کے صدف کو یہ خوشخبری سناؤں؟" دانیال نے پوچھا۔
"نہیں۔۔۔ پہلے میں مما اور پپا سے بات کر لوں۔ یوں تمہیں صدف سے بات کرنی ہے تو کسی بہانے کے بغیر بھی کر سکتے ہو۔"
مامون نے جواب دیا تو دانیال نے اسے گھور کر دیکھا اور اپنے سامنے پڑے کاغذوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ملک غضنفر علی کسی سے باتیں کرتے ہوئے باہر نکلے۔۔۔ یہ صاحب کچھ دیر پہلے ہی اندر گئے تھے اور جب عبداللہ ملک صاحب سے عابد کے کیس کی فائل لے کر باہر آ رہا تھا تو انہوں نے ملک صاحب سے پوچھا تھا۔
"یہ لڑکا کون ہے علی بھائی؟"
"عبداللہ ہے بہت اچھا لڑکا ہے' ذہین اور نیک سیرت۔"
"آپ نے غور کیا اس کی شکل کسی سے ملتی ہے؟"
"نہیں۔۔۔ لیکن اپنائیت سی محسوس ہوتی ہے اس کے لیے۔"
"ہاں' مجھے بھی ایک نظر دیکھ کر ایسا لگا جیسے میں نے پہلے بھی کہیں اسے دیکھا ہے۔ شاید کسی کے ساتھ اس کی مشابہت ہے لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا کس کے ساتھ۔"

"ہو جاتا ہے بھائی! اکثر کسی کی شکل میں کسی اور کی شباہت دکھتی ہے حالانکہ کوئی رشتہ ناتا نہیں ہوتا۔" ملک غضنفر نے بات ختم کردی تھی لیکن وہ شخص شاید ابھی الجھا ہوا تھا کہ وہ ذرا کی ذرا عبداللہ کی ٹیبل کے پاس رکا۔

"بیٹا! آپ کے والد کیا کرتے ہیں۔"

"جی ان کا تو انتقال ہو چکا ہے۔" عبداللہ نے کھڑے ہوتے ہوئے بتایا۔

"اوہ' ویری سیڈ۔ کیا نام تھا ان کا۔"

"رفیق احمد۔" عبداللہ مؤدب کھڑا تھا۔

"بیٹھو۔ بیٹھ جاؤ عبداللہ۔" ملک غضنفر نے اسے بیٹھنے کا اشارا کیا اور اپنے ساتھ والے شخص کے کندھے تھپتھپائے۔

"ہوتا ہے۔ مجھے بھی گمان گزرا تھا اور مجھے تو ہر دسویں بندے میں اس کی شباہت دکھتی ہے۔ رک جاتا ہوں' دھیان سے دیکھتا ہوں' کہیں وہ تو نہیں یا اس کا پرتو۔ میں کوئی بھولا ہوں اسے اور کون بھولا ہے اسے ہر لمحہ ہر ایک کے دل میں رہتا ہے کہنے کو پینتیس برس بیت گئے۔"

"آپ کا تو وہ بھائی تھا' میرا تو دوست تھا علی بھائی! میں ایک لمحہ نہیں بھولتا اسے' اتنا ہی پیارا تھا وہ۔ آپ کس طرح بھولیں گے اسے۔"

باتیں کرتے ہوئے وہ باہر نکل گئے۔ عبداللہ نے ان کی بات سمجھنے کی کوشش کی اور پھر نہ سمجھتے ہوئے سر جھٹک کر دوبارہ اسٹڈی کرنے لگا۔

"یہ حامد انکل ہیں ڈیڈی کے دوست۔ ہمارے ان سے فیملی ٹرمز ہیں۔" ان کے جانے کے بعد دانیال نے کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا۔

"ہاں یار! میں جانتا ہوں انہیں۔" مامون نے جواب دیا۔

"یہ وہی ہیں نا جن کا اکلوتا بیٹا ایک حادثے میں فوت ہو گیا تھا۔"

"ہاں وہی بہت نائس آدمی ہیں۔"

دانیال اٹھ کر شیلف کے پاس جا کھڑا ہوا اور کتابیں دیکھنے لگا شاید اسے کسی خاص کتاب کی تلاش تھی۔

"عبداللہ! وہ دیکھنا ذرا Pakistan penal code تمہاری ٹیبل پر تو نہیں ہے۔" وہیں شیلف کے پاس ہی کھڑے کھڑے اس نے پوچھا۔

"ہاں یہ ادھر ہے۔"

عبداللہ نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ تب ہی ملک غضنفر علی حامد صاحب کو چھوڑ کر واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں شام کا اخبار تھا جو انہوں نے منشی کی ٹیبل سے اٹھایا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ خبر دیکھی تم نے۔۔۔؟" وہ دانیال کی کرسی کھینچ کر وہاں ہی بیٹھ گیا۔

"ایسا ہی ایک اندوہناک واقعہ کچھ عرصہ پہلے ملتان کے نواح میں ہوا ہے۔ لیکن کیا ہوا۔ چند دن خبریں آئیں اور پھر بات ختم۔" عبداللہ نے ہاتھ بڑھا کر اخبار ان سے لے لیا۔

تقریباً" ویسی ہی خبر تھی۔ ملتی جلتی۔ ایک با اثر زمیندار نے اپنے علاقے کے ایک غریب مزارعے کے خاندان کی عورتوں کو پورے گاؤں میں بے لباس گھمایا۔ مزارعے نے مارے شرم کے کنویں میں چھلانگ لگا کر اپنی زندگی ختم کرلی۔ غلام دین کی ماں' بیوی' بہن اور دس سالہ بیٹی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں۔"

عبداللہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ عجیب سی وحشت میں اس نے اخبار مروڑ ڈالا' کانوں میں جیسے چیخیں گونجنے لگیں۔ مظلوم عورتوں کے بین سنائی دینے لگے۔ وہ ایک دم اٹھا اور ملک صاحب کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"سر! میں یہ کیس لڑنا چاہتا ہوں اس زمیندار کے خلاف جس نے یہ حرکت کی۔"

"لیکن عبداللہ! پہلے اس ظلم کا شکار ہونے والے کیس تو درج کروائیں۔" انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارا کیا۔

"ریلیکس عبداللہ! انہوں نے اس کی آنکھوں کو بغور دیکھا۔ جو دکھ اور غصے کی شدت سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اور پیشانی کی رگیں ابھر آئی تھیں۔

"وہ بے چاری مظلوم عورتیں جن کے گھر کا واحد مرد خودکشی کر چکا ہے' کون ان کے حق میں آواز اٹھائے گا۔ سر! میں مدعی ہوں میں دعویٰ دائر کروں گا۔"

عبیرہ نے جو اس دوران مڑا تڑا اخبار اٹھا کر اس خبر کو پڑھ رہی تھی چونک کر کہا۔

"سلطان نگر۔۔۔ ارے یہ تو ہمارا گاؤں ہے۔"

"تمہارا گاؤں؟"

اپنی بات ادھوری چھوڑ کر عبداللہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ہاں "سلطان نگر" یہ تو ہمارا ہی گاؤں ہے لیکن با اثر زمیندار کون ہو سکتا ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

"عبیرہ پلیز! یہ اگر تمہارا ہی گاؤں ہے تو تمہیں میری مدد کرنا ہے۔ اس ظلم کے خلاف میرا ساتھ دینا ہے۔" عبداللہ ملک غضنفر کے سامنے سے ہٹ کر عبیرہ کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔

"ہاں لیکن۔۔۔"

وہ الجھ گئی تھی۔ اس کے تایا اور بابا جان کے علاوہ اور کون ہے وہاں با اثر چوہدری نثار' پھپھو جانی کے جیٹھ۔ مگر وہ تو بہت نیک اور پرہیزگار آدمی ہیں اور پھپھو کے سسر بھی اسی طرح کے ہیں تو پھر کیا تایا جان۔۔۔

"نہیں۔۔۔" اس نے خود ہی تردید کی اور گھبرا کر عبداللہ کی طرف دیکھا۔

"تم کل ہی چلو پلیز میرے ساتھ اپنے گاؤں' ان عورتوں سے ملو' ان کو مجبور کرو کہ وہ مجرموں کے خلاف ایف۔ آر۔ آئی کٹوائیں۔ میں ان کا مقدمہ لڑوں گا۔ میں سزا دلواؤں گا مجرموں کو۔"

"اوکے۔ اوکے عبداللہ ریلیکس! ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔" دانیال نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"کیوں عبیر؟"

"ہاں بالکل ہم سب تمہارے ساتھ ہیں عبداللہ۔ ہم سب اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائیں گے۔"

عبیر نے سر اٹھا کر بہت اعتماد سے کہا تو عبداللہ کے اکڑے ہوئے اعصاب ڈھیلے ہوئے اس نے مڑ کر ملک غضنفر علی کی طرف دیکھا جو اس کی ایک ایک حرکت کو بغور دیکھ رہے تھے۔ اس کا اضطراب اس کی بے چینی اور تڑپ۔

"سر! قانون عورت کی اس طرح بے حرمتی کرنے والوں کے لیے کیا سزا تجویز کرتا ہے۔"

"میرے ساتھ آؤ عبداللہ!"

کسی گہری سوچ میں ڈوبے انہوں نے عبداللہ کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اپنے آفس کا دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔۔۔ عبداللہ نے ایک نظر مامون اور دانیال پر ڈالی اور ان کے پیچھے ان کے آفس میں چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

عبداللہ نے دو جوڑے کپڑے بیگ میں رکھے اور زپ بند کرتے ہوئے زہرا بیگم کی طرف دیکھا جو قریب ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔

"ہو سکتا ہے امی جان! مجھے دو تین دن لگ جائیں۔ آپ پریشان مت ہوئیے گا۔"

"بس بیٹا! تم فون کر دینا وہاں جا کر' فکر رہے گی۔"

"جی امی جان!"

"لیکن بیٹا! تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم کیوں جا رہے ہو۔"

"یونہی امی جان! اچانک پروگرام بن گیا۔ عبیر اور اس کے بابا جان بہت دنوں سے کہہ رہے تھے اپنے گاؤں جانے کا۔ میرے ساتھ مامون وغیرہ بھی ہیں' ہم عبیر کی گاڑی میں ہی جا رہے ہیں۔" عبداللہ نے اصل بات بتانی مناسب نہ سمجھی۔

عبیر کے نام پر انعم نے جو زہرا بیگم کے پاس ہی بیٹھی دوپٹے کو لیس لگا رہی تھی چونک کر عبداللہ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔

"کیا عبداللہ عبیر کو واقعی پسند کرتا ہے؟"

اس کے دل میں جیسے کسی نے چٹکی سی لی۔ اس شخص کو کھو دینے کا احساس کس قدر جان لیوا تھا۔

اور یہ اباجان کی خواہش تھی نا کہ میں اور عبداللہ۔ ضروری تو نہیں کہ عبداللہ بھی ایسے ہی سوچتا ہو اور عبیر۔۔۔ عبیر تو واقعی چاہے جانے کے قابل ہے۔ عبیر کو دیکھ کر تو وہ خود بھی ایک لمحے کو مبہوت رہ گئی تھی۔ کومل نے جو کچھ عبیر کے متعلق بتایا تھا وہ صحیح تھا۔ دھیمے دھیمے لہجے میں باتیں کرتی سفید لباس میں وہ صبح کی کرن کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ اور صدف اچانک ہی ماسٹر شفیق احمد کی مزاج پرسی کے لیے آ گئی تھیں۔

"عبداللہ نے کئی بار بتایا کہ چچا جان بیمار ہیں' ہم لوگ حاضر ہی نہ ہو سکے۔"

اپنے ساتھ لائے پھل اور پھول ٹیبل پر رکھتے ہوئے عبیر نے کہا تو انعم چونکی تھی۔

"ارے آپ پہلے کبھی کیوں نہیں آئیں ہمارے گھر۔" ثمین کو بھی وہ اچھی لگی تھی۔

"یہ آپ کی آمد کا اعجاز ہے عبیر باجی کہ ثمو آپی بھی اپنے حجرے سے باہر نکلی ہیں۔ ورنہ یہ تو ہر وقت کتابوں میں گھسی رہتی ہیں۔ ڈاکٹر بننا ہے انہیں۔" کومل چہکی تھی اسے عبیر کے آنے کی بے حد خوشی تھی۔

"اچھا؟" عبیر نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ "ڈاکٹر بننے کے لیے محنت تو کرنا پڑتی ہے۔"

"ہاں' لیکن ثمو آپی تو اب بالکل ہی ٹائم نہیں دیتیں۔ اتنے دن ہو گئے میرے ساتھ نہ لڈو کھیلیں نہ کارڈز۔" کومل نے برا سا منہ بنایا۔ تو عبیر نے ہنستے ہوئے ثمن سے کہا۔

"یہ تو بہت بری بات ہے۔ تم ہماری گڑیا کو ٹائم دیا کرو۔"

سب کو ہی عبیر اور صدف اچھی لگی تھیں اور سب نے گلہ کیا تھا کہ وہ اس سے پہلے کبھی یوں ان کے گھر نہیں آئیں ماسٹر شفیق احمد نے بھی تبصرہ کیا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے عبداللہ کے دوست بھی اچھے ہیں سب۔ نیک اور نجیب' اچھی سیرت اور اچھے اخلاق والے۔ یہ بھی اللہ کا کرم ہے ہم پر۔"

ایک انعم تھی جس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ اسے بھی عبیر اچھی تو بہت لگی تھی لیکن دل میں کہیں ایک کانٹا سا چبھ گیا تھا۔ عبیر ایسی تھی کہ اس سے محبت ہو جانا کوئی انوکھی بات نہ ہوتی پھر چار سالوں کا ساتھ' انڈر اسٹینڈنگ۔۔۔ اور پھر عبداللہ کا ذکر کرتے ہوئے عبیر کی آنکھوں میں جو رنگ جھلملاتے تھے' وہ عبیر کے دل میں عبداللہ کی اہمیت اور مقام کی خبر دیتے تھے۔

"اچھا امی جان! میں چلتا ہوں۔ ابا جان کمرے میں ہی ہوں گے۔"

"ہاں' اسکول سے آکر لیٹ گئے تھے۔ کہا بھی تھا ریٹائرمنٹ لے لیں یا کم از کم ایک ماہ کی چھٹی کرلیں۔۔۔ لیکن وہ کہاں سنتے ہیں کسی کی۔" زہرا بیگم بڑبڑائیں۔

"کہتے ہیں گھر بیٹھ رہنے سے تو میں اور بیمار ہو جاؤں گا۔ اس طرح دل بہلا رہتا ہے۔"

"ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ کام کرنے والے آدمی کے لیے گھر بیٹھنا مشکل ہوتا ہے اور پھر ڈاکٹر بھی یہی کہہ رہا تھا کہ اس بار تو ان کو جو تکلیف ہوئی ہے اس کی وجہ ٹینشن ہے۔" عبداللہ نے جھک کر بیگ اٹھایا۔

"لیکن بیٹا! بظاہر تو کوئی ٹینشن نہیں ہے۔ اللہ کا شکر ہے سب ٹھیک ہے۔"

"ہو سکتا ہے کوئی اسکول کا پرابلم ہو۔" عبداللہ نے خیال ظاہر کیا۔

"یہ گورنمنٹ اداروں میں اکثر گھپلے ہوتے رہتے ہیں اور پھر حسد' دشمنی۔ ہو سکتا ہے کسی کولیگ سے بات ہو گئی ہو کوئی۔ بہرحال میں آکر تفصیل سے بات کروں گا ان سے۔"

"ہاں بیٹا! ضرور کرنا' ہر وقت لیٹے چپ کیا سوچتے رہتے ہیں۔ اور پھر تم سے کیا چھپائیں گے

"جی امی جان خدا حافظ۔۔۔ اور ہاں انعم! وہ میری ڈائری میں عبیر کا موبائل نمبر ہے اگر کوئی ایمرجنسی ہو جائے تو کال کرلینا۔"

"کیا زیادہ دن رکیں گے؟" بے اختیار انعم کے لبوں سے نکلا۔

"ارادہ تو نہیں لیکن ہو بھی سکتا ہے۔ اتنے عرصہ سے عبیر کے بابا جان کہہ رہے تھے کہ ان کے گاؤں آئیں ہم لوگ۔ اور اب جب اتفاقاً جا رہے ہیں تو عبیر کے خیال میں اس کے بابا جان ہمیں اتنی جلدی نہیں آنے دیں گے۔"

اور یہ حقیقت تھی۔ ارادہ تو صرف عبداللہ کے جانے کا تھا لیکن عبیر نے سب کو دعوت دے دی تھی۔

"اسی بہانے آپ لوگ بھی میرا گاؤں دیکھ لیں گے یوں بھی بابا جان کہتے رہتے ہیں۔ ان کا اپنا فش فارم ہے اور پھر ملتان سائیڈ پر آم کے باغات ہیں۔ آموں کا موسم ہے۔۔۔ آم بھی آئے ہوں گے۔ تیتر اور ہرن وغیرہ کا شکار بھی ملتا ہے۔" سو سب ہی تیار ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر احسان کا بھی فون نمبر لکھا ہے ڈائری میں اگر اچانک چچا جان کی طبیعت خراب ہو جائے تو فون کر دینا وہ گھر آجائیں گے۔ ڈائری میرے کمرے میں ٹیبل پر پڑی ہے۔"

"کتنا خیال ہے اسے ہر بات کا۔" زہرا بیگم نے سوچا۔

"اپنا بیٹا بھی ہوتا تو کیا خبر کیسا ہوتا۔ شاید خدا نے اس یتیم بچے کو پالنے کا صلہ دیا ہے۔ اتنی محبت' اتنا خیال کرتا ہے یہ۔ کبھی ایک لمحہ کو محسوس نہیں ہوتا کہ اسے میں نے جنم نہیں دیا۔"

ان کی آنکھیں نم ہوئیں تو عبداللہ نے بیگ رکھ کر ان کے قریب بیٹھتے ہوئے ان کا ہاتھ تھام لیا۔۔۔ اور آنکھوں سے لگا کر چوما۔

"آپ رو رہی ہیں امی جان! میں کوئی مہینوں کے لیے تو نہیں جا رہا بس چند دن کی بات ہے۔"

"بس یونہی آنسو آگئے آنکھوں میں۔ پہلی بار اتنے دنوں کے لیے جا رہے ہو نا۔"

وہ انہیں حوصلہ اور تسلی دیتا ہوا بیگ اٹھا کر باہر نکل آیا۔

"امی جان سے چند دن کی جدائی برداشت نہیں ہو رہی اور اگر لمبی جدائی برداشت کرنا پڑی تو کیا کریں گی وہ۔ ظاہر ہے عبیر سے شادی کر کے وہ یہاں تو نہیں رہے گا اس پرانے محلے کے قدیم مکان میں۔"

انعم نے تلخی سے سوچا اور آنکھوں میں آئے آنسوؤں سے چھپانے کے لیے جلدی سے منہ موڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور باہر برآمدے میں رک کر ماسٹر شفیق احمد کے کمرے کی طرف دیکھا۔ عبداللہ ابھی ان کی طرف گیا تھا وہ وہیں برآمدے میں ہی ٹھہر گئی۔

ماسٹر شفیق احمد جو آنکھیں موندے لیٹے تھے' اس کے بلانے پر چونک کر اٹھ بیٹھے۔

"آپ لیٹے رہیں چچا جان! میں آپ کو خدا حافظ کہنے آیا تھا۔" عبداللہ نے انہیں اٹھنے سے منع کیا۔

"کہیں جا رہے ہو کیا؟"

"جی رات آپ کو بتایا تھا نا چچا جان! میں سلطان نگر جا رہا ہوں۔"

"سلطان نگر مگر کیوں۔ کیوں جا رہے ہو وہاں؟" ماسٹر شفیق احمد نے بے حد مضطرب ہو کر پوچھا۔

"شاید آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ رات آپ کو بتایا تو تھا کہ ہم سب عبیر کے گاؤں جا رہے ہیں۔"

"ہاں۔ ہاں یاد آگیا رات تم نے ذکر کیا تھا اور یہ عبیر کا گاؤں کہاں ہے۔" انہوں نے کسی قدر پرسکون ہوتے ہوئے پوچھا۔

"یہ جھنگ سائیڈ پر ہی ہے کہیں۔"

"جھنگ سائیڈ پر۔" ان کے اندر پھر جیسے کسی اضطراب نے کروٹ لی تھی۔

"یہاں سے اتنی دور ہے اور یہ عبیر لوگ یہاں رہتے ہیں۔"

"ایکچوئلی اس کے بابا جان کا یہاں بزنس ہے۔ ان کا آفس بھی اسلام آباد میں ہے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا کام بھی ہے۔"

"کیا زمیندار نہیں ہیں وہ۔"

"زمینیں بھی ہیں لیکن عبیو کے بابا جان کو زمین داری سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ وہ بہت شروع سے ہی اسلام آباد میں سیٹل ہو گئے تھے۔"

"اچھا خیر۔" انہوں نے خود کو سنبھالا

"کب تک لوٹو گے؟"

"جلد ہی آجاؤں گا' آپ فکر مت کیجیے گا اور مجھے ایک کام بھی تھا تفصیل آکر بتاؤں گا۔"

"مگر بیٹا! تم لوگوں کو صبح سویرے روانہ ہونا چاہیے تھا۔"

"بس چچا جان! آج ایک کیس کے سلسلے میں کورٹ میں گواہ پیش کرنے تھے سو تاخیر ہو گئی۔ یوں بھی گرمی ہے شام کا سفر اچھا رہے گا۔ آپ کے متعلق میں نے انعم کو سمجھا دیا ہے۔ ذرا سی بھی طبیعت میں گرانی محسوس ہو تو انعم سے کہہ کر ڈاکٹر احسان کو بلا لیجیے گا۔"

ماسٹر شفیق احمد نے محبت سے اسے دیکھا۔

"ٹھیک ہے جاؤ بیٹا! اپنا خیال رکھنا اور اپنے پہنچنے کی اطلاع ضرور دینا۔" انہوں نے اٹھ کر اسے گلے لگایا۔

"آپ فضول باتیں سوچ سوچ کر اپنا دماغ مت تھکایا کریں۔ میں ہوں نا آپ کا بیٹا۔ جو بھی مسئلہ آپ کو پریشان کر رہا ہے مجھ سے شیئر کریں۔ اور میں واپس آکر آپ سے بات کروں گا اور آپ مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپائیں گے۔ میں جانتا ہوں کوئی بات آپ کو پریشان کر رہی ہے۔ ہیں نا۔"

"تمہارے جیسے بیٹے کے ہوتے ہوئے مجھے بھلا کیا پریشانی ہو سکتی ہے بیٹا۔۔۔! اور جو بھی پریشانی ہو گی' وہ تم سے نہیں کہوں گا تو کس سے کہوں گا۔ تم تو میرا مان ہو میری جان ہو۔"

"او کے پھر آکر بات ہو گی۔"

"اللہ حافظ بیٹا۔"

عبداللہ بیگ اٹھائے باہر آیا تو برآمدے میں کھڑی انعم کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"تم یہاں کیوں کھڑی ہو انعم؟"

"یوں ہی۔"

انعم نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں اور پھر جھکا لیں۔ عبداللہ نے بغور اسے دیکھا اس کے چہرے پر وہ پہلے جیسی بشاشت نہ تھی۔ کوئی حزن تھا جو پورے وجود پر پھیلا محسوس ہوتا تھا۔ ورنہ پہلے تو وہ بہت پر سکون اور خوش رہا کرتی تھی۔

"کیا گھر میں کوئی بات ہوئی ہے۔ جس سے وہ بے خبر ہے۔" عبداللہ نے سوچا۔

"چچا جان بھی پریشان سے لگتے ہیں گو اپنی پریشانی چھپاتے ہیں اور انعم بھی اپ سیٹ سی لگتی ہے۔ میں ان دنوں مصروف بھی تو بہت ہو گیا ہوں۔ کہیں انعم کی شادی وغیرہ کا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ممکن ہے امی جان اور چچا جان انعم کی شادی کرنا چاہتے ہوں اور وہ ابھی پڑھنا چاہتی ہو۔"

"انعم! تم کچھ پریشان لگتی ہو۔"

"نہیں تو۔" انعم نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"میں یونہی کھڑی ہو گئی تھی کہ آپ ابا جان سے مل کر آئیں تو گیٹ بند کر دوں۔"

"میں یہاں کھڑے ہونے کا سبب نہیں پوچھ رہا۔ انعم! میں پوچھ رہا ہوں تمہیں کیا پریشانی ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" اس نے پلکیں جھپکیں۔

"کیا بات ہے انو۔" عبداللہ دل گرفتہ ہو گیا۔ "سب لوگ اب مجھ سے اپنی باتیں چھپانے لگے ہیں۔ انو! میں وہی عبداللہ ہوں۔۔۔۔ جس سے تم اپنی ہر بات کہہ دیا کرتی تھیں اور چچا جان بھی اپنی ہر بات مجھے بتاتے تھے حالانکہ تب میں چھوٹا تھا ان کی پریشانی دور بھی نہیں کر سکتا تھا اور اب جب میں اس قابل ہوں کہ ان کی پریشانی کا بوجھ اٹھا سکوں تو وہ کچھ کہہ نہیں رہے۔"

"ہاں' ابا جان تو واقعی پریشان لگتے ہیں۔ امی جان بھی کتنی بار پوچھ چکی ہیں ان سے۔ لیکن میں تو پریشان نہیں ہوں۔"

"انو! اب تم مجھ سے جھوٹ بھی بولنے لگی ہو۔" عبداللہ نے شکوہ کیا۔

"میں آپ سے کیا کہوں عبداللہ کہ میرے دل نے آپ کی چاہ کر ڈالی ہے انجانے میں اور یہ کوئی کہنے والی بات تو نہیں ہے۔ میں تو خود اپنی نظروں میں گر جاؤں گی۔ کاش عبیو آپ کی زندگی میں نہ آئی ہوتی عبداللہ اور اگر آئی تھی تو میں نے آپ کی ہمسفری کے خواب نہ بنے ہوتے۔"

"تم خاموش کیوں ہو انعم! کیا سوچنے لگی ہو۔"

"میں سوچ رہی تھی کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ کوئی اور بات نہیں ہے بس ابا جان کی بیماری اور پریشانی سے کبھی اپ سیٹ ہو جاتی ہوں۔"

"اگر صرف اتنی سی بات ہے تو ڈونٹ وری۔ میں خود سوچ رہا ہوں کہ آکر انہیں کسی بہت اچھے اسپیشلسٹ کے پاس لے جاؤں گا۔ او کے۔ اب پریشان مت ہونا اور چچا جان کا بہت خیال رکھنا۔"

انعم نے سر ہلا دیا اور اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی گیٹ تک آئی۔

"اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ انعم اور سنو' میرے لیے دعا کرنا بہت زیادہ کہ میں جس مقصد کے لیے جارہا ہوں خدا مجھے اس میں کامیاب کرے۔"

"کیسا مقصد؟" انعم نے بے اختیار پوچھا۔

"ہے ایک مقصد انو۔۔۔! مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے یہ میرے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ مجھے تمہاری دعاؤں کی بہت ضرورت ہے انعم! بہت دعا کرنا۔"

وہ تاکید کرتا ہوا چلا گیا تو انعم گیٹ بند کرکے وہیں گیٹ سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی اور آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر رخساروں پر پھسل آئے۔

"تو۔۔۔ تو میرا اندازہ صحیح تھا۔ عبداللہ سلطان نگر صرف اور صرف عبیر کے بابا جان سے ملنے جارہا ہے اور اس کا مقصد عبیر کو پانا ہے۔

ہاں عبیر ایسی ہے کہ اس کے ساتھ زندگی گزارنے کی آرزو کی جاسکتی ہے۔ اور عبیر اور عبداللہ۔۔۔ عبداللہ اور عبیر تو ایک دوسرے کے لیے ہی بنائے گئے ہیں کومل نے یہی کہا تھا نا پھر میں۔۔۔ میرے دل میں کیوں عبداللہ کی محبت پیدا ہوئی۔ کیوں میں نے اس کے سنگ زندگی گزارنے کے خواب دیکھ ڈالے۔

"ربا! میرے دل سے عبداللہ کا خیال نکال دے۔ اور عبیر اور عبداللہ کا ساتھ دائمی کردے اور عبداللہ کو اس کے مقصد میں کامیاب کر۔"

اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ رکے ہوئے آنسو پھر بہہ نکلے۔

"محبت تو محبوب کی خوشی کا نام ہے۔ اس کی رضا پر راضی ہونے اور اس کی خوشی پر خوش ہونے کا۔" اس نے اپنے آپ سے کہا اور بے آواز دعا کی۔

"ربا! مجھے حوصلہ دے اور میرا ظرف بڑا کر تاکہ میں عبداللہ کی خوشی پر سچے دل سے خوش ہو سکوں۔"

"انعم! کہاں رہ گئی ہو۔ اپنے ابا جان کے لیے ایک کپ چائے بنادو۔" زہرہ بیگم نے برآمدے میں کھڑے ہو کر آواز دی تو اس نے جلدی سے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے اور صحن پار کرکے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

✲ ✲ ✲
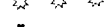
کئی دنوں سے مولوی اللہ یار پر بے خودی سی طاری تھی۔ ان کی آنکھیں یوں دمکتیں جیسے کسی منزل کو پالینے کی خوشی روشنی بن کر آنکھوں میں کوند گئی ہو۔ بیٹھے بیٹھے کبھی مسکرانے لگتے۔ کبھی آنکھیں نم ہوجاتیں۔ کبھی خدیجہ کا ہاتھ تھام لیتے۔

"خدیجہ! بند گلی کھل گئی ہے۔ منزل سامنے دکھتی ہے۔۔۔ لیکن راستے میں ظالم سراب ہیں۔" پھر وہ اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے رو پڑتے۔

"جانا تو اسی سمت ہے خدیجہ! حقیقت تو بس وہی ایک ہے۔ باقی سب وہم ہے۔"

پھر وہ بے خود سے ہوجاتے جیسے اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہوں۔ نہ تو دکان پر جارہے تھے اور نہ ہی مسجد۔ خدیجہ گھبرا کر مولوی ہدایت اللہ کو بلا لائی تھی۔

مولوی ہدایت اللہ نے ان کو دیکھا اور بیٹی کو پکڑ کر ایک سمت لے گئے۔

"بیٹی! اس کو تنگ نہ کرنا۔ وہ اس بے خودی سے خود ہی پلٹے گا۔ تم نے کرید کی یا تنگ کیا تو ہمیشہ کے لیے کھو دو گی اسے۔"

اور مولوی ہدایت اللہ خود مسجد جانے لگے۔

آج کل بڑے مولوی صاحب نماز پڑھا رہے ہیں۔ گاؤں میں سب کو پتا تھا۔ چھوٹے مولوی صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ چوہدری نیاز نے سنا تو عبدالقادر کے ہاتھ پر اپنی مخصوص اسٹک مار کر ہنسے۔ وہی ہنسی کہ عبدالقادر کو لگا جیسے دیر تک کنستر میں روڑے لڑھکتے رہے ہوں۔

"تیرا مولوی تو کچھ زیادہ ہی ڈر گیا ہے عبدالقادر! لگتا ہے سمجھ لگ گئی ہے اسے۔ پر اسے کہہ' زیادہ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ گھر میں چھپ کر مت بیٹھے۔ بس زبان سوچ سمجھ کر کھولا کرے۔"

"جی چوہدری جی۔" عبدالقادر ہاتھ سہلا رہا تھا۔

چوہدری نیاز آگے پیچھے ہوتے ہوئے ہنس رہے تھے۔ عبدالقادر کئی بار مولوی اللہ یار کے پاس گیا تھا لیکن انہوں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔

"مولوی جی!" عبدالقادر ان کا ہاتھ تھام کر انہیں مخاطب کرتا۔

"مولوی جی! آپ یہاں سے چلے جاؤ' یہ آپ کے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ سچے اور کھرے لوگوں کو یہاں جینے نہیں دیا جاتا۔ یہاں تو کتا بن کر رہنا پڑتا ہے۔ لات کھا کر بھی دُم ہلاتے رہو۔"

اور مولوی اللہ یار خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھتے۔

"عبدالقادر! تو ہی بتا اگر ساری عمر کوئی بے سمت چلتا رہے۔۔۔ اور پھر اچانک اسے اصل سمت نظر آجائے تو وہ کیا کرے۔؟"

"رخ بدل کر اصل سمت چل پڑے مولوی جی۔"

"لیکن اتنی عمر بے سمت چلنے کے بعد عبدالقادر۔۔۔؟ اتنی عمر گنوا کر عبدالقادر؟"

"جو عمر باقی ہے مولوی جی! اس عمر میں تو صحیح سمت چلنا چاہیے نا پھر۔"

"پر تھوڑے وقت میں تو منزل تک نہیں پہنچا جاسکے گا۔"
"منزل تو دونوں طرح ہی نہیں ملنی مولوی جی! نہ غلط سمت چلنے سے نہ صحیح سمت لیکن کم از کم یہ اطمینان تو ہو گا نا مولوی جی کہ صحیح سمت چل رہے ہیں۔"
اور مولوی اللہ یار کی آنکھیں چمکنے لگتیں۔
"عبدالقادر! تو تو بڑا سیانا ہو گیا ہے۔"
"آپ کا ہی فیض ہے جو عبدالقادر کو بھی کچھ سمجھ لگ گئی ہے اور بولنا آگیا ہے۔۔۔ ورنہ وہ تو دو دونی چار سے آگے کچھ نہیں جانتا تھا۔ نماز بھی آپ نے ہی سکھائی مولوی جی اور قرآن بھی۔۔۔"
"نماز پڑھتا ہے نا۔؟"
"جی مولوی جی! پانچوں وقت۔"
اور وہ اٹھ کر وضو کرنے لگتے۔ اور نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے۔
"مولوی جی! آپ نے ابھی تو ظہر کی نماز پڑھی ہے۔"
"اچھا!"
وہ عبدالقادر کے پاس آکر بیٹھ جاتے اور تھوڑی دیر بعد پھر نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے۔
"ظہر کی نماز پڑھ لوں عبدالقادر۔"
اور عبدالقادر حیران ہوتا کہ یہ یکایک مولوی صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔ بھلے چنگے تھے اور چوہدری نیاز نے بھی تو بس ڈانٹا ڈپٹا ہی تھا۔ پھر اچانک یہ مولوی صاحب کو کیا ہو گیا ہے جی۔"
وہ مولوی ہدایت اللہ سے پوچھتا تو وہ ڈانٹ دیتے۔
"جس بات کو نہیں جانتا' اس کی کرید نہ کر اور انہیں تنگ نہ کیا کر۔"
لیکن وہ پھر بھاگ بھاگ کر جاتا اور مولوی اللہ یار اسی کیفیت میں ملتے۔ ایک ایک نماز کئی کئی بار پڑھتے۔۔۔ حالانکہ وہ پہچانتے تھے سب کو۔
"عبدالقادر! بتا یہ انسان اتنا ظالم اور جاہل کیوں ہے کہ ایک عمر بے سمت چلنے میں گنوا دیتا ہے۔ اس کے خمیر میں جو عشق کی مشک چھپی ہے وہ اسے اوہام پر لٹا دیتا ہے۔ اسے عقل کیوں نہیں ہے؟"
وہ کئی کئی بار کے کیے ہوئے سوال کیے جاتے۔ یہ بے خودی کئی ہفتے طاری رہی۔
اس دوران رابعہ بی بی بھی دو بار آئیں۔ ایک بار عبدالقادر کے ساتھ۔ ایک بار اکیلے۔ اس روز چوہدری نیاز لاہور گئے ہوئے تھے اور رابعہ بی بی صبح ہی حویلی آگئی تھیں۔ اور کچھ دیر بعد ہی انہوں نے عبدالقادر کو بلوایا تھا۔

"اس دن تم کیا کہہ رہے تھے کہ مولوی اللہ یار بڑے اللہ والے ہیں۔"
"جی بی بی جی! بڑا اثر ہے ان کی زبان میں۔"
"میں بھی دعا کروانا چاہتی ہوں ان سے' میرا دل بہت گھبراتا ہے۔۔۔ بہت گھبراہٹ ہوتی ہے' سانس رکتا ہے۔"
اور عبدالقادر نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔
"آپ تو بہت پڑھی لکھی ہو بی بی جی! اور پڑھے لکھے لوگ تو ان باتوں پر یقین نہیں رکھتے۔"
"پڑھے لکھے بھی جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں تو اسی کے در پر جاتے ہیں' اسی کے سامنے جھکتے ہیں اور نیک لوگوں کی دعا میں اثر ہوتا ہے۔ کیا خبر مولوی جی کی دعا سے یہ گھبراہٹ دور ہو جائے۔"
جب رابعہ بی بی عبدالقادر کے ساتھ مولوی جی کے پاس گئیں تو انہوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ کسی اور ہی کیفیت میں تھے۔ عبدالقادر سے بھی بات نہیں کی۔ بس بار بار وضو کرتے اور نماز کے لیے کھڑے ہوتے۔۔۔ پھر نماز پڑھتے پڑھتے بے خود ہو جاتے پھر اٹھتے پھر وضو کرتے اور نماز کی نیت باندھ لیتے۔ دارا نے بتایا صبح سے یہی کیفیت ہے۔ کئی بار سجدے میں سر رکھے تو روتے چلے جاتے۔ رابعہ بی بی کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئیں۔
دوسری بار وہ اکیلی آئی تھیں۔ مولوی اللہ یار اپنے گھر کے صحن میں بیٹھے تھے۔ اور زمین پر لکیریں کھینچ رہے تھے۔ کھلے دروازے سے رابعہ بی بی سیدھی اندر آگئی تھیں اور ان کے سامنے ہی زمین پر بیٹھ گئی تھیں۔
"منصور! ادھر دیکھو' یہ میں ہوں رابعہ۔ رابی۔"
مولوی اللہ یار نے نگاہیں اٹھائیں اور پھر جھکا لیں۔
"کیسی ہو رابی؟"
"تم۔ تم نے مجھے پہچان لیا منصور۔" رابعہ کی آواز کپکپا رہی تھی۔
"تم کہاں تھے؟ کہاں چلے گئے تھے منصور! میں ایک بار گئی تھی اسلام آباد۔۔۔ وہاں حامد سے معلوم ہوا کہ تم گھر چھوڑ کر چلے گئے ہو۔ تمہاری ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اسی کیفیت میں ایک دن گھر سے نکل گئے۔ میں شرمندہ ہوں۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں منصور! میری وجہ سے۔۔۔ میں سمجھتی تھی۔ میں بابا جان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ انہوں نے میری ہر خواہش پوری کی ہے تو وہ۔۔۔ انکار نہیں کریں گے۔ لیکن انہوں نے تمہارے ممی ڈیڈی کو انکار کر دیا اور میں کچھ بھی نہ کر سکی۔۔۔ مجھے معاف کر دو منصور! میری وجہ سے تمہیں تکلیف ہوئی۔ کاش میں ابتدا ہی میں خود کو سمجھا لیتی۔۔۔ اتنا آگے نہ بڑھتی تو۔ مگر محبت۔۔۔ محبت پر کس کا اختیار ہوتا ہے

منصور! یہ تو خود بخود کسی صبح کو اچانک کسی ننھی کونپل کی طرح پھوٹ پڑتی ہے اور پھر کشورِ دل کی ہر فصیل پر ہر کونے پر کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ کلیاں چٹکنے اور پھول کھلنے لگتے ہیں۔ مانی! مجھے معاف کر دو، پلیز مانی!"

"تم کس بات کی معافی مانگ رہی ہو رابی! جذبے تو اس کی طرف سے ودیعت ہوتے ہیں اور فیصلے بھی اسی کے ہوتے ہیں سارے۔ وہ ہی ہمارے لیے راہیں منتخب کرتا ہے۔ اس نے ہی میرے اور تمہارے لیے راہیں متعیّن کیں۔ اس نے جو چاہا وہی ہوا۔ ہم نے جو چاہا' وہ بے ثمر ٹھہرا کہ اسے ہی منظور نہ تھا سب۔"

"مگر کیوں ۔۔۔ کیوں مانی! ہمارے جذبے تو سچے تھے۔ ان میں تو کوئی کھوٹ نہ تھا۔ پھر ۔۔۔"

"اس کی باتیں وہی جانتا ہے رابی! اس نے جو کیا بہتر کیا۔ تم اب جاؤ اور ۔۔۔ اور آئندہ مت آنا رابی!"

"منصور! تم اب مجھ سے محبت نہیں کرتے کیا ۔۔۔؟"

مولوی اللہ یار نے نگاہیں اٹھائیں۔ لال سُرخ آنکھیں ۔۔۔ خون برساتی اور پھر نگاہیں جھکالیں۔

"تم اب کسی کی بیوی اور کسی کی ماں ہو اور اسے کہیں بھی بے ایمانی پسند نہیں ہے ۔۔۔ جو راہ چلو اس پر ایمانداری سے چلو۔"

"لیکن میں ۔۔۔ میں کیا کروں منصور؟" رابعہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر بلک پڑیں۔

"تمہارا خیال دامنِ دل سے یوں لپٹا ہے کہ کسی لمحہ محو نہیں ہوتا ہے۔ میں تو خائن ہوں منصور! من میں تمہاری مورت چھپی ہے اور تن کسی اور کا ہے۔ گھبراہٹ ہوتی ہے۔ مریض ہو گئی ہوں۔ کسی ڈاکٹر کے پاس میری دوا نہیں ہے۔"

وہ روتی رہیں اور مولوی اللہ یار سر جھکائے بیٹھے رہے۔ ان کا وجود آگ کی طرح تپ رہا تھا اور چہرہ بھی تپ کر تانبے جیسا ہو رہا تھا اور آنکھوں سے جیسے آگ نکل رہی تھی۔

"گاؤں والے کہتے ہیں، تم اللہ والے ہو گئے ہو۔ تمہاری دعاؤں میں تاثیر ہے۔ میرے لیے بھی دعا کرو منصور! میں تمہیں بھول جاؤں ۔۔۔ تمہارا خیال تک نہ آئے مجھے۔ میرے سکون کے لیے دعا کرو منصور!"

"خدیجہ!" بڑی دیر بعد مولوی اللہ یار نے آواز دی تھی۔

"خدیجہ! پانی پلاؤ بی بی کو۔"

خدیجہ دوپٹہ لپیٹے اندر سے پانی کا گلاس لے کر آئی اور مولوی اللہ یار نے گلاس لے کر انہیں پکڑا دیا۔

"پی لو رابعہ!"

رابعہ نے چادر کے پلو سے چہرہ صاف کیا اور گلاس منہ سے لگالیا۔ خدیجہ حیرت سے انہیں دیکھتی واپس کمرے میں چلی گئی۔

"یہ کون تھی؟" گلاس خالی کر کے انہوں نے نیچے رکھا۔

"خدیجہ تھی، میری بیوی ہے۔" مولوی اللہ یار نے آہستگی سے کہا۔

رابعہ ایک ٹک انہیں دیکھے گئیں اور پھر کھڑی ہو گئیں۔

"اچھا میں چلتی ہوں اب ۔۔۔ لیکن تمہیں اس حال میں دیکھ کر میرا دل دُکھا ہے، بہت ۔۔۔"

"یہ حال۔" انہوں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ "یہ تو اچھا ہے۔"

"تم تو سچ مچ اللہ والے ہو گئے ہو۔ پانی پیتے ہی میری گھبراہٹ کم ہو گئی ہے۔" رابعہ نے کہا تو وہ مسکرا دیے۔

"میں تو ابھی سفر میں ہوں۔ پتا نہیں وہ مجھے قبول کر لے گا یا ٹھکرا دے گا رابعہ! لیکن میں اس سمت چل تو پڑا ہوں اور عبدالقادر کہتا ہے منزل نہ ملے تو بھی سمت صحیح ہونی چاہیے۔ ایک عمر بے سمت چلا ہوں۔ ابھی نہ جانے کتنے امتحان اور کتنی آزمائشیں ہیں۔ میں تو بیچ راہ میں کھڑا ہوں۔"

لیکن رابعہ کو یقین تھا کہ اللہ نے انہیں قبول کر لیا ہے۔ وہ سر جھکائے واپس مڑیں تو انہوں نے انہیں روک لیا۔

"پھر مت آنا رابعہ! جب میں تمہیں کھوجتا تھا تو تم نہیں ملتی تھیں۔ اب میں تمہیں نہیں کھوجتا۔ اب میری پیاس اور طرح کی ہے اور میری تلاش اور طرح کی ہے۔ تم جاؤ رابعہ۔"

ان کی آنکھوں سے آنسو نکل کر ان کی داڑھی بھگونے لگے اور وہ سر جھکا کر پھر زمین پر انگلی سے لکیریں بنانے لگے۔ سیدھی لکیریں اور ٹیڑھی لکیریں ۔۔۔ صراطِ مستقیم ۔۔۔ سیدھی جاتی لکیر اور آس پاس بے شمار ٹیڑھی لکیریں۔

"یہ آپ کیا لکیریں کھینچتے رہتے ہیں۔" خدیجہ چپکے سے آ کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"یہ صراطِ مستقیم ہے لیکن یہ باقی کے سارے راستے ٹیڑھے ہیں۔ غلط سمت لے جانے والے۔ صراطِ مستقیم تو صرف ایک ہی ہے نا لیکن یہ ٹیڑھے میڑھے بے شمار راستوں میں پھنسا صرف ایک راستہ اور صرف اس پر چلنا مشکل ہے لیکن لوگ چلتے ہیں۔ بہت لوگ چلتے ہیں اس پر اور بہت ان ٹیڑھے راستوں میں الجھ جاتے ہیں۔"

بات کرتے کرتے انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تم دعا کرتی ہو خدیجہ؟"

"ہاں"
"تو پھر دعا کیا کرو۔ میرے لیے۔ اپنے لیے اور اس بچے کے لیے جسے ابھی دنیا میں آنا ہے کہ ہم صراطِ مستقیم پر چلیں۔۔۔۔۔ یہ ٹیڑھے راستے ہمیں لبھائیں نہیں۔ ہمیں الجھائیں نہیں۔"
خدیجہ کی سادا سی بے ریا آنکھوں میں خوشی کے موتی چمک رہے تھے۔ مولوی صاحب نے اس سے پہلے تو کبھی اس طرح اتنی اپنائیت سے بات نہ کی تھی وہ تو جو بات کرتے تھے تو وہ بھی دور خلا میں جیسے کہیں کسی اور سے مخاطب ہوں۔
ابا جان نے کہا تھا۔ خدیجہ تو اسے تنگ نہ کرنا۔ کوئی سوال نہ کرنا۔ وہ خود ہی لوٹ آئے گا۔
"خدیجہ! میرے کپڑے نکال دو اور نہانے کے لیے غسل خانے میں پانی رکھ دو۔ میں آج جمعہ کی نماز مسجد میں پڑھوں گا۔"
"آپ۔۔۔۔ آپ کا سفر مکمل ہو گیا ہے۔" خدیجہ کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔
سفر تو کبھی بھی مکمل نہیں ہوتا۔ شاید ہاں مجھے راہ مل گئی ہے۔ راستہ دکھائی دے گیا ہے۔ تمہارے حقوق میں مجھ سے جو کوتاہی ہوتی ہے اسے معاف کر دیا کرو خدیجہ! میں تو بہت کمزور بندہ ہوں۔ یہ امتحان بہت مشکل ہے۔ جس میں اس نے مجھے ڈال دیا ہے۔ میں تو صرف ایک راہ کا مسافر تھا اس نے مجھے دوسری راہ دکھا کر لبھایا کہ یہ راہ اس راہ سے خوبصورت ہے۔ میں دونوں طرف لپکتا تھا دونوں میں ہی کشش تھی میرے لیے۔"
پھر اس نے ایک کی کشش کی زنجیر توڑ دی اور دوسری راہ میں میرے لیے آزمائشیں کھڑی کر دیں۔ مجھے صرف اس ایک راہ کا مسافر نہیں رہنے دیا خدیجہ! اس نے مجھ پر ذمہ داریاں بھی ڈال دیں اور پھر حکم دیا کہ ان کو پورا کر کے اس راہ پر چلو۔۔۔۔ اس نے مجھ کو ایسے ہی قبول نہیں کیا خدیجہ!"
آنسو ایک بار پھر ان کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ اور خدیجہ ہولے ہولے انہیں دلاسا دینے لگی۔
مولوی اللہ یار پہلے صرف جماعت کے ساتھ نماز کے لیے کھڑے ہوئے اور پھر ہولے ہولے ایک بار پھر ساری ذمہ داری ان پر آپڑی مولوی ہدایت اللہ نے ایک روز آنکھیں بند کر لیں۔ اب آسیہ اور خدیجہ کی ماں کی ذمہ داری بھی ان پر آپڑی تھی اور خود وہ ایک بیٹے کے باپ بن گئے تھے۔
فہد منصور۔۔۔۔
ان کی پیشانی پر سجدوں کا نشان دمکتا تھا اور چہرہ نورانی تھا۔ گاؤں کے لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ بہت۔۔۔۔ اور وہ بھی سب کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے۔ زندگی میں بہت ٹھہراؤ اور

سکون آ گیا تھا کہ پھر زرینہ کے واقعے سے ملتا جلتا ایک واقعہ ہو گیا۔
ماسی برکت ایک بیوہ عورت تھی اور اس کی ایک ہی بیٹی تھی۔ عمر وہی چودہ پندرہ سال تھی زرینہ بھی اتنی ہی عمر کی تھی جب اغوا ہوئی تھی۔۔۔۔ اور وہ بھی کنوئیں پر پانی بھرنے گئی تو پھر مڑ کر نہ آئی۔
ماسی برکتے نے بتایا کہ میں نے منع بھی کیا تھا کہ بہت شام ہو گئی ہے اب نہ جا۔۔۔۔ لیکن وہ چلی گئی کہ ابھی سب سہیلیاں کنوئیں پر ہی ہوں گی۔ میٹھے پانی کا یہ کنواں گاؤں سے باہر تھا اور شکار گاہ کے پاس سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ وہ کنوئیں پر نہیں پہنچی تھی۔ اس کا گھڑا پرانے برگد تلے ٹوٹا پڑا تھا اور یہ برگد شکار گاہ کے قریب ہی تھا۔ یہاں سے درختوں میں گھرا یہ بنگلہ جسے شکار گاہ کہتے تھے۔ صاف دکھائی دیتا تھا۔
"برگد پر رہنے والے جن بابا نے اسے غائب کر دیا تھا۔"
صبح تک سارے گاؤں میں خبر پھیل چکی تھی۔
"خادم نے جو چھوٹے چوہدری جی کا خاص ملازم ہے خود دیکھا ہے جن کو اس کا قد برگد جتنا اونچا تھا اور یہ لمبے لمبے دانت تھے اس کے اور اس نے مہر خاتون کو اپنے بڑے بڑے بازوؤں میں دبوچ رکھا تھا۔"
"جن اس طرح اغوا نہیں کیا کرتے۔" مولوی اللہ یار نے سنا اور انہیں گاؤں والوں کی سادگی اور بے وقوفی پر ترس آیا۔ "اسے کسی نے اغوا کیا ہے۔"
اور پھر انہیں زرینہ کا واقعہ یاد آ گیا اور چوہدری نیاز کی تنبیہہ۔
"عبدالقادر! آج کل شکار گاہ میں کون ٹھہرا ہوا ہے؟"
عبدالقادر حسبِ عادت ظہر کی نماز کے بعد ان کے پاس آ کر بیٹھا تو انہوں نے پوچھا۔
"چوہدری اعجاز کے دوست ہیں مولوی جی۔"
"کون دوست؟"
"وہی جو اکثر آتے رہتے ہیں۔"
عصر کی نماز کے بعد وہ ماسی برکت کو ساتھ لے کر "شکار گاہ" پہنچ گئے۔ چوہدری اعجاز نے حیرت سے انہیں دیکھا۔
"کیسے آنا ہوا مولوی جی؟"
"ہم مہر خاتون کا پتا کرنے آئے ہیں۔"
"مہر خاتون کا ہمیں کیا پتا۔ بھاگ گئی ہو گی کسی آشنا کے ساتھ۔ مولوی! تم ان کے پھڈے میں مت پڑو۔ یہ ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

"نہیں نہیں چوہدری جی!" ماسی برکت ان کے پاؤں پر گر پڑی۔ "وہ تو بہت معصوم ہے۔ بچی ہے بالکل۔ آپ میری بیٹی دے دیں مجھے۔ وہ تو اتنی معصوم ہے کہ رات کو مجھ سے لپٹ کے سوتی ہے۔ اسے ڈر لگتا ہے۔"

چوہدری اعجاز نے پاؤں جھٹک کر اسے علیحدہ کیا۔ اور عجیب طرح سے ہنسا۔

"اب نہیں ڈرتی ہو گی۔ جا کسی مولوی پیر فقیر سے دم کرا۔ کسی آشنا کے ساتھ نہیں بھاگی تو برگد والا جن بابا لے گیا ہو گا۔ خادم صحیح کہتا ہے۔"

"ایک ایجوکیٹڈ شخص کے منہ سے یہ بات جچتی نہیں چوہدری اعجاز! وہ معصوم بچی یہاں ہی ہے۔ اتنا ظلم مت کرو چوہدری! کل کو۔۔۔"

"لگتا ہے مولوی تیرے دن پورے ہو گئے ہیں۔ پہلے بھی ایک بار بابا نے تجھے معاف کر دیا تھا اب۔۔۔ خادم!" اس نے اپنے ملازم کو آواز دی۔

"نہیں دھکے دے کر باہر نکال دو۔" ماسی برکت مچل اٹھی۔ چلانے لگی۔

"میری مہو یہاں ہی ہے۔ مجھے اس کی خوشبو آ رہی ہے۔ مہو! مہو!"

خادم نے انہیں دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ مولوی اللہ یار نے اسے تسلی دی۔

"ہم پولیس میں رپورٹ کرواتے ہیں۔"

شکار گاہ سے باہر ایک پھندنا سا پڑا تھا۔

"یہ مہو کے پراندے کا پھندنا ہے۔" ماسی برکت نے اسے اٹھا لیا۔

"یہ شیشے میں نے اپنے ہاتھوں سے لگائے تھے۔ یہ سرخ اور کالی اون سے میں نے بنایا تھا مولوی جی۔ مہو! مہو۔۔۔!" وہ بند دروازے پر مکے مارنے لگی۔

مولوی اللہ یار بمشکل اسے گھر لائے اور پھر سمجھا بجھا کر اسے قریبی قصبے میں لے گئے اور چوہدری کے خلاف اغوا اور حبس بے جا کی رپورٹ لکھوا دی۔

"آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ چوہدری اعجاز نے ہی مہو کو اغوا کیا ہے۔" ایس ایچ او نے پوچھا۔

"تم رپورٹ لکھو بھائی! ثبوت بھی مل جائے گا۔"

"سوچ لیں مولوی جی۔" تھانیدار نے انہیں سمجھایا۔

"مجھے اپنے ایس۔ پی سے ملواؤ۔" اور تب ہی ڈی۔ ایس۔ پی عماد مرزا اپنے آفس سے باہر نکلے تو مولوی اللہ یار نے آگے بڑھ کر کر انگلش میں ان سے ساری بات کی۔ ایس۔ ایچ۔ او پنسل دانتوں میں دابے حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

ڈی۔ ایس۔ پی جوان تھا۔ نیا نیا اس علاقے میں آیا تھا۔ وہ اسی وقت شکار گاہ پر ریڈ کرنے کو

تیار ہو گیا لیکن جب وہ گاؤں پہنچا تو گاؤں میں کہرام مچا تھا۔ مہو کی لاش برگد تلے پڑی تھی۔ گلے پر انگلیوں کے نشان تھے اور جسم نیلوں نیل تھا۔ مولوی اللہ یار نے ہونٹ بھینچ کر ڈی۔ ایس۔ پی مرزا سے درخواست کی کہ اب مجھے نئی ایف۔ آئی۔ آر کٹوانی ہے۔۔۔ اغوا، حبس بے جا، بے حرمتی۔۔۔ اور قتل کی۔"

ڈی ایس پی ایمان دار بھی تھا اور جی دار بھی۔ اگلے ہی دن وارنٹ لے کر حویلی پہنچ گیا۔

سب نے مولوی اللہ یار کو اور ماسی برکت کو سمجھایا۔ ماسی برکت کی پونجی لٹ چکی تھی۔ کچھ باقی نہ بچا تھا کہ کوئی خوف ہوتا۔

"ایک اکیلی جان۔۔۔ زیادہ سے زیادہ مار دیں گے نا تو مار دیں۔۔۔ مہو کے بعد جی کر کیا کروں گی۔۔۔ ہاں مہو کے قاتلوں کو پھانسی ہو گی تو دل ٹھنڈا ہو جائے گا۔" وہ سینے پر ہاتھ مار کر کہتی۔ لیکن ادھر چوہدری اعجاز اور اس کے دوست ضمانت پر رہا ہوئے ادھر ڈی۔ ایس۔ پی کا تبادلہ ہو گیا۔

رات کے اڑھائی بجے تھے جب مولوی اللہ یار تہجد کے لیے اٹھ کر مسجد کی طرف آئے اور راستے میں سے ہی اٹھوا لیے گئے۔ عبدالقادر صبح صبح بھاگا بھاگا آیا اور خدیجہ سے درخواست کی کہ وہ گاؤں چھوڑ کر فوراً" کہیں چلی جائے۔ چوہدری کے بندے کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

"مولوی صاحب تو حسبِ معمول مسجد چلے گئے تھے۔ رات میں کسی پہر اٹھ کر۔"

عبدالقادر بھاگا بھاگا مسجد پہنچا۔ خیر دین پانی ڈال رہا تھا۔

"مولوی صاحب تو آج آئے ہی نہیں۔ میں نے جھاڑو دی اور حکیم صاحب نے اذان دے کر جماعت کروائی۔" اور عبدالقادر وہاں ہی بیٹھ گیا تھا۔ اور چوہدری اعجاز شکار گاہ کے تہہ خانے میں مولوی اللہ یار کو پاؤں سے ٹھوکر مارتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"ہمارے خلاف مقدمہ کرتا ہے۔ وارنٹ نکلواتا ہے۔"

"بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں چوہدری! اور ان کی عزت بھی سب کی عزت ہوتی ہے۔ تیری بھی بہنیں اور بیٹیاں ہوں گی۔ تجھے خوفِ خدا نہیں ہے۔"

"تو اپنی فکر کر، اب تیری عزت بھی گلیوں میں اچھلے گی۔ بہت ہمدرد بنتا ہے۔۔۔ ریفارمر بن رہا تھا۔ اگلے الیکشن میں تو نے ہی کھڑا ہونا تھا، ہیں نا۔"

وہ پاؤں سے ٹھوکریں مارتا باہر چلا گیا اور اسی شام گاؤں کے لوگوں نے جو منظر دیکھا۔ اس پر آسمان بھی کانپ گیا۔

خدیجہ، مولوی ہدایت اللہ کی بیوی اور چھوٹی بیٹی آسیہ اور ماسی برکتے حویلی کے مردانے میں

لائی گئی تھیں اور پھر چوہدری نے حکم دیا۔
"ان کو بے لباس کردو اور پورے گاؤں میں گھماؤ۔"
"نہیں نہیں۔"
وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھیں۔ سورج بھی بادلوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ ننھا فہد چیخیں مارتا ہوا خدیجہ کی طرف لپکا تھا کہ عبدالقادر جس نے اپنے چہرے کو رومال سے ڈھک رکھا تھا۔ کھینچ کر پیچھے کرلیا اور حکیم کے مطب میں چھپا کر خود بھی دروازہ بند کرکے بیٹھ گیا۔
آسمان یکدم سرخ ہوگیا تھا اور تیز آندھی...... سرخ آندھی چلی تھی۔ خدیجہ کا چند قدم چل کر ہی ہارٹ فیل ہوگیا تھا۔ وہ گری تھی اور کسی نے اس پر چادر ڈال دی تھی۔
آسیہ اور مولوی ہدایت اللہ کی بیوی کی لاشیں اگلی صبح گھر کے اندر پڑی ملی تھیں۔ کوئی کہتا تھا۔ مولوی کی بیوی نے آسیہ کو اور خود کو مار دیا اور کوئی کہتا تھا۔ چوہدری کے بندوں نے مارا...... عبدالقادر فہد منصور کو لے کر گاؤں سے نکلا اور جھنگ میں ایک دوست کے پاس چھوڑ کر راتوں رات واپس گاؤں آگیا..... اور اگلی صبح چوہدری نیاز سے چند گھنٹوں کی چھٹی لے کر جھنگ آیا اور جب واپس پلٹ کر گیا تو چوہدری نیاز نے پوچھا۔
"کدھر گیا تھا تو؟"
"وہ جی جھنگ گیا تھا ایک دوست سے ملنے۔ بتایا تو تھا جی آپ کو۔"
"دوست سے ملنے گیا تھا یا مولوی کے بیٹے کو بھگانے۔"
ایک لمحہ کے لیے تو عبدالقادر کانپ گیا۔ "نہ جی میں تو جھنگ گیا تھا۔ پہلے بھی جاتا رہتا ہوں۔ وہاں میرا پکا یار رہتا ہے ہم اکٹھے پڑھتے رہے ہیں۔ بچہ تو شاید مولوی صاحب کے پاس ہو گا۔ مولوی کے پاس کہاں سے آگیا۔ وہ تو......"
اور چوہدری نیاز خاموش ہوگیا۔ چوہدری نیاز اور چوہدری اعجاز نے فہد کو بہت ڈھونڈا۔ چوہدری کو بہت جلال چڑھا ہوا تھا۔ وہ مولوی اللہ یار کی نسل کو ختم کردینا چاہتا تھا۔ لیکن فہد اسے کہیں نہیں ملا تھا..... اور مولوی اللہ یار بھی پھر کبھی نظر نہیں آئے۔
زیادہ لوگوں کا خیال تھا کہ چوہدری اعجاز نے انہیں مروا کران کی لاش ٹھکانے لگوادی ہے۔

☆ ☆ ☆

مامون' دانیال' صدف تینوں خوش تھے لیکن عبداللہ بہت بے چینی محسوس کررہا تھا۔
چوہدری امتیاز خان بہت اچھی طرح ملے تھے۔
"بچو! اب آئے ہو تو رہو چند دن۔ کھاؤ پیو عیش کرو تازہ ہوا' تازہ میٹھا پانی اور تازہ سبزیاں۔"

عبیر کی حویلی بہت بڑی تھی۔ اس کے تین پورشن تھے۔ یہ تینوں پورشن اندر کی طرف تھے۔ باہر سے حویلی کا مین گیٹ ایک ہی تھا اور اندرونی گیٹ کے بالکل ساتھ مردانہ حصہ تھا۔ یہاں ہی چوہدری اعجاز' چوہدری امتیاز' افضال وغیرہ لوگوں سے ملتے اور بات چیت کرتے تھے۔
وہ رات کو خاصی دیر سے پہنچے تھے' سو صبح دیر سے اٹھے۔ البتہ عبداللہ عادت کے مطابق نماز کے وقت اٹھ کھڑا ہوا تھا اور پھر نماز پڑھ کر لیٹ گیا تھا چونکہ باقی لوگ ناشتہ کرچکے تھے اس لیے ناشتے کی ٹیبل پر یہ لوگ اکیلے ہی تھے۔ عبیر کے پورشن میں صرف اس کی امی' بابا جان اور ملازم تھے کیونکہ وہ اکلوتی تھی۔
"یہ جگہ بہت خوبصورت ہے عبیر! اور تمہارا گھر تو بہت ہی شاندار ہے۔"
"اور اس گھر میں بے چارے کتنے لوگوں کا خون شامل ہوگا۔" دانیال نے آہستگی سے کہا۔
"دانی! تم طنز کرنے سے باز نہیں رہ سکتے۔" عبیر نے ناراضی کا اظہار کیے بغیر کہا۔
"اب وہ پرانا جاگیرداری دور نہیں ہے۔ اب وقت بہت بدل گیا ہے۔ اب ایسا کچھ نہیں ہوتا جیسا ڈراموں اور کہانیوں میں بتایا جاتا ہے۔"
"تم بہت بھولی ہو عبیر! بہت کچھ اب بھی ویسا ہی ہے۔ بس انداز بدل گئے ہیں۔ طریقہ کار بدل گیا ہے۔ جاگیرداروں نے صنعت کاروں کا روپ دھار لیا ہے تمہارے بابا کی طرح۔ لیکن اندر سے ذہنیت تو وہی ہے جاگیرداروں والی۔ میں ذاتی طور پر ایک ایسے صنعت کار کو جانتا ہوں جس نے اپنی اولاد کو لندن اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں پڑھایا۔ اس کی بیٹیاں جینز اور انگلش لباس پہنتی ہیں لیکن اس نے اپنی بیٹی کو محض اس جرم میں ہلاک کردیا کہ اس نے اپنی پسند سے شادی کرلی تھی۔ اور اس نے اپنی بہنوں کی شادیاں اس لیے نہیں کیں کہ جائیداد کا بٹوارہ ہو جائے گا..... وہی سو برس پرانی سوچ۔"
"خیر میرے بابا ایسے نہیں ہیں۔" عبیر نے مسکرا کر ایک نظر عبداللہ پر ڈالی جو بے چین اور مضطرب سا بظاہر ان کی گفتگو سن رہا تھا لیکن اس کا ذہن کہیں اور تھا۔
"تم یہ مکھن لو..... خالص گھر کا فریش مکھن ہے۔ سالوں کا باسی پیکٹ میں بند نہیں۔"
"نہیں بھئی لوگوں کو موٹاپا پسند نہیں ہے اور مجھے اپنا مستقبل بہت عزیز ہے۔"
"اوہ ہاں!" عبیر ہنسی۔
"لوگوں کو موٹاپا پسند نہیں دوسروں کا شاید' اپنے متعلق کیا خیال ہے۔" اس نے صدف پر چوٹ کی جو کچھ موٹی ہوگئی تھی۔
"بھئی' ہمیں تو لوگ ہر حال میں پسند ہیں۔ دبلے موٹے..... چھوٹے' لمبے..... " دانیال نے کن انکھیوں سے صدف کو دیکھا۔ لیکن صدف عبیر کی طرف متوجہ تھی۔

"سچ عبیر! کیا میں بہت موٹی ہو گئی ہوں۔"
"ہاں کچھ پہلے سے۔"
اس نے پراٹھے کی طرف بڑھتا ہاتھ فوراً پیچھے کھینچ لیا۔ دانیال اور مامون بے اختیار ہنس دیے۔
"یہ لڑکیوں کو دُبلا ہونے کا کتنا کریز ہوتا ہے۔ ہے نا عبداللہ۔ حالانکہ مجھے تو دبلی بانس ایسی لڑکیاں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔" عبداللہ نے چونک کر اسے دیکھا۔
"اور بدقسمتی سے کرن بہت نازک ہے۔" عبیر ہنسی۔
"وہ نازک ہے دبلی نہیں ہے اطلاعاً عرض ہے۔" مامون نے فوراً جواب دیا "اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ مجھے اور میری ماما کو بہت پسند ہے۔"
"اور پپا۔۔؟" دانیال نے پوچھا۔
"مما کی پسند ان کی پسند۔ پپا مما کے سامنے نہیں بول سکتے بھیا۔"
"ہر شریف آدمی کا یہی حال ہوتا ہے۔" دانیال نے مفکروں کی طرح سر ہلایا تو عبداللہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔
"ہم یہاں صرف ناشتہ کرنے نہیں آئے عبیر! کسی اور مقصد سے بھی آئے ہیں۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی ناراضی تھی۔
"آئی نو عبداللہ! میں نے فاطمہ کو بلوایا ہے۔ وہ ہمیں نہ صرف غلام دین کے گھر لے چلے گی بلکہ اس سے بہت ساری معلومات بھی مل جائیں گی۔ تم لوگ ناشتہ کر کے تیار ہو جانا۔ ہم گاؤں دیکھنے کے بہانے باہر جائیں گے۔"
اور عبداللہ کے اعصاب قدرے پرسکون ہوئے اور اس نے اپنے لیے چائے کا ایک اور کپ بنایا اور چھوٹے چھوٹے سپ لینے لگا۔
"تمہارے بابا جان کے علاوہ یہاں کے اور بااثر زمین دار کون کون سے ہیں۔"
"میں تو زیادہ تر اسلام آباد ہی رہی ہوں۔ مجھے کچھ زیادہ پتا نہیں۔ تایا جان، چچا جان، بابا جان کے علاوہ کون۔۔۔"
"وہ سفید رنگ کی خوبصورت سی کوٹھی جو گاؤں کے آغاز میں ہی تھی کس کی ہے؟؟"
"وہ میری پھپھو جان کی ہے۔ کچھ عرصہ قبل ہی انہوں نے یہ کوٹھی بنوائی ہے۔ پہلے تو وہ ساتھ والے گاؤں میں رہتی تھیں۔ وہاں ہے ان کا سسرال۔ وہ بھی بڑے بااثر زمین دار ہیں۔ ان کے سسر ہمیشہ اسمبلی کا انتخاب لڑتے تھے۔ اب ان کے جیٹھ اور دیور نے یہ سیٹ سنبھال لی ہے۔" اس نے تفصیل بتائی۔

"میں شام کو پھپھو کی طرف لے چلوں گی۔ میری پھپھو بہت اچھی ہیں ان سے بات کر کے مزا آئے گا آپ کو۔"
چائے کا خالی کپ ٹیبل پر رکھ کر عبداللہ کھڑا ہو گیا۔
"عبیر! میں گھر فون کر لوں۔ امی جان پریشان ہوں گی۔"
"ہاں آؤ۔" وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔
"تم لوگ اطمینان سے ناشتہ ختم کر کے تیار ہو جانا۔"
"عبداللہ!" صدف نے اسے آواز دی۔
"انعم کو کہنا ہم سب کے گھر بھی اطلاع کر دے۔"
عبداللہ سر ہلا کر عبیر کے پیچھے ٹیلی فون اسٹینڈ تک آیا۔
"عبداللہ!" عبیر کے رخسار گل رنگ ہو رہے تھے اور آنکھوں میں انوکھی چمک تھی۔
"میں نے بابا جان سے بات کی تھی کہ میں ایاز سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔۔۔ اور پتا ہے بابا جان نے کہا۔ ٹھیک ہے جیسا تم چاہو گی اور وہ سوچیں گے اس معاملے میں۔۔۔ ابھی میں نے تمہارا نام نہیں لیا عبداللہ! لیکن مجھے لگا جیسے وہ جانتے ہوں۔
اور پتا ہے عبداللہ! انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ زندگی کی ہر شے سے بڑھ کر انہیں میری خواہش اور آرزوئیں عزیز ہیں۔"
عبداللہ نے گھر بات کر کے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔ اندر تک اترتی نظر جذبے لٹاتی جس نے عبیر کے اندر ہلچل مچادی۔
"اور شاید خدا اس پر بہت مہربان ہے۔" عبیر پر نظریں جمائے جمائے عبداللہ نے سوچا۔
ورنہ وہ تو اس ڈر سے نظر بھر کر عبیر کو نہیں دیکھتا تھا کہ ان کا میل نہیں ہو سکتا۔ دونوں کے اسٹیٹس میں بہت فرق ہے۔ دونوں کی نظریں ایک دوسرے پر تھیں۔ کئی خاموش لمحے ان کے درمیان سے گزر گئے اور پھر عبداللہ نے نظریں اس کے چہرے سے ہٹالیں اور اپنے اندر خوشی کے ایک درخت کو پھیلتے اور خوشبو بکھراتے دیکھا اور دھیمی سی مسکراہٹ لبوں پر لیے گیسٹ روم کی طرف بڑھ گیا۔
وہ فاطمہ کے ساتھ غلام دین کے گھر آئے تھے۔ یہ ایک کچا گھر تھا جیسے اکثر گاؤں میں ہوتے ہیں۔ چھوٹا سا احاطہ اور آگے دو کمرے، ایک طرف کونے میں گائے بندھی تھی۔ فاطمہ نے ہاتھ اندر کر کے احاطے کے دروازے کی کنڈی کھول لی۔ کچا صحن عبور کر کے وہ کمروں تک آئے تھے دروازے بند تھے اور اندر موت کی سی خاموشی تھی۔ فاطمہ نے دستک دی۔ اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔

"آپا! دروازہ کھولو۔ یہ میں ہوں فاطمہ۔"
کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور پھر فاطمہ کے ساتھ کچھ اور لوگوں کو دیکھ کر دروازہ کھولنے والی عورت نے دروازہ بند کرنا چاہا تو فاطمہ نے ایسا نہ کرنے دیا۔
"ہمیں اخبار والوں سے کوئی بات نہیں کرنی۔" یہ غلام دین کی ماں تھی شاید۔
"یہ اخبار والے نہیں ہیں آپا! ہمدرد ہیں تمہارے۔"
وہ بمشکل انہیں اندر بلانے پر راضی ہوئی تھی۔
ان عورتوں کے چہرے ستے ہوئے تھے۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ غلام دین کی بیوی ایک طرف چادر اوڑھے لیٹی تھی۔ اسے شدید بخار تھا۔
"میں وکیل ہوں۔" عبداللہ زمین پر ہی غلام دین کی ماں کے پاس بیٹھ گیا۔ "میں چاہتا ہوں کہ جو لوگ اس کارروائی کے مرتکب ہوئے ان کے خلاف کیس کیا جائے۔ انہیں عدالت میں گھسیٹا جائے اور انہیں سزا ملے۔"
تینوں عورتوں نے سر اٹھا کر عبداللہ کو دیکھا یوں لگتا تھا جیسے ان کی آنکھیں مارے خوف کے حلقوں سے باہر نکل آئیں گی۔
"نہیں جی۔ ہمیں کیس نہیں کرنا۔"
کچھ توقف کے بعد ایک نے جو غالباً غلام دین مرحوم کی بہن تھی کہا۔
"آخر وہ کون شقی القلب اور بے غیرت انسان ہے جس نے یہ سب کیا۔"
"کمال ہے جی۔ آپ کو نہیں پتا۔ یہاں تو ہر بندے کو پتا ہے جی۔" غلام دین کی بیوی کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ "تب ہی آپ مقدمہ کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ جانتے ہوتے تو۔۔۔"
"تو بھی ہم ایسا ہی کرتے بہن! تم نام بتاؤ۔" عبداللہ کا لہجہ نرم اور گداز تھا۔
"چوہدری اعجاز خان کے بندے ہیں ہمیں اس کے ڈیرے پر پکڑ کر لے گئے تھے جی اور پھر اسی کے حکم پہ۔۔۔" عورت دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔
عبیر کا سر جھک گیا تھا۔
"پتا نہیں جی۔ غلام دین سے کیا غلطی ہوئی تھی جس کی سزا ہمیں ملی۔۔۔ ہمیں تو پتا نہیں۔۔۔ وہ تو چیختا ہی رہا کہ خطا اگر اس کی ہے تو اس کے ٹوٹے کر دیے جائیں یوں ماں بہن کو بے عزت نہ کیا جائے۔ پر چوہدری اعجاز نے کانوں کو بند کر لیا تھا جی خدا نے اسے دھی نہیں دی پر بیٹوں کی تو بیٹیاں ہیں۔ ان پر آزمائے گا۔"
غلام دین کی ماں بھی رونے لگی۔

"ہاں جی!" دانیال نے اسے تسلی دی اور کہا۔ "ہم اسی لیے تو حاضر ہوئے ہیں کہ مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں۔ آپ پلیز ہمارے ساتھ چلیں' تھانے میں پرچہ کٹوائیں ان کے خلاف۔ ہم تو آپ کی مدد کے لیے آئے ہیں۔"
"ہماری مدد آپ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں زہر دے دیں۔ اپنے ہاتھوں سے ہمارا گلا گھونٹ دیں یا پھر ہمارے لیے موت کی دعا کریں کہ خدا ہمیں اس دنیا سے اٹھالے۔ ہمیں اور رسوا مت کریں۔" یہ غلام دین کی بہن تھی۔ جو اونچا اونچا بول رہی تھی۔
"تم بھی ہماری بے بسی اور لاچاری کا تماشا دیکھنے والوں میں سے ہو۔ احسان کرنا ہے تو کرو احسان' گھونٹ دو ہمارے گلے۔ ہم مرنا چاہتے ہیں لیکن بھائی کی طرح حرام موت سے خوف آتا ہے۔ کرو ہم پر احسان۔"
عبداللہ کا دل بھاری ہو گیا۔ کنپٹیاں جلنے لگیں وہ خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ لوگ ابھی تک ہراساں سے تھے۔ نگاہیں جھکا کر چلتے اور آہستگی سے بات کرتے تھے۔ وہ یونہی گاؤں کی گلیوں میں چکراتا پھرا۔ اور لوگوں سے باتیں کرتا رہا۔
سب ہی رپورٹ کروانے کے خلاف تھے۔ ایک آدمی نے اسے بتایا کہ آج سے تقریباً چوبیس پچیس سال پہلے بھی اس ہی نوعیت کا واقعہ ہوا تھا۔ اور تب بھی لوگ چوہدری نیاز' اس کے بیٹے چوہدری اعجاز کا ہی نام لیتے تھے۔
عبداللہ کے اعصاب چٹخنے لگے تھے۔ اسے لگا جیسے اس کے کانوں میں چیخوں کی آوازیں آرہی ہوں۔ دھندلے دھندلے منظر آنکھوں کے سامنے آرہے تھے۔ پھر جیسے کسی منظر سے گھبرا کر وحشت زدہ ہو کر اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں لیکن اس کے حلق سے چیخیں نکل رہی تھیں۔ پھر دو ہاتھوں نے جیسے اسے کھینچ لیا تھا۔ منظر مدھم ہو گئے تھے۔
وہ سچ مچ ایک گلی کے بیچوں بیچ آنکھیں موندے کھڑا تھا۔ اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ پیشانی کی رگیں ابھری ہوئی تھیں اور مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ دانتوں پر دانت سختی سے جمے تھے۔ اس نے ہولے ہولے مٹھیاں کھولیں۔ پاکٹ سے رومال نکال کر پیشانی سے پسینے کے قطرے صاف کیے۔ تب ہی عبیر کا ڈرائیور اسے ڈھونڈتا ہوا ادھر آنکلا۔
"او جی۔ آپ یہاں کھڑے ہو اور ادھر سب لوگ آپ کے لیے پریشان ہو رہے تھے۔"
وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ عبیر پریشان سی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔
"تم کہاں چلے گئے تھے عبداللہ ؟"
"مجھ میں انہیں سننے کی مزید تاب نہ تھی عبیر۔" عبداللہ بولا تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"عبداللہ۔" عبیر نے آہستگی سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔
"تم میری وجہ سے اپنا مشن ادھورا مت چھوڑنا۔ کبھی تو کسی کو تو آواز اٹھانا چاہیے۔ کہیں تو جا کر ظلم کا یہ سلسلہ رکے۔"
"تمہاری وجہ سے!"
"ہاں۔ چوہدری اعجاز میرے تایا ہیں۔ میں نے سمجھا' تم اس وجہ سے باہر چلے گئے ہو اٹھ کر۔"
"اور چوہدری نیاز؟"
"میرے دادا تھے۔" عبیر کا سر جھکا ہوا تھا۔
"پتا نہیں کیوں یہ نام مانوس سا لگتا ہے عبیر۔"
"شاید کبھی سنا ہو۔" عبیر نے آہستگی سے کہا۔
وہ غلام دین کے گھر سے بائیں طرف اپنی گاڑی کے پاس کھڑی تھی۔
"باقی لوگ کہاں ہیں عبیر؟"
"وہ فاطمہ کے گھر میں ہیں۔ اس نے زبردستی سب کو لسی پلانے کے لیے روک لیا ہے۔ میں تمہیں دیکھنے کے لیے باہر آ گئی تھی۔"
"یہ فاطمہ کون ہے؟"
"یہ غلام دین کی بیوی کی کزن ہے۔ بچپن سے میرے پاس آ رہی ہے میری ہم عمر ہے تقریباً۔"
"اور وہ لوگ مان گئے رپورٹ کرنے پر؟"
"نہیں۔ لیکن مان جائیں گے۔"
"تمہیں پتا تھا عبیر کہ۔۔۔"
"ہاں پہلے تو نہیں لیکن فاطمہ جب آئی تو اس نے بتایا تھا سب۔"
"پھر بھی تم ہمیں ادھر لے آئیں۔"
"ہاں عبداللہ! میں نے کہا نا کہ اب ظلم کا یہ سلسلہ ختم ہونا چاہیے۔ کسی کو تو اٹھنا چاہیے ظلم کے خلاف اور میں تمہارے ساتھ ہوں عبداللہ۔" اور عبداللہ کی آنکھوں میں نرمی سی اتر آئی' اس نے بہت محبت سے عبیر کی طرف دیکھا۔
"عبیر! یہ بہت مشکل ہے۔ میں الجھ گیا ہوں۔"
"تم الجھو مت عبداللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ تم سے پہلے قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ وہ امیروں کو تو معاف کر دیتی تھیں اور غریبوں کو سزا دیتی تھیں۔"

"مجھے فخر ہے کہ میں نے تم سے محبت کی عبیر۔"
اور عبیر مسکرا دی لیکن اس کی آنکھوں میں ستارے چمک رہے تھے۔
"پتا نہیں کیا ہو گا اور اس کی زد میں کیا کچھ آ جائے گا۔ لیکن میں مضبوط رہوں گی۔" اس نے خود سے کہا اور سامنے سے آتے مامون اور دانیال کو دیکھا جو ڈرائیور کے ساتھ آ رہے تھے۔
"تم کہاں چلے گئے تھے؟" مامون نے آتے ہی پوچھا۔
"یونہی ادھر ادھر لوگوں کی رائے معلوم کر رہا تھا۔"
"تو۔۔۔!" دانیال نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
"ظاہر ہے۔ ظلم اور جبر سے تو ہر کوئی نفرت کرتا ہے لیکن سب اپنی عزت سے خوف کھاتے ہیں۔ آواز اٹھانے کا حوصلہ نہیں ہے کسی میں۔" عبداللہ اب نارمل لگ رہا تھا۔
یہاں سے سب کا پروگرام عبیر کی پھپھو کی طرف جانے کا تھا۔
"پھپھو تم سے مل کر خوش ہوں گی اور پتا ہے' میری پھپھو نے انگلش لٹریچر میں ماسٹر کی ڈگری لے رکھی ہے۔ اور تمہیں بھی ان سے گفتگو کر کے مزا آئے گا۔ بی۔ اے انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا تھا اور ماسٹر کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے لی۔ اور ہمارے گاؤں میں جو مسجد ہے' یہ انہوں نے ہی بنوائی ہے سرخ چھوٹی اینٹوں سے بنی یہ مسجد بہت خوبصورت ہے۔"
اندر کی پریشان خیالی سے بچنے کے لیے عبیر مسلسل باتیں کر رہی تھی۔
اس کی پھپھو واقعی انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور وہ سب بھی ان سے متاثر ہوئے۔ خوبصورت اور باوقار سی۔ ان کا ڈرائنگ روم سادگی سے سجا تھا لیکن اس میں نفاست تھی۔ وہ سب سے ہولے ہولے ان کے متعلق پوچھتی رہیں۔ عبداللہ کو دو تین بار انہوں نے نظر اٹھا کر دیکھا اور پھر اس کے والدین کے متعلق پوچھا۔ ان کی گفتگو میں سلیقہ تھا اور مطالعہ وسیع لگتا تھا۔
"ابھی پچھلے دنوں جو واقعہ یہاں ہوا' آپ کا کیا خیال ہے اس کے متعلق۔۔۔" دانیال نے یکایک پوچھ لیا۔
وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ چوہدری اعجاز عبیر کے تایا ہیں۔
"اور آپ جیسے پڑھے لکھے اور مہذب لوگ بھی اس پر احتجاج نہیں کرتے یہ کتنے افسوس کا مقام ہے۔ حالانکہ یہ آپ کا گاؤں ہے اور یہ حادثہ جس خاندان کے ساتھ ہوا وہ۔۔۔"
عبیر کی پھپھو نے دانیال کی طرف دیکھا اور ایک افسردہ سی مسکراہٹ نے ان کے لبوں کو چھوا۔
"بیٹا! شاید تم نہیں جانتے کہ احتجاج تو دوسروں پر کرتے ہیں۔ ظلم کرنے والے ہاتھ اپنے ہی

ہوں تو کیا اپنے ہاتھ کاٹ دیے جائیں۔"
"انصاف کا تقاضا تو یہی ہے پھپھو!"
عبیر جو صبح سے اس دکھ کو برداشت کر رہی تھی کہ ظلم کرنے والے ہاتھ اس کے اپنے لوگوں کے ہیں ایک دم پھٹ پڑی۔
"ہاں بیٹا! انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ اپنے ہاتھ کاٹ دیے جائیں لیکن اتنا حوصلہ کہاں سے آئے۔" ان کی آواز میں ٹھہراؤ تھا اور چہرے پر سکون۔
"آپ جانتی ہیں اس با اثر زمین دار کو۔" ماموں نے بے اختیار پوچھا۔
"سارا گاؤں جانتا ہے' کسی نے بتایا نہیں تمہیں ؟"
"چوہدری اعجاز کون ہیں؟" ماموں نے پھر سوال کیا۔
"میرے بڑے بھائی ہیں۔" ان کے چہرے پر پھیلے سکون میں کمی نہیں آئی تھی۔
"جس حویلی میں تم ٹھہرے ہوئے ہو' اسی کے ایک پورشن میں رہتے ہیں۔" انہوں نے اسی سکون سے کہا۔
ماموں نے گھبرا کر پہلے عبیر اور پھر عبداللہ کو دیکھا۔ وہ پُرسکون سے بیٹھے تھے۔ جیسے پہلے سے باخبر ہوں۔
"آج سے چوبیس پچیس سال پہلے بھی یہاں ایک ایسا ہی واقعہ ہوا تھا۔ آپ جانتی ہیں؟" عبداللہ نے اچانک سر اٹھا کر پوچھا تو عبیر کی پھپھو چونکیں اور انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔
"اور اس میں کس کا ہاتھ تھا؟"
"بھائی صاحب اور والد صاحب کا۔"
صدف' دانیال اور ماموں حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے جبکہ وہ بہت پرسکون سی بیٹھی تھیں۔
"اور متاثرہ خاندان۔۔۔؟" عبداللہ کی آواز جھرجھرا رہی تھی۔
"سب ختم ہو گئے۔ ایک بچے کے سوا اور وہ بچہ کہاں ہے' زندہ بھی ہے یا نہیں۔ مجھے علم نہیں۔"
"پھپھو! میں نے آپ کو بتایا تھا نا یہ سب میرے کولیگ ہیں۔ ہم ایک ہی چیمبر میں بیٹھتے ہیں اور ان کا یہاں آنے کا مقصد صرف ہمارا گاؤں دیکھنا نہیں ہے۔ یہ عبداللہ چاہتا ہے کہ غلام دین کے گھر کی عورتیں ان لوگوں کے خلاف پرچہ کٹوائیں جنہوں نے ان عورتوں کے ساتھ یہ سلوک کیا۔"
عبیر نے ٹھہر ٹھہر کر بہت آرام سے اپنی بات مکمل کر کے ان کی طرف دیکھا۔ ان کے سکون

میں اب بھی فرق نہیں آیا تھا۔
"جب ہم وہاں سے چلے تھے تو ہمیں۔۔۔ میرا مطلب ہے مجھے علم نہ تھا کہ وہ با اثر زمین دار کون ہے۔"
"اور اب جب تمہیں معلوم ہو گیا ہے اور تم اور تمہارے یہ کولیگ جوان عورتوں کے لیے بڑی ہمدردی کا جذبہ لے کر یہاں آئے تھے واپس جا رہے ہیں اس لیے کہ ظالم تمہارے عزیز ہیں۔" ان کے لہجے میں طنز تھا۔
"نہیں ایسا نہیں ہے۔۔۔ عبیر نے ہمیں منع نہیں کیا اور نہ ہی روکا ہے۔ ابھی وہ خواتین راضی نہیں ہیں۔ لیکن جلد ہی ہم انہیں رضامند کر لیں گے۔" عبداللہ نے اپنے مخصوص نرم لہجے میں کہا۔ "عبیر ایک حوصلہ مند لڑکی ہے۔"
"تم اس کا انجام جانتی ہو عبیر؟" اس کی پھپھو اس کی طرف متوجہ تھیں۔
"میں نے اس کے متعلق نہیں سوچا لیکن میں عبداللہ کا ساتھ دوں گی جہاں تک ہو سکا۔" عبیر کے لہجے میں عزم تھا۔
"ظلم کے ہاتھ کٹنے چاہئیں پھپھو! چاہے وہ ہمارے اپنے ہی کیوں نہ ہوں۔"
اس کی پھپھو کی آنکھوں میں ستائش تھی۔
"عبیر! شاید تم مجھ سے زیادہ حوصلہ مند ہو۔ پچیس سال پہلے میں نے بھی ایسا سوچا تھا لیکن میں ایسا کر نہیں سکی تھی اور پچیس سال سے میرے اندر ایک آگ لگی ہوئی ہے' ایسی آگ جس کی تپش سے میں خود ہی جل جل کر راکھ ہوتی رہتی ہوں۔"
"پھپھو!" عبیر نے اپنے ہاتھ ان کے ہاتھوں پر رکھے۔
"پچیس سال پہلے اس خاندان کے ساتھ وہ سلوک کیوں کیا گیا تھا۔" عبداللہ نے پوچھا۔
"وہ شخص بہت اچھا تھا۔ اس نے بھی تمہاری طرح ایک مظلوم کی خاطر چوہدری اعجاز کے وارنٹ نکلوا دیے تھے۔ لیکن وہ یہاں رہتا تھا۔ بابا جان اور بھائی صاحب کی دسترس میں۔ سو انہوں نے اسے اذیتیں دے دے کر مار ڈالا اور اس کے خاندان کے۔۔۔"
وہ مختصر لفظوں میں تفصیل بتا رہی تھیں اور عبداللہ کے کانوں میں پھر چیخیں گونجنے لگی تھیں۔ اونچی آواز میں جیسے کوئی بین کر رہا ہو۔ چیخ رہا ہو۔۔۔ پھر آنکھوں کے سامنے دھندلے دھندلے منظر۔ کوئی بچہ چیختا تھا اور پھر دو ہاتھ بچے کو کھینچ کر اس منظر سے ہٹا لے گئے تھے۔ اس کا چہرہ تپ گیا تھا۔ اور آنکھیں یوں سرخ ہو رہی تھیں جیسے ابھی ان سے خون ٹپک پڑے گا۔
"یہ سب کیا ہے؟" اس نے ہولے سے اپنی کنپٹیوں کو دبایا۔

"ملک صاحب صحیح کہتے تھے۔ عبداللہ اتنی حساسیت اچھی نہیں۔"

"کیا ان عورتوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر واپس چلا جاؤں۔" اس کی آنکھوں کے سامنے انعم، ثمن، کومل، زہرا بیگم اور ماسٹر شفیق احمد کے چہرے باری باری آنے لگے۔

"نہیں۔" یکدم اس کے لبوں سے نکلا۔ "نہیں۔ انہیں کوئی کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"کیا ہوا عبداللہ؟"

سب نے بیک وقت پوچھا۔ پھپھو خاموش ہو گئیں۔ اس نے یوں انہیں دیکھا۔ جیسے کسی خواب سے جاگا ہو۔

"کچھ نہیں۔" اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں سر کے بالوں میں گھمائیں۔

"میرا خیال ہے عبداللہ! تمہیں اس معاملے میں دخل نہیں دینا چاہیے۔" صدف نے مشورہ دیا۔

"تم نے سنا، پھپھو کیا کہہ رہی تھیں۔ مولوی صاحب کے خاندان کے ساتھ یہ سلوک اس لیے کیا گیا تھا کہ انہوں نے تھانے میں رپورٹ لکھوادی تھی۔"

عبداللہ خاموش رہا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔

"**عبیر**! تم تو کہتی تھیں۔ اب ایسا نہیں ہوتا۔ یہ جاگیردار اور ان کے ظلم سب کتابی باتیں ہیں۔" دانیال نے **عبیر** کی طرف دیکھا۔

"مجھے کیا خبر تھی دانی اور پھر میں اور بابا جان اور امی جان بہت کم یہاں رہے ہیں۔"

عبیر بہت شرمندہ تھی۔ اور باقی سب خاموش اپنی اپنی جگہ کچھ سوچ رہے تھے۔۔۔ کہ پھپھو نے موضوع بدلا۔

"تم لوگ دن کا کھانا یہاں ہی کھانا۔ اور ہاں میرے بیٹے کے اصطبل میں بہت شاندار گھوڑے ہیں اگر دیکھنا چاہو تو۔۔۔" وہ اٹھیں۔

"میں تمہارے کھانے کا کہہ دوں، یوں تو میں نے رات خانساماں کو بتا دیا تھا کہ دن میں **عبیر** بی بی اور ان کے دوست آئیں گے۔ پھر بھی ایک نظر کچن کو دیکھ لوں۔"

"رابعہ پھپھو! کھانا پھر سہی۔ ہم اب چلیں گے۔" **عبیر** نے انہیں منع کیا لیکن انہوں نے اس کو ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے رات جب تم نے فون کیا تھا تب بھی میں نے تم سے کہا تھا کہ تم لنچ ادھر ہی کرنا۔"

"وہ پاپا جان۔۔۔"

"میں ابھی فون کر کے بتا دوں گی انہیں۔"

"اور بیٹا! تم ریلیکس ہو جاؤ۔" انہوں نے عبداللہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "اور بہت سکون اور آرام سے۔ بہت سوچ سمجھ کر کرنا جو بھی کرنا۔"

"پھپھو! جب تک آپ مصروف ہیں کچن میں۔ ہم ذرا مسجد دیکھ آتے ہیں۔" **عبیر** بھی بہت ٹینس ہو رہی تھی اور چاہ رہی تھی کہ ذہن کچھ ہلکا پھلکا ہو۔

"مسجد کا صحن تھوڑا وسیع کیا ہے۔ پچھلا حصہ بھی ساتھ شامل کر لیا ہے۔"

"مگر وہاں مسجد کی بیک پر تو کسی کی قبر تھی۔" **عبیر** نے پوچھا۔

"وہ قبر اب مسجد کے اندر آگئی ہے۔" رابعہ پھپھو نے بتایا۔

"میں بھی چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔ میں نے لاہور سے جو فانوس منگوائے تھے وہ ہال میں لگوائے ہیں۔ بچوں کو درس دینے کے لیے ایک استاد بھی رکھا ہے۔ اور مسجد کے ساتھ ہی اس کی رہائش کے لیے دو کمروں کا چھوٹا سا گھر بنایا ہے اور بھی کچھ تزئین کی ہے مسجد کی۔"

"پھپھو کو مسجد اور اس کی تزئین سے بہت دلچسپی ہے ان کا بس چلے تو اس مسجد کو دنیا کی سب سے خوبصورت مسجد بنا دیں۔"

عبیر نے بتایا۔ اور وہ سب ہی **عبیر** کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ سب ہی شاید ٹینس ہو رہے تھے اور موضوع کی تبدیلی سے انہیں خوشگوار احساس ہوا تھا۔

مسجد گو چھوٹی تھی لیکن بہت خوبصورت تھی۔۔۔ اندر سب شیشوں اور پچی کاری کا کام تھا۔ مسجد کے ہال میں قالین بچھے تھے۔ صحن میں رنگ برنگے پھولوں کے پودے تھے۔ ایک طرف صحن میں دیوار کے ساتھ قبر تھی۔ قبر کے سرہانے درخت تھا اور ارد گرد گلاب اور موتیے کے پودے تھے۔ قبر پر بھی تازہ پھول پڑے تھے اور پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ قبر پر کوئی کتبہ وغیرہ نہیں تھا ایک چھوٹا سا پتھر تھا بس۔

"یہ کس کی قبر ہے۔" دانیال نے فاتحہ پڑھ کر پوچھا۔

"کوئی مسافر تھا شاید۔۔۔" رابعہ پھپھو نے بتایا۔

"یہ قبر پہلے مسجد میں نہیں تھی۔ میں نے اس کا صحن وسیع کرنے کے لیے پیچھے والی ساری زمین مسجد میں شامل کی تو یہ قبر بھی مسجد میں آگئی۔ یہ پیچھے جنگل ہی تھا۔"

"بڑا خوش نصیب مسافر تھا۔"

مامون نے قبر پر پڑے پھولوں کی طرف اشارہ کیا۔ رابعہ پھپھو خاموش رہیں۔

عبداللہ گھٹنوں کے بل قبر کے پاس بیٹھا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ قبر کی ٹھنڈی ٹھنڈی مٹی پر اپنے رخسار رکھ دے۔ اس نے ہاتھ قبر پر رکھے۔ اٹھنے کو جی ہی نہیں چاہا۔ وہ جیسے کسی عجیب سی کشش میں بندھ گیا تھا۔ آنکھوں میں خود ہی خود نمی اتر آئی تھی۔

"اٹھو عبداللہ!" عبیر اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔
"کیا قبر والے نے باندھ لیا ہے۔" دانیال نے پوچھا۔
"ہاں شاید۔"
عبداللہ کا جواب مختصر تھا۔ رابعہ پھپھو نے چونک کر اسے دیکھا۔
"تم ــــ"
عبداللہ نے نظریں اٹھائیں۔ وہ یکایک ہی بہت اداس اور بہت دل گرفتہ ہو گیا تھا۔
"تم میں کسی کی شباہت ہے بہت، تمہیں دیکھ کر میں بار بار چونک جاتی ہوں۔۔۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اپنے والد کا۔"
"رفیق احمد ــــ"
"کیا وہ بھی وکیل ہیں۔"
"نہیں، وہ کسی محکمہ میں کلرک تھے۔ اب حیات نہیں۔" وہ باتیں کرتے ہوئے مسجد سے نکل آئے۔ چند قدم کے فاصلے پر رابعہ پھپھو کا گھر تھا۔ پھر کھانے تک اس موضوع پر کوئی بات نہ ہوئی۔ جاتے وقت انہوں نے عبیر کو روکا۔ غیر ارادی طور پر عبداللہ جو عبیر سے ذرا آگے تھا۔ وہ بھی رک گیا۔
"سنو عبیر! جب تک یہ لوگ یہاں ہیں، احتیاط کرنا کہ کسی کو ان کے ارادے کی خبر نہ ہو اور نہ ہی یہ پتا چلے کہ تم لوگ غلام دین کے گھر گئے تھے۔"
اور پھر انہوں نے عبداللہ کی طرف دیکھا۔
"عبداللہ! اگر تم اپنے ارادے پر قائم رہے تو کبھی میری مدد کی ضرورت پڑے تو بلا جھجک چلے آنا۔۔۔ شاید مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔"
ان کی آواز سرگوشی کی طرح مدھم ہو گئی۔ "میرا اندر برسوں سے کسی پھوڑے کی طرح پک رہا ہے اور اس کا مواد اندر ہی اندر مجھے گلاتا جا رہا ہے۔ مجھے کچھ بھی نہیں بھولتا۔ کچھ بھی نہیں۔"
وہ ایک دم پلٹ کر اندر کی طرف چلی گئیں اور عبداللہ نے کسی قدر حیرت سے عبیر کو دیکھا۔
"یہ رابعہ پھپھو کیا کہہ رہی تھیں۔ میں سمجھ نہیں پایا۔"
"پھپھو کی بہت ساری باتیں میری بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔ بعض اوقات مجھے لگتا ہے جیسے انہوں نے کوئی بڑا غم چھپا رکھا ہو۔ اور یہ غم انہیں بہت عزیز ہو۔ وہ اس غم کی دیکھ بھال ... کی ... آبیاری کرتی ہوں۔ اور جیسے ان کے من میں کوئی بہت بڑا بھید چھپا ہو۔ کوئی گہرا راز۔ اور کبھی مجھے وہ ایک پجارن سی لگتی ہیں جو کسی ان دیکھے پجاری کے سامنے پوجا کا تھال لیے

بیٹھی ہوں۔ تمہیں ایسا نہیں لگا عبداللہ جیسے وہ ہمارے ساتھ بات کرتے ہوئے ہمارے درمیان موجود ہوتے ہوئے کہیں اور کسی اور جگہ کسی کی پوجا میں مگن ہوں۔"
"پتا نہیں عبیر! میں تو خود خواب اور حقیقت کے درمیان پھنسا تھا۔ میں نے پھپھو کی باتوں کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا لیکن کوئی بات ہے ان میں جو انہیں سب سے الگ کرتی ہے۔ سب سے ممتاز۔ جو انہیں ایک سے زیادہ بار سننے پر اکساتی ہے اور انہوں نے آج ہم سب کو بہت حیران کیا۔۔۔ یہ حقیقت ہے۔
انہوں نے اتنے سکون اور اطمینان سے کہا کہ مجرم میرے بھائی صاحب ہیں کہ مجھے کتنے ہی لمحے ان کی بات پر یقین نہیں آیا۔۔۔ گو میں تم سے پہلے ہی حقیقت جان چکا تھا۔ مجھے لگا یوں جیسے وہ کسی اور کی بات کر رہی ہوں۔"
"ہاں پھپھو! ایسی ہی ہیں انہوں نے ہمیشہ مجھے حیران کیا ہے۔"
وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے باہر آئے جہاں ماموں، دانیال اور صدف ان کے منتظر تھے۔

☼ ☼ ☼

ماسٹر شفیق احمد اسکول سے آئے تو اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے سب سے پہلے عبداللہ کا پوچھا۔
"عبداللہ نہیں آیا؟"
"آجائے گا۔۔۔ پہلی بار تو یوں زندگی میں گھر سے باہر نکلا ہے۔ دوست یار مل کر گئے ہیں۔ آپ تو یونہی گھبراتے ہیں۔" زہرہ بیگم نے انہیں تسلی دی۔
"رات فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا، دو روز تک آجاؤں گا۔"
"اچھا شکر ہے رب کا۔" انہیں اطمینان ہوا۔ "ٹھیک تو تھا نا۔"
"انعم سے ہی بات ہوئی تھی۔ انعم کہہ رہی تھی۔ ٹھیک ہے۔"
"اچھا بچیاں آگئیں۔؟"
"کومل تو آگئی ہے ثمن اور انعم ابھی نہیں آئیں۔۔۔ آپ کے لیے کھانا لگا دوں۔" زہرا بیگم نے پوچھا تو ہاتھ میں پکڑی ڈائری میز پر رکھتے ہوئے وہ چارپائی پر بیٹھ گئے۔
"ہاں لگا دو، کومل نے کھا لیا۔؟"
"وہ تو آپ کو پتا ہی ہے، بھوک نہیں سہار سکتی۔ اسکول سے آتے ہی کچن میں گھس جاتی ہے۔ انعم چاہے کتنی بھی جلدی آجائے بہنوں کا انتظار کرتی ہے۔"
زہرا بیگم بات کر کے چلی گئیں۔ ماسٹر شفیق احمد منہ ہاتھ دھونے چلے گئے۔ واش روم سے نکلے تو زہرا بیگم نے کھانا لگا دیا تھا۔

"ارے واہ! آج تو میرے بیٹے کی پسند کا کھانا بنا ہے فرائیڈ چکن۔" ماسٹر شفیق احمد نے ڈونگے کا ڈھکن اٹھایا۔

"ماش کی دال بھی ہے ساتھ۔ لیکن لائی نہیں میں آپ کے لیے۔ آپ کے پیٹ میں تکلیف ہوگی۔" زہرا بیگم نے پانی کا جگ ٹیبل پر رکھا۔

"سچ بتائیں۔ آج آپ کو عبداللہ کا انتظار تھا نا؟ "

ماسٹر شفیق احمد نے مسکرا کر زہرا بیگم کی طرف دیکھا۔

"ہاں، صبح سے دل کہہ رہا تھا کہ شاید آج وہ آجائے۔ تین دن ہو گئے ہیں۔ میں نے ناشتے کے ساتھ ہی چکن کو مسالہ لگا کر رکھ دیا تھا۔ ناشتے کے بعد انعم نے فون کا بتایا۔"

"چلیں بیٹے کے طفیل ہم بھی فرائیڈ چکن کھا لیتے ہیں۔"

"کیوں کیا آپ کی پسند کا کھانا کبھی نہیں بنا۔" زہرا بیگم نے مصنوعی ناراضی سے کہا۔

"ارے نہیں زہرا بیگم! میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔ بس پتا نہیں کیوں دل بہت دنوں سے بجھا بجھا سا ہے۔ مذاق کر کے ذرا دل بہلاتا ہوں۔"

"کیا ہو گیا ہے دل کو' آپ نے ذرا سی بیماری کو دل پر لے لیا ہے۔" شفیق احمد نے کوئی جواب نہیں دیا اور سر جھکا کر کھانا کھانے لگے۔ کھانے کے بعد زہرہ بیگم نے برتن سمیٹے

"میں کچھ دیر سوؤں گا۔"

"ٹھیک ہے' مجھے بھی ابھی نماز پڑھنا ہے۔"

زہرا بیگم دروازہ بند کر کے چلی گئیں۔ تو شفیق احمد نے بھی آنکھیں موند لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگے لیکن آنکھوں کے سامنے ایک ہی منظر آرہا تھا۔

وہ ویگن کے حادثے کی اطلاع پا کر فوراً ہی لاہور روانہ ہو گئے تھے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ رفیق احمد کی جیب میں آفس کا آئی۔ڈی کارڈ تھا حادثہ قصور سے نکل کر ایک ورکشاپ کے قریب ہوا تھا۔ ورکشاپ سے ہی کسی نے ان کے آفس فون کیا تھا اور وہاں سے رفیق احمد کے ایک کولیگ نے ان کے اسکول میں اطلاع دی۔ ان کے ہیڈ ماسٹر نے جنہیں بارہ بجے کی فلائٹ سے لاہور جانا تھا۔ ازراہ ہمدردی اپنا ٹکٹ انہیں دے دیا تھا۔ گیارہ بجے اسکول میں اطلاع آئی تھی اور وہ زہرا بیگم کو فون پر اطلاع دے کر اسکول سے ہی ائیر پورٹ چلے گئے تھے۔

انہیں یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ لاشیں لاوارثوں کی طرح پڑی ہوں گی۔ پتا نہیں قصور والوں کو بھی خبر ہوئی یا نہیں۔ آفس سے کوئی گیا یا نہیں۔ جہاز کی سیٹ مل جانے کی وجہ سے وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد جائے حادثہ پر موجود تھے۔ زخمیوں کو لے جایا جا چکا تھا۔ کچھ لاشیں لواحقین لے

گئے تھے اور کچھ ورکشاپ کے احاطے میں ویگن سے نکال کر چارپائیوں پر رکھ دی گئی تھیں۔ آفس سے رفیق احمد کے دوست اور کولیگ بھی کچھ دیر پہلے ہی پہنچے تھے اور ایمبولینس کے انتظار میں کھڑے تھے کہ وہ پہنچ گئے۔ صبر کی انتہائی منزلوں سے گزرتے ہوئے انہوں نے بھائی اور بھابھی کی شناخت کی۔

عبداللہ کا چہرہ گو مسخ ہو گیا تھا لیکن انہوں نے اس کے گلے کے تعویذ سے پہچان لیا۔۔۔ نظر کا یہ تعویذ ماں جی نے خود اپنے ہاتھوں سے اوپر کپڑا منڈھ کر انہیں دیا تھا۔ یہ پھولدار کپڑا اسی سوٹ کا ٹکڑا تھا جو آج صبح بھی وہ پہنے ہوئی تھیں۔ عبداللہ بہت خوبصورت تھا اور اسے نظر لگ جاتی تھی۔ ہر ہفتے اسے بخار چڑھ جاتا تھا۔ تب ایک بار جب وہ لاہور جا رہے تھے تو ماں جی نے یہ تعویذ دیا تھا۔۔۔ پھر وین میں کوئی اور بچہ بھی نہیں تھا۔ انہوں نے عبداللہ کو اٹھا کر بھابھی کے پہلو میں لٹا دیا تھا اور ایمبولینس آنے تک قصور سے بھی سب روتے پیٹتے آ گئے تھے۔

جب وہ ورکشاپ سے باہر بنے ایک ٹیلی فون بوتھ پر گئے تھے تا کہ قصور اطلاع دے سکیں تو وہ شخص ایک سوزوکی سے اتر کر اچانک ہی ان کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ ایک بچے کی انگلی تھامے بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ جب سوزوکی آگے بڑھ گئی تو وہ بچے کی انگلی تھامے تھامے ان کی طرف متوجہ ہوا۔

"بڑا شدید حادثہ تھا۔۔۔ شاید ہی کوئی بچا ہو۔ میں اس وقت قصور جا رہا تھا۔ آپ کے بھی کوئی عزیز تھے اس میں؟۔"

ماسٹر شفیق احمد نے کال کے پیسے پی۔سی۔او والے کو دیتے اس کی طرف دیکھا اور سر ہلا دیا۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"راولپنڈی سے۔"

انہیں اس آدمی پر غصہ آیا۔ ان کا بازو' ان کا بڑا عزیز از جان بھائی اپنے خاندان کے ساتھ ختم ہو گیا تھا اور یہ شخص۔۔۔

"بھائی۔۔۔! ایک مہربانی کیجیے گا۔" اجنبی نے ہاتھ جوڑ دیے۔

"میں جانتا ہوں' آپ اس وقت پریشان ہیں' شاید کوئی قریبی عزیز حادثے کا شکار ہوا ہے لیکن اس ننھے بچے کی جان خطرے میں ہے۔ میں اسے یہاں قصور میں ایک عزیز کے پاس چھوڑنے آیا تھا لیکن وہ عزیز فیصل آباد گئے ہوئے ہیں۔ دوست کے گھر والے مجھے نہیں پہچانتے سو۔۔۔ مجھے جلدی جھنگ پہنچنا ہے۔ دیر ہو گئی تو مجھ پر شبہ ہو گا۔ آپ بس اتنی مہربانی کیجیے گا کہ اسے کسی یتیم خانے میں داخل کروا دیجیے گا شاید اس طرح اس کی جان بچ جائے۔"

"تم خود لاہور میں اسے کسی یتیم خانے میں کیوں نہیں چھوڑ آتے۔"

ان کے ذہن میں آیا تھا گو انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن شاید وہ سمجھ گیا تھا۔

"میں نے بتایا نا دیر ہونے کا ڈر ہے کسی یتیم خانے کو تلاش کرنے اور ساری کارروائی میں بہت وقت لگ جائے گا میں نے کل رات اسے جھنگ میں ایک جگہ چھپا دیا تھا۔ گاؤں سے میری غیر حاضری پر شبہ کیا جا سکتا ہے۔"

اس نے وضاحت کی تو انہوں نے غیر ارادی طور پر بچے کی انگلی تھام لی تھی۔ ان کا ذہن فی الحال سوچنے سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ بچہ سہما ہوا اور خوفزدہ سا تھا۔ مگر ان کے سامنے تو جوان بھائی کی لاش تھی اور آنکھوں کے آگے بار بار اندھیرا آ رہا تھا اندر ماتم بپا تھا۔

"آپ کا نام اور پتا؟" اجنبی نے پوچھا۔ "اس کا تو سارا خاندان ختم ہو گیا ہے۔ باپ لاپتہ ہے۔ شاید مل جائے تو۔۔۔۔"

"ماسٹر شفیق احمد، ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول باغ سردار۔" وہ ان کا شکریہ ادا کرتا ہوا جلدی سے سامنے سے آنے والی سوزوکی کے ساتھ لٹک گیا اور پھر ساری کارروائی کے دوران وہ بچے کی انگلی غیر ارادی طور پر تھامے رہے تھے کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی نہ بچے کا پوچھا۔ حادثہ ہی ایسا ہولناک تھا۔

عبداللہ اور بھابھی کی لاشیں قصور والے لے گئے تھے۔ لاہور والے گھر کی چابی بھی انہوں نے بھابھی کے میکے والوں کے حوالے کر دی تھی۔ گھر کرائے کا تھا اور سامان بھابھی کے جہیز کا۔

"آپ گھر خالی کر کے سامان وغیرہ لے جائیے گا۔"

ایمبولینس میں بیٹھتے ہوئے بھی وہ بچے کی انگلی تھامے ہوئے تھے اور پھر وہ ان کے کندھے کے ساتھ لگے لگے سو گیا تو انہوں نے اسے گود میں لٹا لیا۔

کسی بڑے گھر کا لگتا ہے۔ کشادہ پیشانی، ہلکے گھونگھر والے بال۔۔۔ سفید رنگت اور بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں جنہیں لانبی پلکوں نے اور بھی خوبصورت بنا دیا تھا۔ گلابی ہونٹوں پر پپڑی جمی تھی انہیں بے اختیار اس پر پیار آ گیا۔

"یہ نازک پھول سا بچہ یتیم خانے میں رُلنے کے لیے نہیں ہے۔ میں اسے گھر میں رکھ لوں گا۔ بیٹا بنا لوں گا۔ اگر اس کا باپ آ گیا تو لے جائے گا نہیں تو پلتا رہے گا۔"

گھر میں کہرام مچا تھا۔ وہ بھائی کی میت لے کر گھر پہنچے تو تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ پھر کسی نے عبداللہ کو ان سے جھپٹ لیا۔

"میرا بیٹا! میرے رفیق کی نشانی! میرا عبداللہ!"

ماں جی اسے گلے سے لگائے رو رہی تھیں۔ اور جیسے خود ہی فیصلہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے لب سی لیے تھے۔ کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہاں کوئی عبداللہ کو پہچانتا نہیں تھا۔ بہت بچپن میں

جب وہ چھ ماہ کا تھا تب بھابھی اسے ساتھ لائی تھیں پھر تو وہ زیادہ تر ننھیال میں ہی رہا تھا۔ یوں اس اجنبی بچے کو ماں اور بیوی نے عبداللہ سمجھ کر سینے سے لگا لیا تھا۔

چند ہفتے تو وہ سہما رہا۔ راتوں کو چیخیں مار کر اٹھ جاتا۔ ماں جی اسے گود میں لے کر دم کرتیں۔

"ماں باپ کے حادثے سے سہم گیا ہے۔" ان کا خیال تھا بہت سارے دنوں بعد ایک روز جب وہ ان کے پاس بیٹھا تھا اور ماں جی نے پوچھا تھا۔

"عبداللہ بیٹا! دودھ پیو گے۔"

"میرا نام عبداللہ تو نہیں ہے۔" چار سالہ عبداللہ نے کہا۔ "میرا نام فہد ہے۔"

"نہیں تو عبداللہ ہی کہوں گی، میرے بیٹے نے یہ نام رکھا تھا۔ بہو کو پسند نہ تھا۔ وہ تب بھی کہہ رہی تھی کہ وہ نام بدل دے گی۔"

ماں جی نے فیصلہ سنا دیا تھا۔ اور اس رات عبداللہ کو پاس لٹا کر انہوں نے اسے بتایا تھا کہ وہ اس کے چچا جان ہیں۔۔۔ اور یہ کہ اس کے اماں، ابا کا انتقال ہو چکا ہے۔

"اور آسیہ خالہ اور نانو کا بھی۔ ہیں نا۔" اس نے پوچھا۔

انہوں نے بغور عبداللہ کو دیکھا تھا جس کی آنکھوں میں خوف تھا اور ڈر وہ یکدم ہی ان کے سینے سے لپٹ گیا تھا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"میں ہوں نا آپ کے پاس، پھر ڈر کیسا؟" انہوں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

"وہ ادھر تو نہیں آئیں گے اور آپ کو، دادو کو اور چاچی کو تو نہیں ماریں گے نا۔"

"نہیں بیٹا! ان کو یہاں کا پتا نہیں ہے۔"

کئی بار انہوں نے سوچا، وہ عبداللہ کے متعلق بتا دیں۔ لیکن پھر ماں جی کی اس کے ساتھ اتنی شدید محبت دیکھ کر انہیں ماں جی کو دکھ دینے کی ہمت نہ ہوئی۔ ماں جی جو اپنے بیٹے کی شباہت اور وجود کی حرارت کو اس کے وجود میں محسوس کرتی تھیں۔

کئی بار سوچا۔ زہرا بیگم سے ہی ذکر کر دیں۔ لیکن پھر انہیں عبداللہ کا خیال آ جاتا۔ کیا خبر حقیقت جاننے کے بعد زہرا اس سے اتنی محبت نہ کر سکے اور کیا خبر وہ ماں جی کو بتا دے۔۔۔ یوں طویل عرصہ تک وہ غیر ارادی طور پر منتظر سے رہے تھے کہ شاید کوئی اسے کھوجتا ہوا آ جائے۔ اکثر چپراسی سے پوچھتے کوئی مجھے پوچھتا ہوا تو نہیں آیا تھا لیکن کوئی کبھی بھی انہیں یا عبداللہ کو پوچھتا ہوا نہیں آیا تھا۔

عبداللہ بچہ ہی تو تھا چار سال کا۔ کچھ عرصہ میں سب بھول گیا تھا۔ وہ اتنا پیارا بچہ تھا کہ سب کو

ہی اس پر ٹوٹ کر پیار آتا تھا۔ اور زہرا بیگم کو تو وہ اتنا پیارا ہو گیا تھا کہ انعم کی پیدائش کے بعد بھی وہ اس کے اسی طرح لاڈ اٹھاتی تھیں..... اور خود عبداللہ ان کے گرد چکور کی طرح چکراتا پھرتا تھا۔ خود ماسٹر شفیق احمد کو بھی یہ یاد نہیں رہا تھا کہ وہ ان کا بھتیجا نہیں ہے۔ انہیں لگتا جیسے وہ سچ مچ رفیق احمد کا ہی بیٹا ہو۔ ایک طویل عرصہ وہ کسی کے منتظر رہے تھے اور پھر تو کبھی کبھی بے اختیار ان کے منہ سے دعا نکل جاتی تھی کہ عبداللہ کو کبھی کوئی ڈھونڈتا ہوا نہ آئے۔ ماں جی کی وفات کے بعد بھی انہوں نے زہرا بیگم کو عبداللہ کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔

رفیق احمد کے واجبات کے سلسلے میں انہیں لاہور جانا پڑا تو وہ قصور بھی گئے تھے لیکن بھائی کے سسرال والوں کا رویہ خاصا روکھا پھیکا سا تھا۔ وہ اس بات پر خفا سے تھے کہ رفیق احمد کی میت کو وہ راولپنڈی کیوں لے گئے اور حقیقت تو یہ تھی کہ اب ان کا کوئی تعلق بھی نہیں رہا تھا۔ بیٹی' نواسا' داماد کوئی بھی باقی نہیں رہا تھا۔ اور کوئی خونی رشتہ نہ تھا بالکل غیر لوگ تھے جہاں رفیق احمد کی شادی ہوئی تھی۔ اور کچھ اکھڑے سے تھے۔ مکان دو تین دن کے بعد ہی انہوں نے خالی کر دیا تھا۔ اور سامان لے گئے تھے۔ سو ان کے ساتھ تو تعلق ختم ہی تھا جو عبداللہ کا راز کھلتا۔ نہ وہ کبھی یہاں آئے اور نہ کبھی ادھر سے کوئی ادھر گیا۔

دو ایک بار ماں جی نے اپنی زندگی میں کہا بھی کہ وہ عبداللہ کو اس کے نانا' نانی سے ملوا لائیں۔ بچہ ہے وہاں ہی رہا ہے زیادہ منہ سے کچھ نہیں کہتا دل تو چاہتا ہو گا۔ لیکن ماسٹر شفیق احمد نے ٹال دیا۔

خدا نے انہیں بیٹا نہ دے کر کسی بڑی آزمائش سے بچا لیا ہے۔

وہ اکثر سوچتے۔

پھر شاید وہ عبداللہ سے اتنی محبت نہ کر پاتے۔ اب تو عبداللہ ہی سب کچھ تھا اور اب جب کہ وہ بھول چکے تھے کہ عبداللہ کہاں اور کن حالات میں ملا تھا کہ وہ اجنبی انہیں تلاشتا ہوا ان کے گھر پہنچ گیا تھا۔ کتنی ہی دیر تک تو وہ اپنے حواس پر قابو نہ پا سکے تھے۔ ان کا دل کسی انجانے خوف کے سائے تلے دبا کانپ رہا تھا۔

"ماسٹر صاحب! میں اس شہر میں آیا تو سوچا ملتا چلوں آپ کو۔"

"اتنے سالوں بعد بھائی۔" ماسٹر شفیق احمد کو خود اپنی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

اجنبی کچھ شرمندہ ہو گیا۔ اتنے برس بیت گئے تھے کہ اس کے سیاہ بالوں نے سفید رنگ اوڑھ لیا تھا اور وہ ننھا بچہ اب اونچا لمبا جوان تھا۔

"یہ لڑکا جو ابھی گیٹ پر کھڑا تھا' فہد ہی تھا نا۔" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"آپ..... آپ نے کیسے پہچانا۔"

"بالکل مولوی صاحب جیسا قد بت' ویسے ہی بال' ویسی ہی پیشانی اور ہونٹوں کی بناوٹ۔"

اور ماسٹر شفیق احمد انکار نہ کر سکے۔

"بھائی! میں نے اسے اپنا بیٹا بنا کر پالا ہے۔ میں نے بیٹا ہی سمجھا ہے۔"

آپ کی مہربانی ہے ماسٹر صاحب اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا بڑے اللہ والے بندے کی اولاد ہے یہ۔"

"کیسے آنا ہوا اس شہر میں؟" اندیشوں سے لرزتے دل کو بمشکل سنبھالتے ہوئے ماسٹر شفیق احمد نے پوچھا۔

"میری بہن کے سسرالی عزیز اسی محلے میں رہتے ہیں' عجیب اتفاق ہے کبھی ادھر آنا نہ ہوا۔ ادھر کوئی فوتگی ہو گئی تھی۔ بہن کے ساتھ آیا تو کل اچانک آپ پر نظر پڑی۔ میں نے آپ کو پہچان تو لیا تھا مگر سوچا کہیں مجھے دھوکا تو نہیں ہوا۔ سو آج آپ کے اسکول سے آپ کا پتا لیا اور آ گیا۔ سوچا فہد کے متعلق پتا کروں کہ آپ نے اسے کہاں چھوڑا تھا۔"

"کہیں نہیں میاں! سینے سے لگا کر رکھا ہے۔ جگر کا ٹکڑا ہے میرا۔" ماسٹر شفیق احمد نے آہستگی سے کہا۔ ان کا دل جیسے کوئی ہولے ہولے دبا رہا تھا۔

"یہ اس رب کی مہربانی ہے ماسٹر جی کہ آپ مل گئے ورنہ پتا نہیں کہاں رُل رہا ہوتا۔" اجنبی آبدیدہ ہو گیا تھا۔

"اکثر سوچتا تھا' مولوی صاحب کو روز محشر کیا جواب دوں گا۔ کیا کہیں گے عبدالقادر! ہم تو تمہیں اتنا چاہیں' اتنا خیال رکھیں اور تم سے ہمارے فہد کا خیال نہ رکھا گیا۔ اسے دنیا کی بھیڑ میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ آپ کا بہت شکریہ ماسٹر صاحب۔"

اس نے عقیدت سے ماسٹر شفیق احمد کے ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگائے۔ ماسٹر شفیق احمد ابھی تک متذبذب سے دل سنبھالے بیٹھے تھے۔

"اور کیا اب یہ عبداللہ کو ساتھ لے جانے کی بات کرے گا۔"

"اور اس کے والد کا پتا چلا تھا؟" انہوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہاں جی۔ پتا تو چل گیا تھا لیکن زندگی میں نہیں۔ ان کی موت کے بعد۔ ایک صبح ان کی لاش مسجد کے پاس پڑی ملی تھی۔" اور ماسٹر شفیق احمد نے اطمینان کا سانس لیا پھر بھی پوچھا۔

"اور اس کے کوئی اور عزیز و رشتہ دار۔"

"سارا کنبہ ختم ہو گیا تھا جی۔" عبدالقادر نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"ہاں رابعہ بی بی کہتی تھیں۔ شہر میں ان کا بڑا خاندان تھا۔ پر مجھے نہیں پتا جی۔ البتہ مولوی صاحب نے رابعہ بی بی کو ایک خط دیا تھا کہ عبدالقادر کو کہنا جب فہد ذرا سمجھ دار ہو جائے تو اسے

یہ خط دے دینا۔

وہ تو یہی سمجھتے تھے نا جی کہ مجھے خیر خبر ہے۔ میں تو بڑا شرمندہ تھا جی مولوی صاحب سے۔ بڑے مہربان تھے مجھ پر اور میں کام نہ آسکا جی ان کے۔ میں تو قید تھا جی۔ بڑے چوہدری صاحب نے تو مجھے بھی بند کر دیا تھا جی ادھر "شکار گاہ" مجھے اجازت ہی نہیں تھی ملنے جلنے کی' نہ کسی سے ملنے کی۔ دس بارہ سال میں شکار گاہ سے باہر نہ آیا۔ وہیں دیکھ بھال کرتا رہا۔ "شکار گاہ" کی اور جو آتا ان کی خدمت کرتا وہاں ہی۔ شروع شروع میں تو جی رات کو پاؤں میں زنجیریں ڈلوا دیتے تھے چوہدری صاحب! وہ کہتے تھے یہ تیری سزا ہے مولوی کی حمایت کرنے کی۔ اصل میں جی ان کو شک تھا پکا کہ میں نے فہد کو بھگایا ہے کہیں۔ پھر بڑے چوہدری صاحب وفات پا گئے تو چھوٹے چوہدری اعجاز نے بھی مجھے منع کر دیا تھا شکار گاہ سے نکلنے کو۔ پر پابندی نہیں رہی تھی جی۔ میں گھر بھی چلا جاتا تھا۔

ماں تو میرے غم میں مر گئی تھی۔ باپ بے چارہ غم کا مارا چارپائی پر پڑا کھانستا رہتا تھا۔ بہن بھائیوں سے مل ملاتا ـــ چوہدری اعجاز صاحب حویلی بھی بھیجتے رہتے تھے' وہاں ہی ایک بار رابعہ بی بی ملی تھیں تو انہوں نے یہ خط دیا تھا۔ انہوں نے ہی بتایا تھا کہ مولوی صاحب کا انتقال ہو گیا تھا حویلی کے تہہ خانے میں۔ پتا نہیں رابعہ بی بی سے کیسے ملاقات ہوئی تھی یہ تو پتا نہیں جی مجھے۔ پر تب سے یہ امانت تھی میرے پاس۔ پر سوچتا تھا کہاں ڈھونڈوں گا فہد میاں کو ـــ

پچھلے سال ملک صاحب کے ایک ڈاکٹر دوست شکار کی غرض سے آئے تھے اور "شکار گاہ" میں ٹھہرے تھے دس دن ـــ ان دنوں مجھے بخار تھا بہت انہوں نے چوہدری اعجاز کو بتایا تھا کہ مجھے ٹی بی ہے تو بس چوہدری صاحب نے مجھے فارغ کر دیا۔ چھوٹے بھائی نے لاہور میں علاج کروایا۔ اب تو بھلا چنگا ہوں۔ بہن کے ساتھ آیا ادھر تو خط بھی جیب میں ڈال لایا تھا جی کہ کیا پتا آپ کا یا فہد میاں کا اتا پتا مل جائے تو یہ امانت ان کے حوالے کر دوں۔"

ماسٹر شفیق احمد خاموشی سے اسے سن رہے تھے' وہ خاموش ہوا تو چونکے۔

"بھائی! مجھے ساری بات تفصیل سے بتاؤ۔"

"میرا نام عبدالقادر ہے ماسٹر صاحب ـــ"

اس نے بتانا شروع کیا اور شروع سے آخر تک فہد کو ان کے حوالے کرنے تک ساری بات دہرا دی۔

"بڑی ظالم دنیا ہے جی یہ۔"

اس نے کندھے پر پڑے رومال سے آنسو صاف کیے اور جیب سے خط نکال کر ان کے حوالے کر دیا۔ لفافہ بند تھا اور اس پر کوئی نام وغیرہ نہیں لکھا تھا۔ ماسٹر شفیق احمد نے خط پکڑ لیا۔

"دل پر یہ امانت بوجھ کی طرح دھری تھی۔ صد شکر اس رب کا کہ بوجھ اتر گیا۔ اب آپ چاہو تو فہد میاں کو خط دے دو' چاہو تو پھاڑ ڈالو۔ میں نے تو اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔"

ماسٹر شفیق احمد نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں نے محسوس کیا ہے۔ جی آپ نہیں چاہتے کہ فہد میاں کو کچھ پتا چلے۔"

"ہاں ہاں عبدالقادر! وہ اس گھر کو اپنا سمجھتا ہے اور سب جانتے ہیں وہ عبداللہ ہے۔ رفیق احمد کا بیٹا۔ میرا بھتیجا جو اس ویگن کے حادثے میں ختم ہو گیا تھا۔ میرے بھائی' ان کا بیٹا' ان کی بیوی سب ـــ اور پھر اب وہ تو یہ ساری حقیقت جان کر ڈسٹرب ہو جائے گا عبدالقادر! بہت حساس ہے وہ۔"

"ٹھیک ہے جی۔ ٹھیک ہے۔ آپ پڑھے لکھے ہو۔ جیسا مناسب سمجھو جی۔" عبدالقادر کھڑا ہو گیا۔

"بس ایک بار جی چاہتا ہے کہ فہد میاں کو قریب سے دیکھوں۔ گلے لگاؤں۔ میں تو مولوی صاحب کا خادم تھا۔ عقیدت مند تھا جی بہت۔"

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔"

انہوں نے کہا لیکن ان کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ کسی انجانے خوف سے سہم کر انہوں نے عبداللہ کو چائے یا پانی کے لیے بھی آواز نہیں دی تھی۔ تب ہی اندرونی دروازے پر دستک ہوئی۔

"ابا جان! چائے لے لیں۔" انہوں نے دروازہ کھول کر ٹرے پکڑ لی۔ اور کومل سے پوچھا۔

"عبداللہ کہاں ہے؟"

"جی وہ اندر ہی ہیں۔"

کومل مسکرا دی۔ عبداللہ کو کپڑے استری کرتے دیکھ کر وہ مسلسل مسکراتی رہی تھی۔

"ذرا بھیج دو انہیں۔"

"بیٹا! یہ تمہارے والد کے دوست ہیں تم سے ملنا چاہ رہے تھے۔"

عبدالقادر والہانہ آگے بڑھا تھا اور پھر اسے گلے لگا کر کسی عقیدت مند کی طرح اس کے ہاتھ چومے تھے۔

"جیتے رہو بیٹا! اپنے والد کا نام روشن کرو۔ وہ قادر مطلق ہے جسے چاہے زندگی دے اور جسے چاہے موت کے منہ سے بچا لے۔ اللہ نے تمہیں زندگی دی۔ رب کا شکر ہے۔"

عبدالقادر جذباتی ہو رہا تھا اور ماسٹر شفیق احمد گھبرائے گھبرائے سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"اچھا جی۔ اب اجازت ماسٹر صاحب۔"

عبدالقادر نے ہاتھ آگے بڑھایا تو ماسٹر شفیق احمد نے شکریہ کے اظہار کے طور پر اسے گلے لگا لیا۔

"عبدالقادر بھائی! کبھی اس شہر میں آؤ تو یہاں ضرور آنا۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھنا۔ عبداللہ سے ہی ملنے آتے رہنا بھائی۔ ہمارا تو کوئی عزیز رشتہ دار نہیں ہے۔ تم بھی چچا ہی ہو اس کے۔"

"جی اب تو آتا رہوں گا۔"

اور عبدالقادر رخصت ہو گیا تو عبداللہ بھی واپس پلٹ گیا۔ اس نے کوئی سوال وغیرہ نہیں کیا تھا۔ دراصل اسے ان کپڑوں کی فکر تھی جنہیں وہ استری کر رہا تھا اور کومل مسلسل اس کے قریب کھڑی ہنس رہی تھی کہ اسے کپڑے استری کرنے نہیں آتے بالکل بھی۔

"کون تھا؟" وہ اندر آئے تو زہرا بیگم نے پوچھا۔

"رفیق بھائی کا دوست تھا کوئی۔"

وہ مختصراً جواب دے کر ہاتھ میں پکڑا لفافہ لے کر اپنی الماری کی طرف بڑھ گئے تھے۔

عبدالقادر تو اپنا بوجھ اتار گیا تھا لیکن یہ بوجھ اب ان کے سینے پر دھرا تھا۔ دو ہفتے ہو گئے تھے۔

وہ عجب کشمکش میں مبتلا تھے، کبھی جی چاہتا وہ عبداللہ سے ساری حقیقت کہہ دیں اور کبھی سوچتے اسے کچھ نہ بتائیں۔ ان کا دل تو اسی روز کھٹک گیا تھا جب انہوں نے عبدالقادر کو اپنی طرف گھورتے دیکھا تھا۔ انہیں بھی شک گزرا تھا کہ اسے پہلے کہیں دیکھا ہے شاید۔۔۔۔ شاید اور اس سے آگے وہ سوچنا نہ چاہتے تھے لیکن اب تو ان کا شک صحیح ہو گیا تھا۔ گو عبدالقادر نے عبداللہ کو کچھ نہ بتایا تھا لیکن یہ جو پہاڑ جیسا بوجھ ان کے دل پر آ پڑا تھا۔

"اور اگر عبداللہ انہیں چھوڑ کر چلا گیا تو۔۔۔۔ وہ اس کی جدائی کیسے برداشت کریں گے اور زہرا۔۔۔ زہرا تو پاگل ہو جائے گی۔ تینوں بیٹیوں سے زیادہ وہ چاہا تھا اس نے عبداللہ کو۔ پتا نہیں اس برسوں پہلے لکھے گئے خط میں کیا لکھا تھا۔

کیا انہیں ایک باپ کے آخری خط کو اس کے بیٹے سے چھپانے کا حق ہے۔

اس کشمکش نے ہی انہیں بیمار کر ڈالا تھا۔۔۔۔ اور یہی ان کی ٹینشن تھی۔ ایک بار انہوں نے سوچا تھا کہ وہ خط کھول کر پڑھیں۔ ایک بار اسے پھاڑ کر پھینکنے کا ارادہ کیا۔ کتنی ہی دیر تک ہاتھوں میں پکڑے رکھا پھر اٹھ کر لاکر میں بند کر دیا۔

"نہیں، مجھے عبداللہ کو سب کچھ بتا دینا چاہیے۔" انہوں نے تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے فیصلہ کیا۔

"کچھ نہیں چھپانا چاہیے۔۔۔۔ اگر وہ ہمارا ہے تو حقیقت جان کر بھی ہمیں چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ لیکن اگر میں نے کچھ نہ بتایا تو یہ بوجھ جو عبدالقادر نے اتارا ہے قیامت تک میرے سینے پر

دھرا رہے گا۔"

اور پھر جیسے ایک فیصلہ کر کے وہ مطمئن سے ہو گئے اور انہوں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کروٹ بدل لی اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔

☆ ☆ ☆

رابعہ ملک منصور کی قبر پر آئی تھیں انہوں نے دو زانو قبر کے سرہانے بیٹھتے ہوئے سسکی سی لی اور سوچا۔

"منصور! تم تو نظر اٹھا کر بھی مجھے نہیں دیکھتے تھے، تم کہتے تھے۔ میری سمت بدل گئی ہے، تم مجھے الجھانے مت آیا کرو۔۔۔ رابی! میں تمہاری طرف ہی دوڑ رہا تھا۔ اندھا دھند کتنی ٹھوکریں لگیں مجھے۔ میں کتنی ہی بار پھر اٹھ کر دوڑ پڑا۔ لیکن جس طرف سے بھی تمہاری طرف لپکتا، وہ راستہ آگے بند ملتا۔ تب اس نے میری سمت بدل دی۔ بند گلی کی طرف بھاگنے کا کیا فائدہ ایسی سمت بھاگو جہاں راستے کھلے ہوں دور تک۔۔۔۔ تم کیوں آ جاتی ہو مجھے بے راہ کرنے۔ مت آیا کرو۔"

انہوں نے اپنے ہاتھ قبر پر رکھ دیے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی قبر پر چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ مٹی سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

"اور پتا ہے منصور! تمہارے راستے تو بدل گئے تھے لیکن میں تو تمہاری ہی سمت بھاگ رہی تھی۔ چھ سات سال کی دوری اور فراق کے بعد تمہیں دیکھا تھا تو جیسے سارے درد جاگ اٹھے تھے۔ جدائیوں کے سارے عذاب زندہ ہو گئے تھے۔ تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر خود پر سے اپنا اختیار ختم ہوتا جا رہا تھا۔ میں سوچتی تھی۔ پتا نہیں میں نے کیسے اتنے سال تمہارے بغیر گزار دیے۔ میرا جی چاہتا تھا تمہارے سامنے بیٹھی رہوں منصور! بھلے تم مجھے نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو میں تمہیں دیکھتی رہوں۔ تمہارے قدموں کی دھول کو اپنی آنکھوں سے لگاؤں۔ دید کی پیاسی آنکھیں تمہیں تکتی رہیں۔ اور پھر میں ہفتوں ان لمحوں کی خوشی کو جرعہ جرعہ پیتی رہتی۔ اور پھر آ جاتی۔"

تم نے میرے لیے اتنا عذاب سہا تھا منصور! وہ محبت جو تم نے مجھ سے کی تھی۔ اس کی ساری حدت اور شدت میرے دل میں اتر آئی تھی۔ محبت تو میں نے بھی تم سے کی تھی منصور! اور بابا جان کے انکار کے بعد میرا بھی جی چاہا تھا کہ میں مر جاؤں اور مہینوں میں روتی رہی تھی۔ اور راتوں کو جاگ کر تمہیں یاد کرتی تھی۔ میرے دل کا ایک کونا کہیں کھو گیا تھا منصور! لیکن تمہیں سامنے دیکھ کر مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرا تو سارا دل ہی کرچی کرچی ہو کر کہیں گر گیا ہے اور میں تو بغیر دل کے زندہ ہوں۔

تمہارے منع کرنے کے باوجود میں کسی نہ کسی بہانے تمہارے پاس پہنچ جاتی' کبھی بچے کے لیے دعا کروانے' کبھی اپنے لیے۔۔۔۔ کبھی پانی دم کرانے۔ میرا کتنا دل چاہتا تھا کہ تم بس ایک بار ایک بار نظر اٹھا کر مجھے دیکھو۔۔۔۔ ایسے ہی جیسے پہلے دیکھتے تھے۔ اتنی ہی محبت سے۔ تمہاری خوبصورت آنکھوں میں میرے لیے محبت کی قندیلیں جل رہی ہوں اور میں ان آنکھوں کی روشنیوں میں ڈوب جاؤں لیکن تم تو نگاہ ہی نہیں اٹھاتے تھے اور جو اٹھاتے بھی تو تمہاری نگاہیں کہیں اور دیکھ رہی ہوتیں۔

"تم کن منزلوں کے مسافر ہو گئے ہو منصور؟"

کچے صحن میں کھردری چارپائی پر تمہیں بیٹھے دیکھ کر مجھے تمہارا وہ ساری آسائشات سے سجا گھر یاد آجاتا اور میرا دل روتا۔

"ہم میں سے ہر ایک ایسی ہی منزل کا مسافر ہے رابعہ! بس ہم سمجھتے نہیں۔"

"تم واپس لوٹ آؤ مانی! میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں تحسین سے طلاق لے لوں گی۔ میں۔"

ایک روز میں نے تم سے کہا تھا۔ تب تم نے بہت تاسف سے مجھے دیکھا تھا۔

"اس راہ کے مسافر پلٹتے نہیں ہیں رابعہ! اس راہ کی پیاس میں بھی عجب لذّت ہے۔ تشنگی بھی شہد آگیں ہے رابعہ! پاؤں کے کانٹے بھی پھولوں کی طرح نرم لگتے ہیں۔"

"مگر میں کیا کروں منصور! میرے اندر تمہاری طلب جاگ اٹھی ہے میں۔۔۔۔"

"نماز پڑھا کرو رابعہ! اور خدا سے سکون کے لیے دعا کیا کرو۔"

"خدا نے پہلے کب ہماری دعائیں سنی تھیں۔ کتنی دعائیں مانگی تھیں۔ راتوں کو جاگ کر سجدوں میں رو رو کر۔"

"نہیں رابی! وہ دعائیں سنتا ہے۔ شاید ہماری دعا میں کہیں کوئی کمی رہ گئی ہوگی۔ مولوی ہدایت اللہ نے کہا۔ انہوں نے مجھے خدا سے مانگا اور خدا نے مجھے انہیں دے دیا۔ خدا نے ان کی دعا سن لی تھی۔ اس روز میں بہت رویا تھا۔ میں نے خدا سے دعا کی تھی کہ وہ میرے لیے کسی ایک سمت کا تعین کر دے۔ دونوں سمتوں کی کشش مجھے مارے ڈالتی ہے۔ ایک سمت اپنی طرف کھینچتی ہے اور دوسری اپنی سمت اور اس نے مجھے ایک راستے پر کھڑا کر دیا اور کہہ دیا۔ اسی پر چلتے رہو۔ اور آزمائش کے لیے وجود کا ایک حصہ دنیا سے بھی باندھ دیا۔ رابی!

لیکن منصور! میں ہاتھ اٹھاتی تو میرا دل چاہتا میں تمہیں بھولنے کی دعا نہ کروں۔ میں اللہ سے کہوں ربا! میرے دردِ محبت میں اضافہ کر۔ مجھے اس درد میں عجب لذت ملنے لگی تھی منصور اور رب نے میری دعا سن لی اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اس دردِ محبت میں اضافہ ہو گیا اور تم ہر

بار پہلے سے زیادہ اجنبی ہو کر ملتے۔ اور میں ہر بار تمہارے لیے اپنے اندر اور زیادہ محبت محسوس کرتی۔ تم نے میری اچھی بھلی زندگی کو ڈسٹرب کر دیا تھا منصور! تحسین بھی بیزار سے ہو گئے تھے۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے۔" وہ جھنجھلا جاتے۔

اور میں انہیں کیا بتاتی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ وہ میرے لیے موجود ہوتے ہوئے بھی ناموجود ہو گئے تھے۔ جیسے میں تمہارے لیے موجود ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں تھی۔ پھر تحسین یورپ چلے گئے۔ پہلی بار میں ان کے ساتھ نہیں گئی منصور لیکن جس روز وہ جا رہے تھے۔ انہوں نے کہا تھا۔

"رابعہ! میں واپس آؤں تو تم پہلے جیسی ملو مجھے۔ یہ آدم بیزار رابعہ مجھے نہیں چاہیے۔"

"مما! اب آپ ہم سے محبت نہیں کرتیں۔" میری بیٹی نے کہا تو میرا جی چاہا کہ میں تم سے کہوں۔۔۔۔ منصور تم یہاں سے چلے جاؤ۔ تم یہاں رہے تو میں اپنے مرکز سے ہٹ جاؤں گی اور جب کوئی سیارہ مرکز سے ہٹ جاتا ہے تو فضا میں ہی ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے مجھے ریزہ ریزہ ہونے سے بچا لو منصور۔۔۔۔ لیکن اس کی تو نوبت ہی نہیں آئی تھی منصور اور تم پہلے ہی غائب ہو گئے۔

گاؤں والوں کا خیال تھا۔ تمہیں مار کر تمہاری لاش کہیں پھینک دی گئی ہے اور میرا جی چاہا تھا کہ میں اپنے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو کھلا دوں۔ میں خدیجہ کے پاس جا کر پوچھنا چاہتی تھی کہ تم کیسے اور کب غائب ہوئے لیکن تمہارے خاندان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا۔ اس سے تو پہاڑ شق ہو جاتے۔ میں کیا تھی۔۔۔۔ میرا دل میرا ساتھ چھوڑ بیٹھا تھا۔

بارہ گھنٹے آئی۔ سی۔ یو میں رہنے کے بعد جب مجھے ہاسپٹل کے کمرے میں لایا گیا تو میرا جی چاہتا تھا۔ میں کہیں بھاگ جاؤں۔ اپنے آپ کو ختم کر لوں تم نہیں رہے تھے۔ تمہاری بیوی' تمہارا بچہ اور وہ سب جو زندگی کے سفر میں اچانک تمہارے اپنے بن گئے تھے۔ کوئی بھی تو باقی نہیں رہا تھا۔ تمہارا کون تھا جو تمہارا انتقام لیتا۔۔۔۔ میرے سوا۔۔۔۔

میں نے سوچا تھا مجھے مرنا نہیں چاہیے۔۔۔۔ مجھے تمہارے قاتلوں کو ڈھونڈنا چاہیے۔ تب میں نے اپنی قوتِ ارادی سے خود کو اٹھایا اور پانچ دن بعد گاؤں پلٹ کر آگئی۔ میں مسجد میں گئی اور مسجد سے باہر اس درخت کے پاس کھڑی رہی جہاں تم اکثر ٹیک لگا کر بیٹھا کرتے تھے۔ پھر میں نے عبدالقادر کو مسجد سے آتے دیکھا۔ یہ شخص بابا جان کا خاص ملازم تھا لیکن میں جانتی تھی کہ اسے تم سے کتنی عقیدت ہے۔۔۔۔ وہ میرا کوئی نہیں تھا۔ وہ تمہارا کوئی نہیں تھا لیکن ہمارے درمیان ایک رشتہ درد کا تھا جو مشترکہ تھا۔۔۔۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میرا دل چاہا۔ میں

اس سے لپٹ کر روؤں۔ خوب چیخ چیخ کر۔ اونچا اونچا بین کر کر کے۔۔۔ عبدالقادر میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھر گئیں اور ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے روتے رہے۔

"مولوی صاحب بہت اچھے تھے جی۔ اللہ والے۔"

"لیکن یہ سب کون ہے اس کا ذمہ دار عبدالقادر۔"

مجھے تو کچھ پتا نہ تھا میں تو ساتھ والے گاؤں میں رہتی تھی۔۔۔ اپنے سسرال میں۔

"وہ جی۔۔۔" وہ جھجکا۔

"آپ کو نہیں پتا جی۔ مولوی جی نے ماسی برکت کی طرف سے پرچا کٹوا دیا تھا۔ وارنٹ نکلوائے تھے چوہدری صاحب کے جی تو۔۔۔"

اور اسے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں سب جان کر حویلی آئی تو پتا چلا کہ بابا جان اور بھائی شکار گاہ گئے ہیں۔ میرے اندر تو آگ لگی ہوئی تھی۔ منصور! میں سیدھی شکار گاہ چلی گئی۔۔۔ وہاں بابا جان اور بھائی اعجاز تو نہ ملے تم مل گئے۔ ایک کمرے میں نڈھال رسیوں سے بندھے تمہارے پورے وجود پر نیل پڑے تھے۔

"منصور!"

میرے آنسو پلکوں کی باڑی پھلانگ کر رخساروں پر بہہ نکلے۔ میں ہر طرف سے بے نیاز ہو کر تمہارے پاس دوزانو بیٹھ گئی۔ تم نے آہستگی سے کہا۔

"مت روؤ۔۔۔"

تمہاری آنکھوں میں عجب روشنی تھی۔ میں نے پوری زندگی میں کوئی آنکھ اتنی روشن نہیں دیکھی مجھے لگا جیسے تمہاری آنکھوں میں ہزار وولٹ کے بلب جل رہے ہوں۔ تم نے میرے کندھے پر لٹکے بیگ کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔

"کیا اب بھی تمہارے بیگ میں قلم اور ڈائری ہوتی ہے۔"

میں نے قلم اور ڈائری تمہارے حوالے کی۔ تم نے ڈائری سے ورق پھاڑا۔۔۔ میں نے دیکھا۔ تمہاری انگلیاں کچلی ہوئی تھیں۔ لیکن تم نے اس ورق پر کچھ لکھا۔ تمہارے چہرے پر تکلیف کے آثار نہ تھے۔

"یہ عبدالقادر کو دے دینا کہ جب فہد سمجھ دار ہو جائے تو اسے دے دے۔"

"فہد۔۔۔ فہد کون؟ تمہارا بیٹا لیکن وہ تو۔۔۔"

"عبدالقادر کے پاس ہے۔" تم نے نگاہیں جھکا لیں۔

"اور اب تم جاؤ۔۔۔"

لیکن میں تو وہاں ہی کھڑی رہی۔ تم نے آنکھیں موند لی تھیں۔ تب ہی باہر گاڑیاں رکنے کی آواز آئی تو میں باہر صحن میں چلی آئی۔ بابا جان اور بھائی تھے۔

"بابا جان! میں آپ سے ملنے آئی تھی ادھر۔ اماں جان نے بتایا کہ آپ شکار گاہ میں ہیں۔"

"خیریت پتر! میں پہلے ذرا شہر چلا گیا تھا ایک کام سے۔"

"وہ بابا جان! مجھے پوچھنا تھا آپ نے تحسین کو تو نہیں بتایا میری بیماری کا پریشان ہو جائیں گے۔ اور مت بتایئے گا کچھ۔"

"اوہ نہیں پتر بتانا تو تھا۔ تحسین کہہ رہا تھا اگر ڈاکٹر کہتے ہیں تو یہاں بھجوا دیں۔ پر پتر! تو نے یہ کیا روگ لگا لیا۔۔۔ اتنی عمر میں۔"

انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ ہمیشہ ہی ان کے سینے سے لگ کر میں پگھل جاتی تھی منصور۔۔۔ میرا دل پانی ہو جاتا تھا میں کسی بات سے انکار نہ کر سکتی تھی لیکن اس روز ایسا نہ ہوا۔ میں الگ ہو گئی۔

"بس بابا جان! جو دکھ زندگی میں آنے ہوتے ہیں وہ تو آتے ہی ہیں۔ شاید بی۔ پی اچانک ہائی ہو گیا تھا۔"

"خیال رکھا کر اپنا پتر! تحسین گلہ کر رہا تھا۔ تو اپنا خیال نہیں رکھتی۔"

"آج حویلی رک جاؤ رانی!" بھائی اعجاز نے کہا تو میں انکار کر کے چلی آئی۔

"بچے گھر میں ہیں بھائی! پھر کبھی آ جاؤں گی۔"

"ہاں ہاں۔ تمہیں ڈاکٹر نے آرام بتایا ہے۔"

بابا جان مجھے باہر گاڑی تک چھوڑنے آئے تھے۔ میں گھر لوٹ آئی تھی۔ منصور مجھے کچھ سوچنا تھا۔ کچھ عمل کرنا تھا۔ میں نے عبدالقادر کو دوسرے دن بلوایا۔ میں نے سوچا تھا۔ عبدالقادر کے ذریعے تمہیں کسی طرح شکار گاہ سے نکال دوں منصور۔۔۔ لیکن تم تو کہیں اور ہی روانہ ہو گئے تھے۔

عبدالقادر نے سر جھکا کر روتے ہوئے بتایا۔ کل رات بابا جان نے اچانک اس کو شکار گاہ بلوایا تھا اور مولوی صاحب کی لاش دفنانے کو کہا تھا۔

"مولوی صاحب کے چہرے سے روشنیاں نکل رہی تھیں جی۔" اس نے بتایا تھا۔

گو بابا جان نے عبدالقادر سے کہا تھا کہ گڑھا کھود کر دبا دو لیکن اس کا دل نہیں مانا تھا اور گاؤں سے دوسرے لوگوں کو بلا کر انہوں نے تمہیں نہلا کر اور کفن پہنا کر نماز جنازہ پڑھ کر دفن کیا تھا۔

"فجر سے ذرا پہلے ہی ہم فارغ ہوئے ہیں جی۔"

عبدالقادر بتا رہا تھا اور میرا دل جیسے کہیں نیچے پاتال میں گرتا جا رہا تھا۔

اب کے میں بیس دن ہاسپٹل میں رہی تھی منصور! اور جب ہاسپٹل سے میں واپس آئی تو بچوں کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے۔

وہ میرے بغیر تو کچھ بھی نہیں تھے۔ مجھے لگا' میں تمہارے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک نہیں پہنچا سکتی۔ میں تو کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ سوائے رونے کے اور اللہ تھا کہ میرے دردِ محبت میں اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ جب میرا دل گھبراتا' میں جنگل میں اس تھوڑی سی اُبھری ہوئی مٹی کی ڈھیری کے پاس گھنٹوں بیٹھی رہتی۔

تحسین وطن آیا تو اس نے کہا۔ "رابعہ بیمار ہے اس کا دماغ صحیح نہیں ہے۔" اور دوسری شادی کر لی۔ اس روز جس دن تحسین اپنی نئی دلہن کے ساتھ حویلی آیا۔ میں نے بڑا سکون محسوس کیا۔ جیسے میں آزاد ہو گئی ہوں۔

تم نے دعا کی تھی نا منصور کہ اللہ تمہیں دنیاوی محبتوں سے آزاد کر کے تمہارے دل میں اپنی اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھر دے تو اللہ نے تمہاری دعا سن لی تھی۔ اس نے تمہارے دل کو شفاف کر دیا' ہر نقش مٹا دیا۔

میں نے بھی اپنے رب سے دعا کی تھی منصور کہ ربا! میری بیڑیاں کاٹ دے اور مجھے صرف اور صرف تمہارا کر دے اور میرے رب نے میری دعا سن لی تھی اور پھر میں نے یہاں مسجد کے قریب گھر بنا لیا تحسین کو میری ضرورت تھی اور نہ مجھے تحسین کی۔

شروع شروع میں بابا جان کے خوف سے وہ پندرہ دن بعد چکر لگاتا تھا لیکن میری خاموشی اور گریز نے اسے جلد ہی بیزار کر دیا۔ وہ بچوں کو ڈرائیور بھیج کر بلوانے لگا۔ پھر ایک روز اس نے مجھے طلاق دے دی۔

میں صبح صبح مسجد آ جاتی۔ تمہاری طرح جھاڑو دیتی اور وہاں بیٹھی رہتی جہاں تم بیٹھتے تھے۔ پھر میں نے مسجد کو سجانا سنوارنا شروع کر دیا۔ مجھے لگتا جیسے میں تمہاری خدمت کر رہی ہوں۔ میں نے بابا جان سے کہہ کر جنگل والی زمین مسجد میں شامل کر لی۔۔۔ تاکہ صحن وسیع ہو جائے۔

مزدوروں نے کہا۔۔۔ "یہاں قبر ہے۔"

میں تو جانتی تھی نا منصور۔۔۔! اور یوں تم میرے پاس آ گئے۔۔۔ میرے قریب۔۔۔ میں نے تمہاری قبر بنوائی۔ اس پر کوئی کتبہ نہیں ہے۔ ایک چھوٹا سا پتھر سرہانے کی طرف ہے۔ جس پر میں نے یونہی ایک روز مارکر سے موٹا موٹا لکھ دیا ہے۔

شالا مسافر کوئی نہ تھیوے
ککھ جناں توں بھارے ہوون

تم زندہ تھے تو میں ہر لحظہ تمہارے ہجر کی آگ میں جلتی تھی منصور اور تم مر گئے تو میرے

قریب آ گئے اور میں ہر روز تمہارے وصل سے سرشار ہوتی ہوں۔ مجھے یہاں تمہاری خوشبو آتی ہے۔ میں جب چاہوں تم سے مل لیتی ہوں۔ تم سے باتیں کر لیتی ہوں۔۔ اور دل کو سکون سا مل جاتا ہے۔

رابعہ ملک نے گیلے رخساروں کو انگلیوں کی پوروں سے پونچھا اور سر قبر پر رکھ دیا۔

اس وقت مسجد میں کوئی نہیں ہوتا تھا اور یہ ان کا معمول تھا کہ اپنے گھر کے پچھلے دروازے سے نکل کر وہ مسجد میں چلی آتیں' کبھی بہت سویرے آ کر جھاڑو دے دیتیں۔۔۔ چوہدری نیاز کو اس کا دکھ کھائے جاتا۔ وہ کبھی کبھار ان کے پاس آتے تو وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہتیں۔ وہ تحسین کو برا بھلا کہتے جس نے ان کی ہیروں جیسی بیٹی کی قدر نہ کی تھی۔ تو وہ عجیب نظروں سے انہیں دیکھتیں۔

"میرے مجرم تو آپ ہیں بابا جان اور بھائی کاش میں آپ کو سزا دینے پر قادر ہوتی۔"

"تم میری اکلوتی بیٹی ہو۔ اور تمہارا دکھ دیمک کی طرح میرے دل کو چاٹتا جا رہا ہے رابعہ! کسی دن میں ڈھے جاؤں گا۔"

"شاید یہ ہی قدرت کی طرف سے سزا ہو۔" وہ سوچتی تھیں۔

"میں کس سے اور کیسے انتقام لوں تمہارا منصور!"

اس نے یونہی سر قبر پر رکھے رکھے سرگوشی کی۔

عبداللہ مسجد میں داخل ہوا تو اس نے کسی قدر حیرت سے قبر پر سر رکھے آنسو بہاتی رابعہ ملک کو دیکھا اور پھر چند قدم آگے بڑھ کر ان کے پاس کھڑا ہو گیا۔ ایک اجنبی مسافر کی قبر پر سر رکھے رونا حیران کن تھا۔

"پھپھو!"

اس نے آہستہ سے آواز دی تو رابعہ ملک نے چونک کر سر اٹھایا اور عبداللہ کو حیرت سے دیکھا۔

"تم اس وقت۔؟"

"وہ میں پہلے گھر گیا تھا وہاں سے پتا چلا' اس وقت آپ مسجد میں ہوتی ہیں۔"

"ہاں۔ خیریت تو ہے تم اکیلے ہو یا سب آئے ہیں؟" رخساروں سے مٹی پونچھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"میں اکیلا ہوں۔ سب لوگ چلے گئے ہیں۔ کل صبح ہی چلے گئے تھے وہ۔۔۔ میں اور دانیال رک گئے تھے۔ دانیال بھی صبح چلا گیا۔ غلام دین کے گھر کی عورتیں اس کے ساتھ گئی ہیں۔ شہر میں اس نے ان کی رہائش اور حفاظت کا بندوبست کر دیا ہے۔ میں آپ سے بات کرنے کے لیے

رک گیا تھا۔ ابھی جاؤں گا۔"
"اور عبیر!؟"
"وہ تو صدف اور مامون کے ساتھ اپنی گاڑی میں چلی گئی تھی۔ میں اور دانیال رات قریبی قصبے میں ٹھہرے تھے۔ صبح ہی آئے ہیں۔ حویلی سے تو اکٹھے ہی رخصت ہوئے تھے۔"
"آؤ گھر چل کر آرام سے بات کرتے ہیں۔"
وہ مسجد کے پچھلے دروازے سے۔ جو صحن کے اس کونے میں تھا جہاں قبر تھی' نکلیں۔ عبداللہ بھی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ انہیں یہ تو معلوم تھا کہ غلام دین کی بیوہ اور بہن مجرموں کے خلاف کارروائی کرنے پر راضی ہو گئی ہیں۔ لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں۔ عبیر نے انہیں فون پر بتایا تھا کہ صدف نے اور اس نے انہیں رضامند کر لیا ہے اور انہوں نے ہی عبیر کو مشورہ دیا تھا کہ کوئی کارروائی کرنے سے پہلے ان کی حفاظت کا انتظام کر لینا۔
"ہاں اب بتاؤ۔" لاؤنج میں بیٹھتے ہوئے انہوں نے عبداللہ سے پوچھا۔ "تمہیں کیسی مدد چاہیے مجھ سے۔"
"یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم لیکن آپ نے کہا تھا کہ آپ میری مدد کریں گی اگر ضرورت پڑی تو۔ میں صرف آپ کو اپنا وعدہ یاد دلانے آیا ہوں اور یہ بتانے آیا ہوں کہ ہم نے چوہدری اعجاز کے خلاف پرچہ کٹوا دیا ہے۔ بے جا ظلم اور زیادتی کا۔ اور میں آپ سے یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ دوران مقدمہ اگر ہمیں آپ کی کسی قسم کی مدد کی ضرورت پڑی تو آپ پیچھے مت ہٹیے گا۔"
"کیا تمہیں یقین ہے کہ میں اپنے بھائی کے خلاف تمہارا ساتھ دوں گی۔ ہو سکتا ہے میں ایسا نہ کر پاؤں؟" رابعہ ملک مسکرائیں۔
"نہیں۔ مجھے یقین ہے۔"
"یہ یقین کیسے ملا تمہیں؟"
"آپ کی پیشانی پر لکھا ہے کہ آپ سچ کا ساتھ دیں گی۔ آپ کی شخصیت خود بتاتی ہے کہ آپ ظلم و بربریت کو پسند نہیں کرتیں۔ آپ کا وجود تو محبت کی مٹی سے اٹھا ہے۔ جو سراپا محبت ہو آپ کی طرح وہ ظلم کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ چاہے ظلم کرنے والے ہاتھ اس کے اپنے ہی کیوں نہ ہوں وہ انہیں قلم کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔" عبداللہ کا لہجہ یقین سے لبریز تھا۔
"وہ ہستی جو ایک اجنبی مسافر کے لیے رو سکتی ہے' وہ ہستی اپنے ہی گاؤں میں ہونے والے ظلم پر آواز بھی اٹھا سکتی ہے۔"
رابعہ ملک کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ایک لمحے کو آ کر ٹھہر گئی اور پھر معدوم ہو گئی۔

"تمہارا خیال صحیح ہے عبداللہ! لیکن میں جس کے لیے روئی ہوں۔ وہ مسافر ضرور ہے لیکن میرے لیے اجنبی نہیں ہے۔ یہ بات میں نے آج سے پہلے کبھی کسی سے نہیں کی۔"
"کیا آپ اس مسافر سے محبت کرتی تھیں؟"
عبداللہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

تم سے ہم کیا کہیں
تم کو معلوم کیا
ہم نے کاٹی ہے کیسے شبِ زندگی
ہم نے کیسے اٹھایا ہے بارِ وفا

رابعہ ملک نے نگاہیں اٹھائیں۔
"محبت تو بہت چھوٹا سا لفظ ہے اس جذبے کے لیے، جو میں اس کے لیے دل میں رکھتی تھی۔ اس شخص نے مجھے محبت کرنا سکھایا۔ مجھ پر محبت کے اصل معنی وا کیے۔ خیر یہ تو ایک الگ کہانی ہے پھر کبھی سہی۔" انہوں نے ہولے سے سر جھٹک کر کہا۔
"تم یہ بتاؤ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم اس طرح مجرموں کو کوئی سزا دلوانے میں کامیاب ہو سکتے ہو۔ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ بھائی اعجاز ملک کے حکم پر انہیں بے لباس کیا گیا اور غلام دین نے خودکشی کر لی۔ تمہارا مقدمہ تو بہت کمزور ہے عبداللہ۔ یوں کرو ایک پرچہ اور کٹواؤ چوہدری اعجاز کے خلاف قتل' اغوا' آبروریزی کا بلکہ ایک نہیں' تین قتل اور ایک شریف خاندان کی عورتوں کی بے حرمتی اور بے عزتی کا۔"
"آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔"
"صحیح کہہ رہی ہوں عبداللہ۔" رابعہ ملک نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔
"اور میں۔۔۔ میں گواہی دوں گی اس کی۔" ان کی آواز میں درشتی اور کسی گہرے غم کی آمیزش تھی۔
"یہ قتل آج سے چوبیس پچیس سال پہلے ہوئے۔" وہ ہولے ہولے بول رہی تھیں اور عبداللہ سن رہا تھا۔
ایک بار پھر اس کے کانوں میں چیخیں گونجنے لگی تھیں اور دھندلے دھندلے منظر آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے پھر ذرا ایک منظر واضح ہوا تو اس نے آنکھیں زور سے بند کر لیں۔ پھر ایک ننھا بچہ بھاگتا ہوا آنسو بہاتا اماں اماں پکارتا ہوا۔۔۔ اور پھر وہ ہاتھ جو بچے کو کھینچ رہے ہیں۔ پتا نہیں کتنے لمحے گزر گئے۔

"عبداللہ عبداللہ۔" اسے رابعہ ملک کی آواز دور سے آتی سنائی دی تو اس نے سر جھٹک کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"تم نے اس آگ کو بھڑکا دیا ہے جسے میں برسوں سے پتّے ڈھانپ ڈھانپ کر چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔"

"مگر آپ۔ آپ کیوں ایسا کرنا چاہتی ہیں؟" عبداللہ نے پوچھا۔

"عبیر کیوں ایسا کرنا چاہتی ہے عبداللہ! وہ کیوں اپنے سگے تایا کے خلاف تمہارا ساتھ دے رہی ہے؟" انہوں نے عبداللہ کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیا۔

"وہ بائے نیچر ایک اچھی لڑکی ہے۔ زندگی کی خوبصورتیوں، سچائیوں اور اچھائیوں سے محبت کرتی ہے اور ظلم سے نفرت کرتی ہے۔"

"ہاں۔ لیکن ایک اور بات بھی ہے عبداللہ! وہ تم سے محبت بھی کرتی ہے۔ تم حیران ہو رہے ہو نا کہ میں نے کیسے جانا تو میں نے اس کی اور تمہاری آنکھوں میں ایک دوسرے کا عکس دیکھا۔ محبت کرنے والے دوسرے محبت کرنے والوں کو پہچان لیتے ہیں۔۔۔ وہ تم سے محبت کرتی ہے سو تمہاری کسی بات کی نفی نہیں کرتی۔ اس نے تمہیں منع نہیں کیا، روکا نہیں۔۔۔ حالانکہ اگر وہ تمہیں منع کرتی تو شاید تم رک جاتے۔"

"شاید رک جاتا یا نہ رکتا۔"

"ویسے تم بتاؤ گے عبداللہ! کہ تم اس معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو۔ اتنی دور سے تم صرف اس لیے یہاں آئے ہو کہ ظلم کے خلاف آواز اٹھائی جائے۔"

"پتا نہیں کیوں۔" عبداللہ نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔

"ایسے یا اس ملتے جلتے واقعات کے متعلق پڑھتا ہوں تو میرا خون کھولنے لگتا ہے اور میرے اندر وحشت سی جاگ اٹھتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے میں ظلم کرنے والوں کے ہاتھ کاٹ دوں۔ ان کی آنکھوں کو اندھا کر دوں اور ان کے ہونٹوں کو سی دوں۔ یہ ظلم ہے بربریت ہے انسانیت سے گری ہوئی حرکت ہے۔"

"شہ۔ یہ حد سے بڑھی ہوئی حساسیت ہے۔" رابعہ ملک نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔

اس کی آنکھیں، اس کی پیشانی، بال اور ناک کے دائیں طرف ننھا سا تل۔۔۔ وہ آنکھیں بند کر کے دیکھ سکتی تھیں۔

پہلے روز انہیں لگا تھا جیسے اس میں کسی کی شباہت ہے۔ کچھ مانوس سے نقوش لگے تھے لیکن

اب یکایک ہی ادراک ہوا تھا کہ یہ شباہت تو۔۔۔

"تمہارا پورا نام کیا ہے عبداللہ۔"

"عبداللہ احمد۔"

"پتا نہیں میرے ذہن میں ابھی آیا تھا کہ تمہارا نام فہد ہونا چاہیے تھا۔"

اور ماہ و سال جیسے عبداللہ کو بہت پیچھے لے گئے۔ زہرا بیگم کی گود میں بیٹھے بیٹھے اس نے کہا

"نہیں۔ میرا نام عبداللہ نہیں ہے فہد ہے۔"

اور دادی نے کہا تھا۔

"عبداللہ میرے بیٹے نے نام رکھا تھا۔ میں تو عبداللہ ہی کہوں گی۔ بہو کو عبداللہ پسند نہ تھا۔ اس نے بدل دیا ہوگا۔"

"شاید میری امی مجھے فہد کہتی تھیں۔" عبداللہ خواب کی سی کیفیت میں بولا۔

"تمہاری امی!" رابعہ ملک نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں اپنے چچا چچی کے پاس رہتا ہوں۔ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد ان ہی کو دیکھا۔"

"تمہارے والدین کا انتقال کیسے ہوا؟"

"ویگن کے حادثے میں۔"

"نام کیا تھا ان کا۔ تم نے شاید بتایا تھا پہلے یاد نہیں۔"

"رفیق احمد۔"

"اوہ اچھا۔ بعض اوقات کسی شخص کی کسی کے ساتھ اتنی مشابہت ہوتی ہے کہ گمان گزرتا ہے کہ یہ شخص شاید اس کا کوئی عزیز رشتہ دار ہو۔"

"تو آپ نے جو کچھ کہا، وہ سچ ہے اور کیا میں برسوں پہلے ہونے والے قتل کا پرچہ کٹوا دوں۔ کیا آپ واقعی گواہی دیں گی۔۔۔ اور کیا یہ ممکن ہے کہ ہم جیت جائیں۔"

"میں گواہی دوں گی عبداللہ! لیکن مجھے صرف ایک بات کا خوف ہے کہیں تم اس چکر میں محبت کی بازی ہار نہ جاؤ۔"

لمحہ بھر کے لیے عبداللہ کو لگا جیسے اس کا دل بند ہو گیا ہو۔

"تم عبیر کے خاندان کو کورٹ میں لاؤ گے تو کیا عبیر تمہاری زندگی میں شامل ہو سکے گی جبکہ پہلے بھی اس کے امکانات ففٹی پرسنٹ بھی نہیں ہیں۔ یہ ففٹی پرسنٹ بھی میں نے اس لیے کہا کہ عبیر کے بابا جانی تھوڑے مختلف مزاج کے ہیں۔ ورنہ تو ایک پرسنٹ بھی امید نہیں ہے اور جب تم غلام دین کی فیملی کی طرف سے کیس لڑو گے۔ جب تم اعجاز بھائی پر قتل کا الزام

لگاؤ گے تو عبیر کی طرف جانے کے تو سارے راستے بند ہو جائیں گے۔۔۔۔ میں نہیں جانتی کہ تم اور عبیر محبت کے کس مقام پر ہو لیکن محبت نے تم دونوں کے وجود کے گرد ہالہ بنا رکھا ہے۔"

"آپ حوصلہ بھی دیتی ہیں۔ ہمت بھی بڑھاتی ہیں اور پھر مایوس بھی کر دیتی ہیں۔" عبداللہ نے دل گرفتی سے کہا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے کہا تھا کہ تمہارا کیس کمزور ہے۔ ایک قتل کا پرچہ بھی کٹوا دو۔۔۔۔ میں گواہی دوں گی۔۔۔۔ اور ابھی آپ پاؤں تلے سے زمین کھینچ رہی ہیں۔"

"اس لیے کہ مجھے ابھی ابھی اچانک ادراک ہوا کہ اس طرح تو تم محبت کی بازی ہار جاؤ گے اور محبت ہارنے کا دکھ۔۔۔۔ شاید سارے دکھوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ تمہاری بھائی اعجاز سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے عبداللہ! انہوں نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔"

"انہوں نے انسانیت کی تذلیل کی ہے اور ابھی آپ نے بتایا کہ انہوں نے مولوی اللہ یار جیسے نیک نفس آدمی کو اذیتیں دے دے کر مار ڈالا۔"

"ہاں؟" رابعہ ملک کے ہونٹ ایک دوسرے میں سختی سے پیوست ہو گئے۔ اور تھوڑے سے توقف کے بعد انہوں نے کہا۔ "ابھی میں نے کہا تھا کہ برسوں سے جس آگ کو میں پترے رکھ رکھ کر ڈھانپ رہی تھی' وہ بھڑک اٹھی ہے۔۔۔۔ وہ اب بجھنے والی نہیں۔ میں اتنے سالوں سے خاموش تھی غلام دین کے خاندان کے ساتھ ہونے والے واقعہ نے میرے زخموں کے منہ بھی کھول دیے ہیں۔۔۔۔ اور ہر زخم سے خون رستا ہے۔ لیکن عبداللہ میں تمہاری اور عبیر کی محبت کو بچانا چاہتی ہوں۔ عبیر مجھے سارے بھائیوں کی اولاد سے زیادہ پیاری ہے اور ہمارے درمیان دوستی بھی بہت ہے۔ لیکن اس نے کبھی اپنا بھید مجھے نہیں دیا۔۔۔۔ وہ مجھے بتا دیتی تو میں پہلے ہی تمہیں منع کر دیتی تم اس آگ میں کودو گے تو بہت کچھ ختم ہو جائے گا۔

عبداللہ۔۔۔۔! تم ہر آن خطرے کی زد میں ہو گے۔ مجھ سے یہ کیسی بھول ہوئی۔ میں نے کیوں سب کچھ تمہارے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ مجھے ابتدا میں ہی تم کو اور عبیر کو منع کر دینا چاہیے تھا۔۔۔۔ تم درمیان سے نکل جاؤ۔ تم سب۔۔۔۔ غلام دین کے خاندان والوں کو میں سپورٹ کروں گی۔۔۔۔ میں حفاظت کروں گی اور میں ان کی طرف سے لڑوں گی۔"

عبداللہ خاموشی سے انہیں سن رہا تھا۔ انہوں نے بات ختم کی تو کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں الجھ گیا ہوں۔ دانیال میرا انتظار کر رہا ہو گا۔ میں راولپنڈی جا کر آپ کو فون کروں گا۔۔۔۔ لیکن میں صرف ایک بات جانتا ہوں کہ جب قدم اٹھ جائیں تو پھر پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔ پھر بھی میں ملک صاحب سے جا کر مشورہ کروں گا۔ میں بھی طفلِ نو آموز

ہوں۔ مجھے بہت سی باتوں کا علم نہیں ہے میں نہیں جانتا کہ یہ سب کیسے کروں گا۔ فی الحال یہاں شہر کا ایس۔ پی دانیال کا جاننے والا نکل آیا ہے ہم نے تھانے میں اس ظلم کے خلاف باقاعدہ رپورٹ کروا دی ہے۔۔۔۔ آگے ہمیں کیا کرنا ہے۔ اس کے لیے ہمیں ملک صاحب کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ چوبیس پچیس برس پہلے ظلم کا نشانہ بننے والے خاندان کے ساتھ یقیناً" آپ کا دلی تعلق رہا ہو گا ایسا گہرا تعلق جس نے آپ کے اندر آگ بھڑکا دی ہے آپ اپنے ہی بھائی کے خلاف عدالت میں گواہی دینے کو تیار ہیں۔ لیکن یہ خون کے رشتے بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ میں سمجھوں گا' آپ نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ میں پھر فون کروں گا اور جہاں تک میری بات ہے' میں نے جو قدم اٹھا لیا ہے پیچھے نہیں ہٹوں گا' رہی محبت تو محبت اگر میرے مقدر میں ہے تو مجھے ضرور ملے گی اور اگر اسے مجھ سے بچھڑنا ہی ہے تو پھر ہر حال میں بچھڑ جائے گی۔"

رابعہ ملک نے ایک ستائش بھری نظر اس پر ڈالی اور خاموشی سے کھڑی ہو گئیں۔

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ اور دوبارہ یہاں مت آنا۔ فون پر رابطہ کرنا۔۔۔۔ یہاں کی ہوائیں بھی تمہاری دشمن بن جائیں گی۔ اور محتاط رہنا اور جو بھی فیصلہ کرو اس سے مجھے آگاہ ضرور کرنا ہے۔ اس لیے کہ ایک فیصلہ میں نے بھی کیا ہے۔۔۔۔ اور مجھے بھی قرض اتارنا ہے۔

یہ بار وفا' ہم نے کیسے اٹھایا ہے
اور کاٹی ہے کیسے شبِ زندگی"

ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی اور وہ انہیں خدا حافظ کہتا ہوا لاؤنج سے نکل کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

"یہ۔۔۔۔ یہ سب کیا ہے عبداللہ! یہ تم کیا کر رہے ہو۔ مت کرو ایسا۔ کس نے بتایا ہے تمہیں' سب۔ یہ اتنی پرانی باتیں کہاں سے ڈھونڈ نکالی ہیں تم نے۔" عبیر روہانسی ہو رہی تھی۔

"میں جو کچھ کر رہا ہوں عبیر! ٹھیک کر رہا ہوں۔" عبداللہ نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"یہ غلط ہے۔ تایا جان قاتل نہیں ہو سکتے۔"

"یہ غلط نہیں ہے عبیر! ان کی فردِ جرم بہت لمبی ہے۔"

"تمہاری اطلاعات غلط بھی تو ہو سکتی ہیں۔" عبیر کی آواز دھیمی تھی۔

"نہیں عبیر! میری اطلاعات غلط نہیں ہیں' تمہارے تایا جان کے نامۂ اعمال میں ایک

نہیں کئی خون ہیں۔"

"مگر عبداللہ! تم نے سوچا ۔۔۔ تم یہ سب کرو گے تو ہمارے درمیان نہ ختم ہونے والی دوریاں پیدا ہو جائیں گی۔ فاصلے تو پہلے بھی پاٹنے مشکل تھے اب تو ناقابل عبور ہو جائیں گے۔"

"مگر یہ بات تمہیں پہلے سوچنا تھی نا۔"

"مگر تب مجھے کیا پتا تھا عبداللہ کہ وہ بااثر زمین دار تایا جان ہوں گے اور میرا خیال یہ بھی تھا کہ رپورٹ غلام دین کے گھر والے کریں گے اور تم صرف انہیں سپورٹ کرو گے تحفظ دو گے اور میں نے سوچا تھا ایک دفعہ تنبیہہ ہو جائے تایا جان کو بھی تاکہ آئندہ ایسا واقعہ نہ ہو۔ میں نے تو سوچا تھا عبداللہ کہ میں تمہیں منع کر دوں گی کہ تم سامنے نہ آنا لیکن یہ تو سب ۔۔۔ تم کر رہے ہو۔ بابا جان کو تو بہت غصہ آئے گا عبداللہ! وہ تو بہت ناراض ہوں گے۔ ابھی تک میں نے ان سے تمہارا نام بھی نہیں لیا تھا لیکن اب وہ کسی ایسے شخص کا نام سننا بھی گوارا نہیں کریں گے جس نے ان کے خاندان کا نام اچھالا۔ تم نے میرے لیے کتنی مشکلات پیدا کر دی ہیں عبداللہ!"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"یہ سب جو تم نے ابھی کچھ دیر پہلے ظفر انصاری کو دیا ہے یہ جب کل کے اخبارات میں چھپے گا تو کیا بابا جان مجھے آنے دیں گے چیمبر۔ ملنے دیں گے تم سے ۔۔۔"

عبداللہ ہونٹ بھینچے بیٹھا رہا۔

"آخر ۔۔۔ آخر کیا ضرورت تھی عبداللہ! تمہیں پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی۔ ایک شخص جسے قتل ہوئے، مرے چوبیس پچیس سال ہو گئے ہیں جس کے خاندان کا کوئی فرد زندہ نہیں۔ تم اس شخص کے قتل کے مدعی بن رہے ہو۔ کیا رشتہ ہے تمہارا اس سے؟"

"تم پوچھ رہی ہو کیا رشتہ ہے میرا اس سے؟" عبداللہ نے یکایک سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"وہ شخص جسے تمہارے تایا جان نے اذیتیں دے دے کر مارا جس کے خاندان کی عورتوں کو ۔۔۔ وہ شخص میرا باپ تھا۔" ضبط کی کوشش میں اس کا چہرہ تپ کر سرخ ہو گیا تھا۔

"نہیں۔" عبیر نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"ہاں عبیر! وہ شخص میرا حقیقی باپ تھا۔" عبداللہ کی آواز میں بہت سارے آنسوؤں کی نمی تھی۔

"مگر تم ۔۔۔ تمہیں کیسے پتا چلا؟ کس نے بتایا تمہیں۔" عبیر کے لہجے میں ابھی بھی بے یقینی تھی۔

"مجھے کیسے پتا چلا ۔۔۔" عبداللہ نے آہستگی سے کہا اور سوچ میں ڈوب گیا۔

وہ سلطان نگر سے واپس آیا تو بہت الجھا ہوا تھا۔ رابعہ ملک کی باتیں بے ربط تھیں جو ان کے

ذہنی انتشار کا پتا دیتی تھیں ۔۔۔ پھر بھی پتا نہیں کیوں اسے یقین سا تھا جیسے رابعہ ملک کو اگر اس نے مدد کے لیے پکارا تو د س کی مدد کو ضرورت آئیں گی چاہے ان کا اپنا ہی آشیاں بجلیوں کی زد میں آ جائے لیکن ان کے لہجے میں سچائی تھی۔ اور وہ حوصلہ مند لگتی تھیں۔ کسی اندرونی دکھ نے انہیں بہادر بنا دیا تھا۔ وہ قتل کا حساب بھی لینا چاہتی تھیں اور اس کی محبت کو بھی طوفانوں کی زد سے بچانا چاہتی تھیں۔

لیکن اس کی محبت تو پہلے ہی طوفانوں کی زد میں تھی۔ آنے والی جدائی کی ہوائیں تو بہت پہلے سے کہیں چل رہی تھیں۔ عبیر کو پہلے یقین تھا کہ اس کے بابا جان اس کی بات نہیں ٹالیں گے لیکن اس کے دل نے تو اسی روز ایک بیٹ کھو دی تھی جب اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ وہ عبیر سے محبت کرنے لگا ہے حالانکہ اس نے خود کو کتنا سمجھایا تھا۔ کتنا روکا تھا اس سمت بڑھنے سے۔ لیکن کچھ باتیں تو خود بخود ہو جاتی ہیں ۔۔۔ وہ چند کمزور لمحوں کی زد میں آ کر اپنے جذبے عیاں کر بیٹھا تھا ۔۔۔ اس خوش کن احساس کے ساتھ کہ عبیر بھی اسے چاہتی ہے یہ دکھ بھرا احساس بھی کہیں موجود تھا کہ یہ ساتھ بہت طویل نہیں ہے اس محبت کا انجام طویل جدائی اور فراق ایک نہ ختم ہونے والا ہجر ہے پھر بھی محبت کی کشتی اُمید و ناامیدی کے سمندر میں ڈول رہی تھی اور رابعہ ملک نے تو جیسے اس کے سامنے دو راستے رکھ دیے تھے ۔۔۔ محبت کی یا اپنے کاز کی جیت۔ اور وہ ابھی تک الجھا ہوا تھا۔ اندھیرے میں تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

دانیال وہاں ہی گاؤں سے قریبی شہر میں رک گیا تھا۔ اپنے ایک عزیز کے ہاں تاکہ معاملہ آگے بڑھائے اور وہ چچا جان کی طبیعت کی خرابی کے پیش نظر واپس آ گیا تھا اور پھر اس نے ملک صاحب سے بھی مشورہ کرنا تھا۔ اسی الجھن میں اس روز وہ یونہی بے دھیانی میں سوچتا ہوا بے اختیار زہرا بیگم سے پوچھ بیٹھا تھا۔

"میرے والدین کا انتقال کیسے ہوا تھا؟"

"بیٹا! آپ کو پتا ہی ہے ویگن کے حادثے میں بھائی رفیق اور بھابھی جان سے گزر گئے تھے۔"

"امی جان! کہیں آپ مجھ سے کوئی بات تو نہیں چھپا رہیں۔ کہیں کوئی اور ہولناک حادثہ تو ان کے ساتھ پیش نہیں آیا تھا؟"

"کوئی اور حادثہ!" زہرا بیگم نے کسی قدر حیرانی سے کہا۔ "یہ بھی بہت ہولناک حادثہ تھا عبداللہ! تمہارے چچا جان تو حادثے کی خبر سنتے ہی لاہور روانہ ہو گئے تھے۔"

زہرا بیگم حادثے کی تفصیل بتانے لگیں اور ذرا فاصلے پر بیٹھے اخبار پڑھتے شفیق احمد نے چونک کر عبداللہ کو دیکھا۔

"یہ عبداللہ نے ایسا سوال کیوں کیا۔ کہیں عبدالقادر تو نہیں ملا اسے۔"

"عبداللہ بیٹا! ابھی کچھ دیر پہلے تم نے اپنی امی جان سے وہ سوال کیوں کیا۔۔۔"
"کون سا؟" عبداللہ کے ذہن سے نکل گیا تھا کہ اس نے کیا پوچھا تھا۔
"وہی اپنے والدین کی وفات کے متعلق۔"
"یونہی چچا جان! بس پتا نہیں کیوں کبھی کبھی میں الجھ سا جاتا ہوں۔ مجھے اپنے کانوں میں چیخیں سنائی دیتی ہیں۔۔۔ بین کرنے کی اور رونے کی آوازیں۔ پھر۔۔۔۔"
"جب وین کا حادثہ ہوا تو تمہاری عمر تقریباً" چار سال تھی۔" ماسٹر شفیق احمد نے پرخیال انداز میں اسے دیکھا۔ "گو اتنی عمر کے بچے کو اپنا اپنے والدین کا نام وغیرہ سب پتا ہوتا ہے۔۔۔ لیکن اتنی عمر کی باتیں یاد تو نہیں رہتیں۔ کیا تمہیں کچھ یاد ہے۔"
"نہیں۔ کچھ نہیں چچا جان! بس چند دن قبل یونہی میرے ذہن میں آیا جیسے بچپن میں میری امی مجھے فہد کہہ کر بلایا کرتی تھیں' میرے والدین نے میرا نام فہد عبداللہ رکھا ہو۔"
"ہاں تمہارا نام فہد ہی تھا۔" ماسٹر شفیق احمد نے آہستگی سے کہا اور بہت گہری نظر اس پر ڈالی۔
وہ خاموشی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے شفیق احمد یونہی کچھ سوچتے رہے جیسے بات کرنے کے لیے لفظ ڈھونڈ رہے ہوں اور ان کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ بات کیسے شروع کریں۔
"جی چچا جان! جو کچھ آپ کہنا چاہتے ہیں بلا جھجک کہیے۔۔۔۔"
اور تب شفیق احمد نے وین کے حادثے سے لے کر چند دن قبل عبدالقادر کی آمد تک سب بات اس سے کہہ دی۔
وہ ساکت سا بیٹھا سن رہا تھا۔ اس کے اندر آندھیاں چل رہی تھیں اور جھکڑ تھے۔
"عبداللہ! آج تک میں نے تم نے یہ بات اس لیے نہیں کہی تھی کہ مجھے کچھ علم نہ تھا کہ تم کون ہو۔ تمہارے والدین کون تھے ان کے ساتھ کیا ہوا۔ تمہیں کچھ بتانے کا فائدہ نہ تھا۔۔۔ اور عبدالقادر کے آنے کے بعد میں اپنے میں ہمت نہیں پا رہا تھا۔ مجھ میں تم کو خود سے اور سب سے جدا کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔ تمہاری امی جان تمہارے بنا کیسے رہیں گی۔ بچیاں تو رو رو کر پاگل ہو جائیں گی۔
عبداللہ! یہ سچ ہے کہ تم سے ہمارا کوئی خونی رشتہ نہیں۔ لیکن یہ بات صرف میں جانتا ہوں اور اگر سب بھی جانتے ہوتے تو ہم نے تو کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہیں سوچا کہ تم ہمارے اپنے نہیں ہو۔۔۔ تم سے بچھڑنا ہمارے لیے بہت اذیت ناک ہے جیسے ساری روشنیاں ایک دم بجھ جائیں اور اندھیرا ہی اندھیرا ہو۔۔۔ سب اطراف۔
لیکن عبداللہ! میں تم سے تمہارا خاندان' تمہاری پہچان نہیں چھپانا چاہتا تھا۔ یہ تمہارا حق

اور حقیقتیں ہمیشہ چھپ تو نہیں سکتیں۔ کبھی نہ کبھی ظاہر ہو ہی جاتی ہیں۔۔۔ پھر۔۔۔ وہ جو فیصلہ کر چکے تھے کہ۔ عبداللہ واپس آئے گا تو سب کچھ کہہ دیں گے۔ ساری حقیقت عبداللہ کو بتا دیں گے۔ اب اتنے دنوں سے خود میں ہمت ہی نہیں پا رہے تھے کچھ کہنے کی مگر آج پھر انہوں نے سوچا کہ وہ عبداللہ کو بتا دیں۔ یوں بھی وہ جب سے سلطان نگر سے آیا تھا الجھا الجھا تھا۔
کیا خبر سلطان نگر میں عبدالقادر اسے مل گیا ہو۔ ہو سکتا ہے وہ بے اختیاری میں کچھ کہہ بیٹھا ہو۔
وہ دل ہی دل میں فیصلہ کر کے اخبار ایک طرف رکھ کر اٹھے۔
"عبداللہ! ناشتے سے فارغ ہو کر ذرا میرے پاس آنا میں ادھر ڈرائنگ روم میں ہوں۔"
ایک دم ہی بہت ساری تھکن ان کے اندر اتر آئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں چلے گئے چونکہ یہ ذرا الگ تھا اور ادھر کسی کے آنے کا امکان بھی نہ تھا۔ سو وہ عبداللہ سے آرام سے سب کچھ کہہ سکتے تھے۔ عبداللہ نے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھا اور زہرا بیگم سے کہا۔
"اچھا امی جان! میں چچا جان کی بات سن کر ادھر سے ہی چلا جاؤں گا۔"
"مگر کہاں بیٹا! آج تو اتوار نہیں ہے کیا؟"
"جی امی جان! مجھے دانیال اور مامون کی طرف جانا ہے۔ ایک کیس پہ کام کر رہے ہیں ہم۔ اسی سلسلے میں کام ہے۔"
"کھانے پر تو آجاؤ گے نا؟"
"معلوم نہیں۔ آپ انتظار مت کیجئے گا۔"
"بیٹا! ہفتے میں ایک دن تو سب مل بیٹھتے ہیں کھانے پر۔ تم نہیں ہوتے تو بچیاں اداس ہو جاتی ہیں اور کومل تو باقاعدہ سارا وقت بسورتی رہتی ہے۔ بھئی جان کے بغیر اچھا نہیں لگ رہا۔ کوئی نہ کوئی ڈش تمہاری پسند کی خود بناتی ہیں۔"
"ٹھیک ہے امی جان! کوشش کروں گا۔"
اور یہ ساری محبتیں میرے لیے ہیں۔ پھر پتا نہیں کیوں میں الجھ رہا ہوں۔
وہ دل ہی دل میں سوچتا ڈرائنگ روم میں آیا تو شفیق احمد کو مضطرب سا کمرے میں ٹہلتا ہوا پایا۔
"خیریت ہے چچا جان! آپ پریشان لگ رہے ہیں؟"
"ہاں۔۔۔ نہیں۔۔۔ تو۔" انہوں نے بے ربط سی بات کی اور پھر مڑ کر اندر گھر کی طرف کھلنے والا دروازہ بند کر دیا۔ عبداللہ کچھ حیرت اور پریشانی سے انہیں دیکھتا ہوا بیٹھ گیا۔

ہے۔ تمہارے والد کون تھے۔۔۔۔ کہاں سے اس گاؤں میں آکر بس گئے تھے۔۔۔ اس کا علم عبدالقادر کو نہیں تھا۔ پہلے وہ سمجھتا تھا کہ وہ مولوی ہدایت اللہ کے بھتیجے ہیں۔۔۔ مگر بعد میں اس کا خیال تھا کہ یہیں وہ مولوی ہدایت اللہ کے لیے بھی اتنے ہی اجنبی تھے جتنے اس کے لیے۔۔۔ وہ خط جو تمہارے والد نے تمہارے لیے دیا تھا وہ میرے کمرے کے لاکر میں ہے۔۔۔ شاید اس میں انہوں نے کچھ لکھا ہو اپنے خاندان کے متعلق۔ اگر تم اپنے خاندان میں جانا چاہو گے تو۔“ ماسٹر شفیق احمد کی آواز بھرا گئی اور وہ سر جھکا کر آنسو روکنے کی کوشش کرنے لگے۔

”چچا جان!“ عبداللہ نے شاکی نظروں سے انہیں دیکھا۔ ”آپ نے یہ کیسے سوچا کہ میں آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔۔۔ امی جان اور آپ ہی میرے والدین ہیں۔ اپنے عزیزوں کے متعلق جاننے کی خواہش تو فطری ہے چچا جان! لیکن یہ گھر اور آپ میرے ہیں۔ آپ مجھے گھر سے نکالیں گے بھی تو نہیں جاؤں گا۔“

وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بھی نکلنے کو بے تاب ہو رہے تھے۔ ماسٹر شفیق کے گھٹنوں پر سر رکھ کر وہ بے اختیار رو دیا۔ اور ماسٹر شفیق احمد نے اسے دونوں بانہوں کے ہالے میں لے لیا۔ کتنی ہی دیر تک وہ شفیق احمد کے سینے سے لگا رہا۔ اور آنسو اندر ہی اندر اس کے وجود کو بھگوتے رہے۔

وہ شخص جو بہت نیک اور اللہ والا تھا۔

وہ عورت جسے کسی نے بے پردہ نہیں دیکھا تھا۔

اس کا خون کھول رہا تھا۔

اس کی کنپٹیاں جل رہی تھیں۔

اس نے آہستہ سے خود کو ماسٹر شفیق احمد سے الگ کیا اور بھاری قدموں سے چلتا ہوا واپس صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔ دھندلے منظر آنکھوں کے سامنے واضح ہو رہے تھے

ماں کی لاش پر خالہ اور نانی کے بین کانوں میں گونج رہے تھے۔

کئی لمحے یوں ہی گزر گئے پھر ماسٹر شفیق احمد اٹھے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”آؤ۔“

اور وہ میکانکی انداز میں چلتا ہوا ان کے پیچھے کمرے میں آیا تھا اور ان سے بند لفافہ لے کر اپنے کمرے میں آگیا تھا۔۔۔۔ کتنی ہی دیر تک وہ یونہی یہ لفافہ تھامے رہا۔

آخری سے مولوی اللہ یار نے اس کے لیے کچھ لکھا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ایک بار پھر وہ رونے لگا۔ رونے سے دل پر پڑا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو اس نے لفافہ چاک کیا۔۔۔ کسی ڈائری میں سے پھاڑے گئے دو ورق تھے۔

”فہد!

میرے بیٹے! میرے پاس وقت بہت کم ہے مگر میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ تمہاری والدہ، نانی اور خالہ اس دنیا میں نہیں رہیں شاید میں بھی چند گھنٹوں کا مہمان ہوں۔ مجھے اپنے اردگرد عجیب سی مہک اور خوشبو آتی محسوس ہو رہی ہے۔۔۔ ایسی مہک میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی اور میرے اندر عجب سی سرشاری ہے جیسے منزل پر پہنچنے کی سرشاری ہو۔

فہد! میرا نام منصور علی ہے اور میرے والد کا نام عنصر علی فاروقی ہے۔ جب میں نے گھر چھوڑا تو ان کا شمار بہترین وکیلوں میں ہوتا تھا۔۔۔ معلوم نہیں وہ حیات ہیں یا نہیں۔ ان کا ایڈریس لکھ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے عبدالقادر تمہیں سینے سے لگا کر رکھے گا لیکن اگر کبھی ضرورت محسوس کرو تو اس ایڈریس پر چلے جانا اور یہی خط دکھا دینا اور اگر میرے والدین حیات ہوں تو ان سے اپنے باپ کے لیے معافی ضرور لے لینا۔۔۔ میں نے اپنی جدائی دے کر ان کا جو دل دکھایا اس کے لیے وہ مجھے معاف کر دیں۔

خدا تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

تمہارا والد
منصور علی

اس مختصر سے خط کو کوئی بیس بار عبداللہ نے پڑھا تھا۔۔۔ اور پھر الماری میں احتیاط سے دیا تھا۔

”میں کیا کروں گا وہاں جا کر۔۔۔ ماں باپ نہیں رہے تو باقی رشتوں کو تلاش کر کے کیا کروں گا۔“

لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اس کے والد نے ایک آرزو کی تھی۔ ایک کام ذمے لگایا تھا اس کے۔ معافی مانگنے کا۔ وہ خط نکال کر اپنے والٹ میں رکھ لیا۔ ایڈریس یہاں کا ہی تھا۔ راولپنڈی کا۔ وہ دانیال کی طرف نہیں جا سکا تھا۔

بار بار اس کے تصور میں اپنی ماں اور خالہ کی بے بسی آتی۔ اپنے والد کا خیال آتا۔ اور پھر ان کی بے بسی کی موت۔

وہ مٹھیاں بھینچتا۔ غصے کے عالم میں بالوں کو کھینچتا اور دل ہی دل میں عہد کرتا کہ وہ چوہدری اعجاز کو عدالت میں ضرور کھینچ کر لائے گا۔

رابعہ ملک نے صحیح کہا تھا۔

اس کھیل میں مات محبت کی ہو گی۔ پھر یکایک جیسے کوندا سا لپکا تھا اور وہ کڑیوں سے کڑیاں ملانے لگا تھا۔

رابعہ ملک۔۔۔

منصور احمد۔۔۔

مولوی اللہ یار۔

اجنبی مسافر۔۔۔۔

اور اس کی وہ قبر۔۔۔۔

رابعہ ملک کے آنسو۔۔۔۔

اور وہ قبر یقیناً "مولوی اللہ یار کی ہے۔

میرے باپ کی قبر....

تب ہی اتنی کشش تھی وہاں۔

اس شہر کی ہواؤں میں بھی اپنائیت کی خوشبو تھی۔ وہیں کہیں کسی قبرستان میں خدیجہ بنتِ ہدایت اللہ زوجہ مولوی اللہ یار کا کتبہ بھی لگا ہو گا کسی قبر کے سرہانے۔

وہ یکدم اٹھا تھا اور اس نے رابعہ ملک کے نمبر ملائے تھے۔

"میں چوہدری اعجاز کے خلاف قتل کا دعویٰ دائر کرنے والا ہوں۔ ایک نہیں کئی قتلوں کا۔۔۔۔ اور آپ نے گواہی دینی ہے۔" دوسری طرف تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ اور پھر کچھ دیر بعد آواز آئی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔۔ لیکن وہ کون سا ایسا جذبہ ہے جو محبت سے بھی زیادہ قوی ہے۔۔۔۔ میں نے سوچا تھا شاید عبیر کی کہانی مجھ سے مختلف ہو گی لیکن اس حویلی کی لڑکیوں کو محبت راس نہیں آتی۔"

عبداللہ کا جی چاہا وہ بتا دے کہ وہ فہد منصور علی ہے۔ منصور علی خان یا مولوی اللہ یار کا بیٹا۔۔۔۔ اس ہستی کا بیٹا جس کی قبر پر آپ ہر صبح پھول چڑھاتی ہیں۔ اور آنسوؤں سے دھوتی ہیں اسے لیکن وہ خاموش ہی رہا اور اب عبیر کے سامنے بے اختیار کہہ بیٹھا تھا۔

"عبداللہ! خاموش کیوں ہو گئے ؟"

اس نے چونک کر عبیر کی طرف دیکھا جو اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی اور جس کے چہرے پر حزن ہی حزن تھا۔ پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے سب حقیقت عبیر سے کہہ دی۔ وہ ساکت بیٹھی تھی۔ عبداللہ خاموش ہوا تو اس نے نگاہیں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"عبداللہ! میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کہوں۔۔۔۔ برسوں پہلے ہونے والے اس اندوہناک حادثے پر تم سے تعزیت کروں تمہارے آنسو پونچھوں۔۔۔۔ یا اپنے آنسو۔ تمہیں دلاسہ دوں یا خود کو۔۔۔۔ تمہارا حوصلہ بڑھاؤں یا اپنا۔

ہمارا ایک ہونا تو شاید پہلے بھی ممکن نہ تھا لیکن اب تو اب تو ناممکن ہے۔۔۔۔ میں تم سے یہ نہیں کہتی کہ تم کچھ نہ کرو۔۔۔۔ اور میرے تایا جان کا وہ جرم جو ناقابل معافی ہے میری خاطر معاف کر دو۔ نہیں عبداللہ! میں ایسا کچھ نہیں کہوں گی۔ شاید میں عملی طور پر تمہاری مدد نہ کر

سکوں، بہت زیادہ لیکن میں تمہاری کامیابی کے لیے بہت دعا کروں گی۔ میں تو پہلے ہی بہت پریشان تھی عبداللہ! تم دو دن سے نہ چیمبر آ رہے تھے اور نہ کورٹ جا رہے تھے۔"

"کیا ہوا۔۔۔ کیوں پریشان تھیں تم ؟"

"اب کیا بتاؤں؟"

"نہیں کہو عبیر۔۔۔! میں نہیں سمجھتا کہ ہماری دوستی اور محبت میں کچھ فرق پڑا ہے۔"

"پرسوں تایا جان کا فون آیا تھا کہ ایاز اتوار کو آ رہا ہے اور وہ اسی ماہ میں اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ تب بابا جان نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں اگر ایاز سے شادی نہیں کرنا چاہتی تو پھر کس سے کرنا چاہ رہی ہوں۔ میں نے تمہارا نام لیا تو وہ خاموش ہو گئے اور بہت دیر تک مجھے اپنے اور تمہارے اسٹیٹس کا فرق سمجھاتے رہے۔ اس لیے میں چاہ رہی تھی کہ ایاز کے آنے سے پہلے تم اپنے چچا جان کو بھیجتے لیکن اب۔۔۔۔"

"اب کیا ہوا ہے عبیر! میں بھیج دیتا ہوں چچا جان کو۔"

عبیر ہنسی۔۔۔ ایسی ہنسی جس میں کانچ کی چبھن تھی۔

"جو ہونے والا ہے کیا اس کے بعد یہ ممکن — ہو سکتا ہے؟" عبیر نے پوچھا تو وہ خاموش ہو گیا۔

"پہلے بھی بابا جان کے کل رات کے رویے سے مجھے امید نہیں رہی تھی۔ پھر بھی میں نے سوچا تھا ایک کوشش کر لیتے ہیں۔۔۔۔ میں اپنی بیڑیوں اور زنجیروں کو فراموش کر بیٹھی تھی عبداللہ! بھول گئی تھی کہ سرابوں کے سائے میرے بدن سے لپٹے ہیں۔" آنسو اس کے رخساروں پر پھسل آئے۔

"عبیر!" عبداللہ نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

"مت روؤ پلیز۔۔۔ تمہارے آنسو مجھے کمزور کر رہے ہیں۔ یہ سیلاب بپا کیے دیتے ہیں میرے اندر عبیر! میرا کشور دل اس سیلاب میں ڈوب جائے گا۔ آنسو پونچھ لو پلیز۔"

عبیر کے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے، تب بے بس سا ہو کر عبداللہ نے اس کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔۔ کچھ نہیں کرتا میں۔۔۔۔ پھاڑ دیتا ہوں یہ ساری فائل۔ یہ سارے نوٹس جو میں نے تیار کیے ہیں۔۔۔۔ اب مت روؤ میں کہاں تمہارے بغیر۔۔۔۔ پلیز عبیر۔"

اس نے فائل اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ "میں ابھی ظفر کو بھی فون کر کے منع کر دیتا ہوں کہ وہ اخبار میں کچھ نہیں دے گا۔۔۔۔ اور ہاں شام کو امی اور چچا جان کو بھیجوں گا"

"نہیں پلیز۔۔۔ نہیں۔" عبیر نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"ابھی نہیں۔۔۔ اور پلیز یہ فائل رکھو۔۔۔ میں تمہاری ہر ایسی کوشش میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میں تمہیں اس کام سے نہیں روکنا چاہتی تم ضرور ایف۔ آئی۔ آر کٹواؤ۔"

"لیکن عبیر! میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔۔۔ میں۔۔۔ میں کیا کروں۔"

"تم جو کچھ کر رہے ہو وہ کرو عبداللہ! وہ تمہارا حق ہے اور۔۔۔ ابھی نہیں۔ میں بابا جان سے حتمی بات کر کے تمہیں بتاؤں گی کہ تم کب چچا جان کو بھیجو۔"

"یہ تم دونوں کیا مذاکرات کر رہے ہو۔"

دانیال نے اندر آتے ہوئے کہا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی فائلیں اور کتابیں ٹیبل پر رکھیں۔

"اور وہ دونوں کہاں غائب ہیں مامون اور صدف۔۔۔ پہلے دو دن یہ غائب رہے اور آج وہ چل چکی بھئی آپ لوگوں کی وکالت۔"

"صدف مامون اور اس کی امی کے ساتھ گئی ہے کرن کی بری کی شاپنگ کے لیے۔"

"اور یہ سانحہ کب ہو رہا ہے ہمارے دوست کی قربانی کا۔"

"ٹھیک بیس دن بعد۔" عبیر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا' روئی روئی آنکھیں دیکھ کر دانیال چونکا۔

"ہیں کیا یہاں بھی کوئی رخصتی کا منظر چل رہا تھا۔"

عبیر نے سر جھکا لیا اور عبداللہ نے موضوع بدلنے کے لیے پوچھا۔

"یار! تمہاری بات ہوئی پھر ایس پی سے ؟"

"ہاں ہوئی ہے۔ وہ خواتین بہت محفوظ جگہ پر ہیں۔ اور جلد ہی ایس پی صاحب کوئی کارروائی کریں گے لیکن میں نے ان سے کہا ہے کہ وہ ہمارا انتظار کریں۔ تم کہہ رہے تھے کہ تمہیں ایک اور رپورٹ بھی کرنا ہے۔ کوئی پرانا معاملہ۔۔۔"

"ہاں میں بعد میں بات کروں گا۔"

وہ ایک دم کھڑا ہوا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼
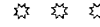
ماسٹر شفیق احمد بے چینی سے صحن میں ٹہل رہے تھے۔ رات کے بارہ بج گئے تھے اور ابھی تک عبداللہ نہیں آیا تھا۔ وہ اتنی دیر تو کبھی گھر سے باہر نہیں رہا تھا۔ پھر آج کہاں رہ گیا تھا۔ جب سے اس نے ملک صاحب کو جوائن کیا تھا تو اسے دیر ہو جاتی تھی لیکن زیادہ سے زیادہ نو یا ساڑھے نو تک آجاتا تھا۔ انہوں نے وہاں فون کیا تھا تو پتا چلا تھا کہ وہ تو آج سات بجے ہی اٹھ گیا تھا۔ وہاں صرف منشی تھا اور وہ بھی جا رہا تھا اس نے بتایا تھا کہ آج تو دانیال صاحب بھی جلدی

چلے گئے تھے مامون صاحب اور صدف بی بی تو آئی ہی نہیں تھیں اور ملک صاحب بھی نہیں تھے۔

"آخر یہ عبداللہ کہاں رہ گیا۔" زہرا بیگم جو جانماز پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں اٹھ کر باہر آگئیں۔

"پتا نہیں۔" شفیق احمد کی پریشانی ان کے لہجے اور چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

دو روز سے وہ اس کی حالت پر غور کر رہے تھے۔ دو دن سے وہ گھر سے نہیں نکلا تھا۔ آج وہ تیار ہوا جانے کے لیے تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ بظاہر نارمل لگ رہا تھا۔ لیکن اس کے اندر جو طوفان بپا تھے وہ اس سے بے خبر تھے۔ پتا نہیں اس خط میں کیا لکھا تھا' جوان خون ہے کہیں دل میں انتقام کا سودا نہ سما گیا ہو۔۔۔ کہیں سلطان نگر نہ چلا گیا ہو۔

"آپ نے مامون اور دانیال کو فون کیا ؟"

"نہیں تو۔۔۔ ان کے نمبر میرے پاس نہیں ہیں۔"

"انعم کو معلوم ہوں گے۔ میں پتا کرتی ہوں۔" زہرا بیگم واپس مڑیں تب ہی دروازے پر بیل ہوئی۔ ماسٹر شفیق احمد نے لپک کر دروازہ کھولا اور عبداللہ کو دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔

"بیٹا! کہاں رہ گئے تھے۔ ہم لوگ بہت پریشان تھے۔ بارہ بج رہے ہیں۔ میرا تو بس اب لگتا تھا دل ڈوب جائے گا۔"

"چچا جان!" عبداللہ نے ان کا ہاتھ تھام کر ہولے سے دبایا۔ "آئی ایم سوری۔ مجھے وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔"

وہ سچ مچ شرمندہ ہو گیا تھا۔ آفس سے نکلا تو ذہن بہت الجھا ہوا تھا یوں ہی پہلے ایک پارک میں جا بیٹھا بہت دیر تک بیٹھا رہا پھر بے کار سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ دل و ذہن کوئی بھی اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ ایک طرف والدین کی بے بسی کی موت تھی اور دوسری طرف عبیر سے دائمی جدائی کا احساس۔ اسے لگ رہا تھا جیسے سارے راستے اس کے لیے بند ہو گئے ہوں اور کہیں جائے پناہ نہ ہو۔

"چلیں!" اس نے بہت احترام سے ماسٹر شفیق احمد کا ہاتھ تھاما اور انہیں سہارا دیتا ہوا ان کے کمرے میں لایا زہرا بیگم بھی آگئی تھیں۔

"بیٹا! تم نے بہت دیر کر دی۔"

"دوستوں میں وقت کا پتا نہیں چلا۔۔۔ تم کھانا نکلواؤ۔" ماسٹر شفیق احمد نے کہا۔

انعم جاگ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا ہے۔"

عبداللہ کا دل چاہا منع کر دے لیکن پھر خاموش ہی رہا۔

"اگر دیر ہو جائے تو فون کر دیا کرو۔"

"سوری امی جان! خیال نہیں رہا۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔ اب آپ لوگ آرام کریں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اور چچا جان! آپ یہ ایک گولی لے لیجیے گا۔ ٹینشن سے آپ کی طبیعت خراب ہو سکتی ہے۔"

"انعم کھانا گرم کر رہی ہے کھا کر سونا۔ خالی پیٹ نہ سو جانا۔" زہرا بیگم نے کہا تو وہ "جی اچھا" کہتا ہوا باہر نکلا۔ کچھ دیر برآمدے میں رک کر کچھ سوچا اور کچن کی طرف آ گیا۔

"انعم!" کچن کے دروازے میں کھڑے کھڑے اس نے کہا "تم کھانا مت گرم کرو۔ مجھے بھوک نہیں ہے اور آرام کرو جا کر۔"

"اب تو سالن گرم بھی ہو گیا۔ دو تین نوالے لے لیں۔"

"اچھا پھر یہاں ہی دے دو۔" وہ کچن میں ہی چلا آیا اور انعم نے چھوٹی ٹیبل پر کھانا لگا دیا۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا ایک کرسی اور چھوٹی ٹیبل کچن میں ہی پڑی رہتی تھی۔ اکثر ثمن، کومل اور انعم یہاں کچن میں ہی ناشتہ کر لیا کرتی تھیں۔ دوپہر میں بھی کالج و یونیورسٹی سے الگ الگ ٹائم پر آتیں تو یہاں ہی کھانا کھا لیتیں۔ عبداللہ نے ذرا سا قیمہ پلیٹ میں ڈالا۔

"آپ چائے پئیں گے یا دودھ؟"

زہرا بیگم کی عادت تھی کہ رات سونے سے پہلے سارے بچوں کو دودھ کا ایک ایک کپ ضرور دیتی تھیں اور یہ روٹین اب تک چلی آ رہی تھی۔

"اگر تکلیف نہ ہو تو چائے۔" انعم نے بنا کچھ کہے چولہے پر چائے کا پانی رکھ دیا۔

عبداللہ کا جی بالکل نہیں چاہ رہا تھا لیکن انعم کے خیال سے دو تین نوالے زبردستی لیے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ چلیں کمرے میں۔ چائے وہاں ہی لے آتی ہوں۔" کمرے میں آ کر وہ یونہی جوتوں سمیت بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ انعم نے چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔

"آپ کچھ پریشان ہیں؟"

"کچھ خاص تو نہیں۔" عبداللہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"نہیں۔ آپ بہت اپ سیٹ ہیں۔۔۔ میں ہی کیا کومل بھی محسوس کر رہی ہے اور ثمن بھی کل کہہ رہی تھی۔"

"اچھا لیکن میں تو ذرا بھی پریشان نہیں ہوں۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور کپ اٹھا لیا۔ "بس ان دنوں کچھ زیادہ مصروف ہو گیا تھا۔"

"آپ دو دن سے گھر پر ہیں۔ کہیں گئے بھی نہیں نہ کورٹ نہ۔۔۔"

"یونہی موڈ نہیں تھا کہیں جانے کا۔ کچھ سر بوجھل سا تھا۔"

"عبداللہ!" انعم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کیا ابا جان نے آپ سے کچھ کہا ہے۔"

"چچا جان نے بھلا مجھے کیا کہنا ہے میں تو اس کا ہونہار سپوت ہوں۔" عبداللہ نے لہجہ خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔

"نہیں وہ۔۔۔" اس نے جھجکتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔ "وہ میرے اور آپ کے متعلق۔"

"تمہارے اور میرے متعلق کیا۔" عبداللہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

انعم کی نظریں جھک گئیں اور ہونٹ لرزنے لگے۔ "وہ مجھے آپ سے یہ کہنا تھا کہ آپ اگر اس وجہ سے پریشان ہیں تو پلیز' پریشان مت ہوئیے گا۔ میں جانتی ہوں۔ آپ عبیر کو پسند کرتے ہیں۔"

اس کی آواز بھاری ہو گئی۔

"میں امی جان سے خود کہہ دوں گی۔ منع کر دوں گی انہیں۔ عبیر بہت پیاری ہے۔ سب کو پسند ہے۔ کومل اور ثمن کو بھی۔" اس نے نگاہیں جھکائے جھکائے کہا۔

عبداللہ بہت حیرت سے اسے سن رہا تھا۔ "انعم! تم کیا کہہ رہی ہو۔ میں اب بھی نہیں سمجھا۔ مجھ سے تو چچا جان نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"وہ۔ کیا ابا جان نے آپ سے شادی کی بات نہیں کی۔"

"شادی کی بات؟" اس نے سوالیہ نظروں سے انعم کو دیکھا۔

"ہاں۔" انعم کی نظریں اور جھک گئیں۔

"وہ اس روز۔۔۔ جب آپ سلطان نگر سے آئے تھے تو کہہ رہے تھے کہ وہ آپ سے شادی کی بات کریں گے۔۔۔ میں نے سنا تھا' وہ امی جان سے بات کر رہے تھے۔ میری اور آپ کی شادی کی بات۔۔۔"

"اوہ!" عبداللہ نے سر پر ہاتھ مارا۔

اب ساری بات اس کی سمجھ میں آئی تھی۔ خالی کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ اٹھا اور ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔ سر [illegible]ئے ناخنوں پر لگی نیل پالش کو کھرچتی ہوئی وہ بہت معصوم لگ رہی تھی۔

"میں اس وجہ سے پریشان نہیں ہوں اور نہ ہی چچا جان نے مجھ سے اس طرح کی کوئی بات کی

ہے۔ تم اپنے اس چھوٹے سے سر کو فضول باتیں سوچ سوچ کر مت تھکاؤ۔" اس نے بے
شفقت سے اس کا سر سہلایا۔

"جاؤ اب جاکر آرام کرو۔ صبح یونیورسٹی بھی جانا ہے۔" وہ اٹھی تو اس کی لرزتی پلکوں پر اٹکے
موتیوں نے جیسے کچھ منکشف کیا اس پر اور عبداللہ ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ سر جھکائے چلی گئی
تھی اور عبداللہ کمرے کے بیچوں بیچ حیران سا کھڑا تھا۔

"نہیں۔۔۔ یہ کب اور کیسے ہوا۔ مجھے احساس کیوں نہیں ہوا۔

یہ آنکھوں کی نمی ....

ہونٹوں کی کپکپاہٹ .....

دل کا گداز یونہی تو نہیں ہوتا۔

اور کئی منظر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے۔

عبیر کے ذکر پر استری چھوڑ کر چلے جانا۔ یہ خاموشی۔۔۔ یہ اداسی۔

"یہ جذبہ تو دل و جان کو جلا دیتا ہے انعم! یہ تمہارے دل میں کہاں سے آگیا ہے۔ اس کی مہک
اور مُشک تو انسان کو احساس سے بیگانہ کر کے خود کو خود ہی عیاں کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ تم
نے کیا کیا انعم۔"

وہ جو کپڑے تبدیل کرنے کے لیے اٹھا تھا پھر بیٹھ گیا۔

"اور اگر چچا جان یا امی جان مجھ سے ایسا کہتیں تو کیا میں انکار کر پاتا۔ کیا میں ان احسانوں کا
بدلہ چکا سکتا ہوں جو چچا جان نے مجھ پر کیے۔ شکر ہے۔ چچا جان نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں
کی۔ مگر ممکن ہے انہوں نے سوچا ہو' امی جان کی رائے لی ہو اور انعم نے سنا ہو۔۔۔ لیکن انعم
میں۔۔۔ میرا تو ہر انگ زخمی ہے۔ میری کوئی سوچ میرے تابع نہیں ہے۔ میری سلطنت میں تو
اب شاید تمام عمر کے رت جگے لکھ دیے گئے ہیں۔ اور انعم تو ایک معصوم سی' کومل سی نازک
سی لڑکی ہے۔"

"نہیں میرے اللہ اسے میرے غم سے نکال دے۔ وہ اس غم کو سہہ نہیں سکتی۔ یہ قربانی
دل بہا دینے والی ہے انعم! جو تم دینا چاہتی ہو۔۔۔ لیکن شاید مجھے اس کی ضرورت نہ ہو۔۔۔
میرے راستے تو پہلے ہی کھو چکے ہیں۔ میں کیسے عبیر تک پہنچ پاؤں گا۔ میرا وجدان مجھ سے کہہ
رہا ہے کہ شاید ہم کبھی مل نہیں پائیں گے۔ کبھی نہیں۔"

دکھ۔۔۔ شدید دکھ اس کے دل کو چیرنے لگا اور بے دم سا ہو کر اس نے تکیے پر سر رکھ کر
آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

"عبیر! کہاں جا رہی ہو۔" چوہدری امتیاز نے اچانک ہی اپنے کمرے سے نکل کر پوچھا۔
عبیر جو چیمبر جانے کے لیے تیار ہو کر نکلی تھی۔ اس نے مڑ کر انہیں دیکھا اور بتایا کہ وہ چیمبر
جا رہی ہے۔

"نہیں۔ تم آج سے کہیں نہیں جاؤ گی۔ تمہارا شوق پورا ہوا۔ اب گھر بیٹھو کل بھائی جان
شادی کی تاریخ لینے آ رہے ہیں۔"

"مگر بابا جان!" عبیر نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔ "میں نے آپ سے کہا تھا۔"

"وہ ایک بیوقوفانہ بات تھی۔"

"لیکن بابا جان! آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ سوچیں گے۔"

"ہاں۔ کہا تھا۔ کوئی ہم پلہ خاندانی لڑکا ہوتا تو شاید میں سوچتا بھی حالانکہ تب بھی شاید بھائی
صاحب ہرگز نہ مانتے۔ انہوں نے بچپن سے ایاز کے لیے کہہ رکھا ہے۔"

"بابا جان۔" آنسوؤں نے اس کا حلق سی دیا۔ "میں۔۔۔ میں ایاز کے ساتھ خوش نہیں رہ
سکتی۔"

"کیوں ایاز میں کیا کمی ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ خوبصورت ہے۔ خاندانی ہے۔ امریکہ میں رہ کر
بھی اس نے سگریٹ تک پینے کی عادت نہیں ڈالی۔ اور اب جاؤ کمرے میں۔ مزید کوئی بات
نہیں سنوں گا تمہاری۔۔۔ میری ڈھیل کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم ساری حدیں پھلانگ
جاؤ۔"

"بھائی امتیاز۔" رابعہ ملک نے جو ٹی وی لاؤنج کے ایک صوفے پر خاموش بیٹھی ان کی گفتگو
سن رہی تھیں سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔۔۔ وہ رات ہی اسلام آباد آئی تھیں۔

"اگر عبیر۔ خوش نہیں ہے ایاز کے ساتھ شادی کرنے پر تو آپ اس کی بات مان لیں۔ میرا
بیٹا بھی تو ہے۔ عبیر کا ہم عمر ہی ہے۔" انہوں نے انجان بن کر کہا۔

"بات تمہارے بیٹے یا ایاز کی نہیں رابی! یہ۔۔۔ اس معمولی ماسٹر کے بیٹے سے شادی کرنا
چاہتی ہے۔ وہ کیا نام عبداللہ ہے۔۔۔ وہاں گاؤں بھی گیا تھا۔"

"تو۔۔۔ اچھا لڑکا ہے عبداللہ۔۔۔ میں ملی تھی۔ بہت سلجھا ہوا اور۔۔۔"

"رابی!" انہوں نے ٹوک دیا۔

"کیا تم نہیں جانتیں اپنی روایات اور اصولوں کو۔ وہ لڑکا۔۔۔ ہماری ٹکر کا ہے؟ اس قابل
ہے وہ کہ ہمارے ساتھ اٹھ بیٹھ سکے۔"

"لیکن عبیر اسے پسند کرتی ہے۔ بات تو اس کی خوشی کی ہے۔۔۔ زندگی تو اس نے گزارنی
ہے۔"

"رابی! غلط سبق مت دو اسے۔" انہوں نے ڈانٹ دیا۔ "تم جانتی ہو' یہ ممکن نہیں ہے اور

یہ۔۔۔" انہوں نے عبیر کی طرف اشارا کیا۔

"اس نے میری محبت اور نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ ایاز ایک آئیڈیل لڑکا ہے۔ اس میں کوئی خامی ہوتی برائی ہوتی تب میں بھائی صاحب سے کہتا لیکن اب۔۔۔ اسے اگر ایاز پسند نہیں ہے' تو احسن ہے اسد ہے۔۔۔ چھوٹے بھائی کا خاور ہے۔۔۔ لیکن یہ جس خیال میں ہے' اس پر لکیر پھیر دے۔ ایک اسکول ماسٹر کا بیٹا جو ابھی تک ایک بائیک تک نہیں خرید سکا۔۔۔ وہ داماد بنے گا چوہدری امتیاز خان کا۔۔۔"

وہ غصے سے تیز تیز چلتے پھر واپس بیڈ روم میں چلے گئے اور عبیر بھاگ کر رابعہ ملک سے لپٹ گئی۔

"پھپھو! پھپھو!"

"میری جان!"

رابعہ ملک نے اسے گلے لگا لیا اور ہولے ہولے تھپکتی رہیں۔ کافی دیر بعد وہ سنبھلی تو اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور گلوگیر آواز میں بولی۔

"پھپھو! بابا جان ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ وہ تو ایسے نہیں تھے۔ انہوں نے ہمیشہ میری ہر خواہش پوری کی ہے۔"

"ہر خواہش پوری کر کے پھر یہ ایک خواہش' یہ ایک آرزو پوری نہیں کرتے یہ لوگ عبیر۔۔۔ کیا تم نہیں جانتی تھیں؟ کیا تمہیں نہیں پتا تھا اپنے اور اس کے اسٹیٹس کا؟ پھر تم نے اسے کیوں اسیر کیا۔۔۔ کیوں کی محبت اس سے۔"

"محبت تو ایک بے اختیاری عمل ہے پھپھو! یہ کوئی پلان بنا کر تو نہیں کیا جاتا۔ اس میں کوئی منصوبہ بندی نہیں ہوتی پھپھو۔" وہ پھر رونے لگی۔

"میری جان! میں جانتی ہوں۔ پر تجھے سوچنا تو تھا۔ اس کو خود کو۔"

"پھپھو! محبت تو خوش گماں ہوتی ہے نا۔ میں بھی یہ گماں رکھتی تھی کہ بابا جان میری بات کبھی نہیں ٹالیں گے۔"

"مجھے تو تمہارے سے زیادہ اس کا خیال آ رہا ہے عبیر۔" رابعہ ملک نے افسردگی سے کہا۔

"تم کیا کرو گی۔ بہت ہوا تو رو لو گی۔ دن رات اور پھر ایک روز ایاز کی دلہن بن جاؤ گی اور باقی کی عمر منافقانہ زندگی گزارو گی۔۔۔ اور وہ۔۔۔ وہ اگر راستے کھو بیٹھا۔۔۔ بند گلی کا مسافر بن گیا تو۔۔۔؟ زندگی ہار بیٹھا تو۔۔۔؟ کتنی محبت کرتی ہو تم اس سے اور کتنی محبت کرتا ہے وہ تم سے۔"

"پھپھو!" اس نے شاکی سی نظروں سے رابعہ ملک کو دیکھا۔ "کیا محبت ناپنے کا کوئی پیمانہ ہوتا ہے۔ اگر ہے تو بتائیں مجھے۔۔۔ مجھے نہیں پتا' وہ مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے لیکن اتنی ضرور

کرتا ہے پھپھو کہ وہ اس محبت کے لیے اپنے باپ کے قاتلوں کو معاف کر دینا چاہتا ہے۔ وہ قاتل۔۔۔ جن کے ظلم کی حد نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" رابعہ ملک نے پوچھا۔

"پھپھو! وہ اس مولوی اللہ یار کا بیٹا ہے۔ جس کے خاندان کی عورتوں پر تایا نے ظلم توڑا اور خود مولوی اللہ یار کو مروا دیا۔"

"لیکن وہ تو بتا رہا تھا کہ اس کے والد کا نام رفیق احمد ہے اور۔۔۔"

"تب وہ اس حقیقت سے بے خبر تھا خود بھی۔"

"تو وہ تمہارا بیٹا تھا منصور! تب ہی تو۔۔۔ تب ہی تو اپنا اپنا لگا تھا مجھے۔۔۔ تب ہی اس کے چہرے کے نقوش مانوس سے لگے تھے کیونکہ ان میں تمہارا عکس تھا۔" رابعہ ملک نے سوچا۔

"لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا۔۔۔ اس ایک لمحے کا تو میں نے برسوں انتظار کیا ہے۔۔۔ اور اس کی خاطر تو میں یہاں تک آئی ہوں۔

عبیر! اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ اس محبت کو پانے کی خاطر جسے وہ کبھی بھی نہیں پا سکتا' اسے پیچھے نہیں ہٹنا چاہئے۔"

"پھپھو آپ۔۔۔" عبیر نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"جان! کوئی تو ہو' ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والا۔ ظلم تو ظلم ہی ہے نا عبیر! چاہے وہ ظلم کرنے والے ہمارے اپنے ہاتھ ہی کیوں نہ ہوں۔ ہم میں اتنا حوصلہ تو ہونا چاہیے نا کہ ہم اپنے ہاتھ کاٹ سکیں۔ ہماری تاریخ تو حوصلے کی ایسی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہم تو پڑھے لکھے باشعور ہیں اگر ہم ہی ظلم اور برائی کو قبول کر لیں گے تو پھر دوسروں سے کیا گلہ۔۔۔ تعلیم نے ہمیں شعور دیا ہے عبیر۔"

"میں نے تو اس سے کہا تھا پھپھو کہ وہ ایسا نہ کرے لیکن اس نے۔۔۔ اور یہ کل ہی کی تو بات ہے پھر میری ملاقات نہیں ہوئی اس سے۔"

"عبیر! مجھے تم اس کے پاس لے چلو گی۔"

"کیوں پھپھو؟"

"اب تمہیں کیا خبر عبیر! کہ میں نے یہ سفر اسی سے ملنے کے لیے تو کیا ہے۔۔۔ تم اور بھائی خوش ہو رہے ہو کہ میں پہلی بار اسلام آباد آئی ہوں ان کے گھر۔ میرا کبھی جی نہیں چاہا یہاں آنے کو۔ مجھے تو یہاں دلہن بن کر آنا تھا۔ یہی خواب دیکھا تھا نا میں نے۔ لیکن اب جو میں آئی ہوں تو۔۔۔" انہوں نے سوچا۔

"چلو اٹھو۔"

"ابھی!" عبیر نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ابھی۔"

"لیکن بابا جان!"

"تم فون کر کے پتا کرو کہ وہ کہاں ہے۔ میں بھائی امتیاز سے بات کرتی ہوں۔" رابعہ ملک اٹھ کر سامنے والے بیڈ روم میں چلی گئیں۔

"میں ذرا عبیر کے ساتھ شاپنگ کے لیے جا رہی ہوں۔ راولپنڈی بازار تک جانا ہے۔ گڑیا کے لیے کچھ لینا تھا۔"

"ٹھیک ہے جاؤ لیکن ٹائم پر واپس آجانا اور سمجھایا ہے تم نے اس بے وقوف لڑکی کو۔ اب بھلا میں بھائی صاحب کو نہ کر سکتا ہوں۔"

"آپ کو اسے آس نہیں دلانا چاہیے تھی نا۔ اس نے محل کھڑے کر لیے۔۔۔ محل گرے گا تو ملبے سے دھول تو اٹھے گی نا۔۔۔ کچھ دن تک سنبھل جائے گی۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"مجھے کیا خبر تھی کہ ایا نہ۔۔۔ میرا خیال تھا کہ دوسرے امریکہ پلٹ نوجوانوں کی طرح وہ بھی ہو گا۔۔۔ کسی میم کو بغل میں دابے چلا آئے گا اور اسی رنگ میں رنگا ہو گا لیکن وہ تو بالکل ویسا ہی ہے جیسا یہاں سے گیا تھا۔ الٹا اس میں سچائی او ایمانداری جیسی صفات پیدا ہو گئی ہیں اور تب بھی میرے ذہن میں یہ تو نہیں تھا کہ وہ عبداللہ جیسے غریب ماسٹر کے بیٹے۔۔۔ نان سنس۔ ٹھیک ہے۔ تم جاؤ اور اسے اچھی طرح سمجھا دینا سب۔۔۔"

رابعہ ملک بنا کوئی جواب دیے باہر نکل آئیں اور کچھ ہی دیر بعد وہ اس کے گھر میں اس کے سامنے تھیں۔ رابعہ ملک اور عبیر کو دیکھ کر عبداللہ ازحد حیران ہوا تھا۔

"میں صرف تم سے ملنے اور بات کرنے کے لیے سلطان نگر سے آئی ہوں۔"

"میں آج آپ کو فون کرنے ہی والا تھا کہ میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔"

"تم اتنے کمزور ارادے کے تو نہیں لگتے تھے۔"

"زندگی میں کئی ایسے مقام بھی آتے ہیں جب آدمی کے ارادے کمزور پڑ جاتے ہیں بھلے وہ کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو۔"

افسردگی اس کے لہجے سے ٹپکتی تھی۔ ارادوں کی شکست برداشت کرنے کے لئے بھی تو حوصلے کی ضرورت تھی اور وہ اس حوصلے سے گزرنے کے عمل میں تھا۔

"یہ اچھا ہوا کہ آپ بھی یہاں ہیں، مجھے آپ کے ووٹ کی ضرورت پڑے گی۔" اس نے لہجہ خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔ "میں ایک دو روز میں چچا جان اور امی جان کو ملک ہاؤس بھیجنے والا ہوں۔"

"نہیں عبداللہ! مت بھیجنا کسی کو۔۔۔ بابا جان نہیں مانیں گے کبھی بھی نہیں۔۔۔ اور میں یہ کبھی نہیں چاہوں گی کہ تمہارے والدین کی بے عزتی ہو۔"

"مگر۔۔۔"

"میں نے ہر کوشش کر لی ہے عبداللہ۔" عبیر نے آنسو روکنے کی کوشش کی جو امڈے چلے آرہے تھے۔

"بھائی امتیاز نے اعجاز بھائی کو تاریخ دے دی ہے۔" رابعہ ملک نے کہہ کر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔۔۔ وہ ساکت بیٹھا ضبط کی انتہائی منزلوں سے گزر رہا تھا۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جس سے وہ ڈرتا تھا اور جس کی وجہ سے اپنے جذبوں کو خود سے بھی چھپائے پھرتا تھا لیکن پھر عبیر نے صرف اپنے جذبوں کو عیاں نہیں کیا تھا۔ اس کا بھرم بھی توڑ دیا تھا۔

اس نے زخمی نظروں سے عبیر کو دیکھا۔

"تم نے میری درشتی اور نفی کو کیوں اپنے دل میں جذب کر لیا تھا عبیر۔۔۔ میں نے تمہاری زلفوں کی مہک لینے کی تمنا کر ڈالی۔ تمہاری کومل تا اور انتہائے خلوص کو پا لینا چاہا۔ اور بھول گیا کہ میں اور تم دو متضاد کنارے ہیں جو کبھی نہیں مل سکتے۔

عبیر! میں نے تمہاری آنکھوں کی انوکھی دنیا میں اترنا چاہا، تمہارے لب و رخسار کی آگ میں خود کو جلا دینے کی سعی کر بیٹھا۔

میں نے تمہاری اداؤں اور نغمگی کو اسیر کرنا چاہا۔ میں نے تمہاری آغوش میں دھڑکنوں کی تال سننا چاہی۔ میں نے اپنے کھردرے احساسات کو ریشم ایسی نرمی سے ملفوف کرنا چاہا اور بھول گیا کہ یہ سب میرے لیے نہیں ہے۔"

"عبداللہ! زندگی میں سب خواہشیں پوری نہیں ہوتیں اور سارے خواب تعبیر نہیں پاتے۔" رابعہ ملک نے اٹھ کر کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونکا۔ اسے لگا جیسے وہ بھربھری مٹی کا ڈھیر ہے اور بکھر جائے گا۔

"زندگی میں کوئی خواہش پوری نہ ہوتی پھپھو! صرف ایک خواہش پوری ہو جاتی ایک خواب تعبیر پا جاتا۔" عبیر نے تڑپ کر کہا۔ اور آنسو سارے بند توڑ کر رخساروں پر بہہ آئے۔

عبداللہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اور رابعہ ملک نے بھی تو برسوں پہلے چاہا تھا کہ کوئی خواہش پوری نہ ہو بس یہ ایک خواب تعبیر پا جائے۔۔۔ "لیکن وہی ایک خواب تو تعبیر نہیں پاتا جسے زندگی سمجھتے ہیں۔" انہوں نے باری باری دونوں کو دیکھا۔

"منصور بھی تو یونہی چپ ہو گیا تھا۔ جیسے زندگی اچانک اس کے اندر بھڑک کر بجھ گئی ہو۔"

عبداللہ ابھی جس دکھ سے گزر رہا تھا۔ اس میں کچھ کہنا بیکار تھا۔

"میں کل آؤں گی عبداللہ! اور عبیر! میں باہر گاڑی میں بیٹھی ہوں۔ تم ریلیکس ہو کر آجاؤ۔" اور رابعہ ملک کے باہر جاتے ہی عبیر کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

"ایسا مت کرو عبیر! تمہارے آنسو مجھے ڈبو دیں گے۔ میں نے کہا تھا نا تم سے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے سامنے دو زانو بیٹھ گیا۔ اور اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے۔

"شاید آج کے بعد یہ آنکھیں تمہیں نہ دیکھ پائیں۔ عبیر! کچھ ایسا کرو عبیر! کہ میری تنہائیوں میں تمہارا تصور حقیقت میں ڈھل کر منجمد ہو جائے۔

اپنی چاہتوں کی چھایا سراب بنا کر میرے ساتھ کر دو۔

تم اپنی ملیح اور دلکش ہنسی اور باتیں بازگشت میں ڈال کر مجھے مستعار دے دو۔

اپنے نیناں کی جوت میری تیرہ شبی کو چمکانے کے لیے عنایت کر دو۔

اپنی انگلیوں کی پوروں کی مسیحائی میرے خوابوں کا مقدر کر دو۔ میری جلتی آنکھوں میں اپنے لب و رخسار کی صبحوں کی ٹھنڈک بھر دو۔

اپنی محبت کی چاندنی کی صرف ایک کرن میرے ہمراہ کر دو۔ نہیں تو میرا سفر بہت روح کش ہو جائے گا۔ کچھ ایسا کرو کہ یہ آسان ہو جائے۔

میرے کانوں میں بہت سی بازگشتیں چیخیں بن کر گونجتی ہیں۔ ان میں کچھ نغمگی کا احساس شامل کر دو۔

"عبیر!" اس نے بہت بکھر کر کہا۔

"آج سب کچھ کہہ دو۔ کوئی ان کہی مت رہنے دو عبیر.....! وہ سب جو تم نے کبھی نہیں کہا۔ آج کے بعد ہونٹ کچھ نہیں کہیں گے اور کان کچھ نہیں سنیں گے۔ عبیر۔"

اور عبیر کو لگا جیسے اگر وہ کچھ دیر اور یونہی اس کے سامنے بیٹھا تڑپ تڑپ کر اسے پکارتا رہا تو وہ اس تڑپ سے بکھر کر کھیل کھیل ہو جائے گی..... اگر وہ کچھ دیر اور رک گئی تو جانے..... جانے کیا ہو جائے گا۔

وہ یکدم اٹھی اور تقریباً" بھاگتی ہوئی سی باہر گلی میں نکل گئی اور وہ ڈرائنگ روم کے کھلے دروازے کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔

☆ ☆ ☆

ملک صاحب سے تفصیلی بات کر کے جب وہ باہر آیا تو صدف نے اسے اطلاع دی۔

"عبیر گاؤں چلی گئی ہے۔ میں نے کل فون کیا تھا کرن کی شادی پر انوائٹ کرنے کے لیے تو

ملازم نے بتایا۔"

عبداللہ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔

"یار! وہ رابعہ ملک کا فون نمبر تو دے دو مجھے۔ صبح جھنگ جا رہا ہوں۔ شاید ضرورت پڑ جائے۔ آج ایس۔ پی کا فون آیا تھا۔ اوپر سے بہت دباؤ پڑ رہا ہے۔"

عبداللہ نے والٹ کھول کر رابعہ ملک کا کارڈ نکال کر اسے دیا تو اس کی نظر اس لفافے پر پڑی جو چند دن پہلے اس نے والٹ میں رکھا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس نے لفافہ کھولا اور اس کی نظریں ایک بار پھر تحریر پر دوڑنے لگیں۔

"دانیال!" وہ اٹھ کر اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ "یہ ایک ایڈریس ہے۔ مجھے اس کے متعلق معلوم کرنا ہے۔ تم بھی تو اسی علاقے میں رہتے ہو کہیں آس پاس ہی۔"

"ہاں دکھاؤ۔" دانیال نے ہاتھ بڑھایا۔

اور پھر چونک کر اسے دیکھا۔

"یہ..... یہ ایڈریس۔"

"ہاں دانی! یہی ایڈریس..... مجھے ان صاحب سے ملنا ہے..... پتا نہیں وہ حیات ہیں یا نہیں۔ لیکن دانی! یہ شخص عنصر علی فاروقی میرے دادا ہیں۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ مجھے اپنے عزیزوں کی تلاش سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میرے لیے سب کچھ چچا جان اور امی جان ہیں۔ میں نے ساری محبتیں ان ہی سے وصول کی ہیں۔ ماں باپ کی محبت' عزیز رشتہ داروں کی محبت۔ مجھے کبھی کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ بہنیں تھیں جان چھڑکنے والی۔ ماں ہے فدا ہونے اور ہر دم دعائیں کرنے والی باپ ہے جو باپ ہی نہیں دوست اور رفیق بھی ہے جس کی آنکھیں ہر دم شفقت و محبت لٹاتی ہیں۔

مجھے اس گھر سے کہیں بھی نہیں جانا لیکن مجھ پر ایک قرض ہے۔ بوجھ ہے اپنے باپ کی وصیت کا۔ مجھے اس شخص سے مل کر اپنے باپ کے لیے معافی مانگنی ہے۔ دانیال! یہ خط میرے باپ نے آخری لمحوں میں مجھے لکھا تھا۔ پتا نہیں ان کچلی ہوئی زخمی انگلیوں سے انہوں نے کیسے قلم ہاتھ میں لیا ہو گا۔

پتا نہیں یہ سب کچھ لکھنے کے پیچھے کون سی شدید آرزو چھپی تھی..... جس نے ان کی زخمی انگلیوں میں قلم تھما دیا تھا۔ شاید اپنے والدین سے معافی مانگنے کی۔ شاید۔"

بہت سارے آنسوؤں نے اس کا گلا بند کر دیا تو وہ ایک لمحے کو خاموش ہو گیا۔ دانیال آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ کسی اندرونی جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔

"مجھے رابعہ ملک نے بتایا تھا دانیال کہ ان کی انگلیاں زخمی تھیں بالکل کچلی ہوئی اور انہوں

نے بمشکل قلم ہاتھ میں تھاما تھا۔"

دانیال نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور پھر ہاتھ میں پکڑے ہوئے اوراق پر۔۔۔۔

"ایڈووکیٹ عنصر علی فاروقی۔" اس نے دہرایا اور آخر میں نظر ڈالی۔

"تمہارا والد

منصور علی"

پھر وہ کرسی گھسیٹتا ہوا اٹھا اور خط مٹھی میں دبائے ملک صاحب کے آفس کے دروازے کو دھکیلتا ہوا اندر چلا گیا۔۔۔۔ عبداللہ نے حیرت سے اسے یوں جاتے دیکھا اور سوچا۔

"یہ۔۔۔ یہ یکایک دانیال کو کیا ہوا۔"

وہ حیران سا وہیں اس کی کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹیبل پر پڑا رابعہ ملک کے فون نمبر والا کارڈ اٹھا کر دراز میں ڈال دیا۔

ملک صاحب نے کہا تھا کہ تمہارے گواہوں کے بارے میں کسی کو بھنک بھی نہیں ملنا چاہیے ورنہ۔۔۔۔ وہ بھی اپنی زندگی سے ہاتھ کھو بیٹھیں گے اور تم بھی قاتلوں کو سزا نہ دلوا پاؤ گے۔ اس لیے اس نے لاہور سے عبدالقادر کو بلوا کر ماموں کے ہاں بھجوا دیا تھا۔ رابعہ ملک کے کہنے پر عبدالقادر گواہی کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

نہ صرف چوہدری اعجاز کے وارنٹ جاری ہو گئے تھے بلکہ ابھی تک ان کی ضمانت بھی نہ ہوئی تھی۔ "ظالم بھی ایک روز منہ کے بل گرتا ہے۔"

یہ اس کا یقین تھا اور اب وقت آ گیا تھا کہ ظلم کا حساب لیا جائے۔۔۔۔ وہ اس سارے عرصے میں بہت مصروف رہا تھا۔ کئی چکر جھنگ کے لگائے تھے اس نے کئی بار دانیال کے ایس۔پی دوست سے ملا تھا۔۔۔۔ غلام دین کی بیوی اور ماں وغیرہ محفوظ تھیں۔۔۔۔ اور عدالت میں پیش ہونے کو تیار۔۔۔۔

چوہدری اعجاز نے لاہور کا سب سے بڑا وکیل کیا تھا۔۔۔۔ لیکن اس نے بھی بہت مضبوط کیس تیار کیا تھا۔۔۔۔ بچنے کے لیے کوئی راستہ نہ چھوڑا تھا۔

رابعہ ملک اور عبدالقادر کی گواہی ایسی تھی جس پر اس کیس کے فیصلے کا انحصار تھا۔ اور یہی سب سے مضبوط پوائنٹ تھا اس کے پاس۔

ملک صاحب کے آفس کا دروازہ کھلا تو وہ چونکا۔ دانیال اور ملک صاحب اس کی طرف آ رہے تھے۔ ملک صاحب کے چہرے پر بھی سرخی تھی۔ وہ حسب معمول احتراماً کھڑا ہو گیا۔ ملک صاحب لمحہ بھر اسے دیکھتے رہے پھر یکدم ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھے اور اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

"ارے تم۔۔۔ تم۔۔۔" شدتِ جذبات سے ان کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"تم مانی کے بیٹے ہو۔ منصور کے۔ میرے بھائی کے۔ تب ہی تو اپنے اپنے لگتے تھے۔ اس کی شباہت دکھتی تھی تم میں۔۔۔۔ لیکن مجھے تو ہر دوسرے بندے میں اس کی شباہت نظر آتی تھی۔ اس کا گمان ہوتا تھا۔" انہوں نے پوری شدت سے اسے بھینچ رکھا تھا۔

"ڈیڈی پلیز ریلیکس۔" دانیال نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔

"دانی!" انہوں نے عبداللہ کو الگ کرتے ہوئے اس کی پیشانی چومی اور پھر دانیال کی طرف دیکھا۔ "دانی! آج تم نے میری آس توڑ دی میری امید ختم کر دی۔ میری ہر صبح کا آغاز اس امید سے ہوتا تھا کہ شاید آج مانی پلٹ آئے لوٹ آئے۔ کبھی تو اسے ہم یاد آئیں گے۔ اپنا بھائی یاد آئے گا جس کو وہ اپنا دوست سمجھتا تھا لیکن دانی تم نے۔۔۔۔" انہوں نے دانیال کو گلے لگایا اور رونے لگے۔

"ریلیکس ڈیڈی۔۔۔۔ پلیز دیکھیں نا۔۔۔۔ یہ عبداللہ ہے نا ان کا عکس۔ آپ کا خون۔۔۔۔ آپ کے مانی کا بیٹا۔"

وہ ہولے ہولے سنبھل گئے اور ایک بار پھر عبداللہ کو گلے لگا کر اس کی پیشانی چومی۔ عبداللہ ابھی تک حیرت زدہ تھا۔

"بیٹھو۔۔۔۔ بیٹھو۔" دوسری کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے انہوں نے عبداللہ کی طرف دیکھا۔

"مگر۔۔۔ میرا۔"

"عنصر علی فاروقی میرے والد ہیں۔ ہم تین بہن بھائی تھے۔ سب سے بڑی آپا۔ پھر میں اور مجھ سے چھوٹا منصور۔ وہ مجھ سے چار سال چھوٹا تھا اور مجھے اس سے بہت محبت تھی۔ بہت عبداللہ۔۔۔۔ وہ اپنی ایک کلاس فیلو سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ پاپا اور ماما کتنی ہی بار جھولی پھیلا کر اس کے گھر گئے لیکن ادھر سے ہر بار صاف انکار ہو گیا۔ مانی بہت اپ سیٹ تھا۔ کتنے ہی روز وہ گھر پر پڑا رہا۔ خاموش۔ نہ کسی سے بات کرتا تھا نہ بولتا تھا۔ خاموش چپ چاپ اپنے کمرے میں پڑا رہتا ہمارا خیال تھا۔۔۔۔ صدمہ گہرا ہے۔ سنبھلنے میں وقت لگے گا۔۔۔۔ وہ تھا بھی تو بہت حساس بہت چھوٹے دل کا۔ کسی کی ذرا سی بھی تکلیف برداشت نہ کر پاتا تھا۔۔۔۔ ایک بار بچپن میں ایک بلی کو زخمی دیکھ کر گھنٹوں بے چین رہا تھا۔ بار بار مجھ سے کہتا تھا۔

"بھیا! اسے بہت تکلیف ہو رہی ہو گی۔ اسے کوئی ٹیبلٹ دے دیں۔" پھر اتنا بڑا دکھ اتنا بڑا صدمہ کیسے برداشت کرتا۔۔۔۔ نہیں برداشت کر سکا تو خفا ہو گیا۔ خود سے۔ اپنے آپ سے ناراض ہو گیا۔

پاپا نے بڑے بڑے ڈاکٹروں کا بورڈ بٹھایا۔ کہاں کہاں لے کر اسے نہیں گئے۔ لاہور' کراچی مگر وہ تو روز بروز خود سے بیگانہ ہوتا جارہا تھا۔۔۔ پھر اسی حالت میں ایک روز گھر سے چلا گیا۔۔۔ بہت تلاشا۔۔۔ بہت ڈھونڈا ریڈیو' ٹی۔وی' اخبار۔ ہر جگہ اشتہار بھیجے لیکن وہ پتا نہیں دنیا کی اس بھیڑ میں کہاں کھو گیا تھا۔ ماما اس کی یاد میں چل بسیں۔۔۔ پاپا ہیں ہر لمحہ اسے یاد کرتے ہیں۔ ایک آس ہے کہ موت سے پہلے ایک بار مانی کو دیکھ لوں۔ اس لیے تو اتنے شدید ہارٹ اٹیک کے بعد بھی اٹھ بیٹھے ہیں۔۔۔ اور آج۔۔۔ آج میں جب جا کر بتاؤں گا انہیں۔

پاپا آپ کا مانی اب کبھی نہیں آئے گا۔ اس نے تو برسوں پہلے یہ دنیا چھوڑ دی تھی۔ تو ان کے دل پر کیا گزرے گی عبداللہ۔ کیا؟"

انہوں نے ٹیبل پر سر رکھ دیا اور ایک بار پھر رونے لگے۔ عبداللہ اور دانیال خاموش بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھیں نم تھیں اور ضبط کی کوشش میں عبداللہ کی آنکھیں خوں رنگ ہو رہی تھیں۔

"عبداللہ! اٹھو!" یکایک انہوں نے ٹیبل سے سر اٹھایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور خود بھی کھڑے ہو گئے۔

"چلو۔۔۔ میرے ساتھ۔ شاید تمہیں سینے سے لگا کر ان کی برسوں کی پیاس بجھ جائے۔ تمہارے وجود سے مانی کی خوشبو آتی ہے عبداللہ۔ اٹھو۔" دانیال بھی کھڑا ہو گیا۔

ٹیبل پر سے گاڑی کی چابی اٹھا کر لاؤ۔"

دانیال اندر کی طرف لپکا تب ہی فون کی بیل ہوئی تو انہوں نے کسی قدر ناگواری سے فون کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر بیل ہوتی رہی پھر ہاتھ بڑھا کر انہوں نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو ایڈووکیٹ غضنفر علی خان۔" دوسری طرف چوہدری اعجاز تھا ملک غضنفر کے ماتھے پر ناگواری سے شکنیں پڑ گئیں۔

"جو کچھ عبداللہ سے کہنا ہے' مجھے ہی بتا دیں۔"

"اپنے اس دو ٹکے کے وکیل کو بتا دو ملک غضنفر کہ اس نے ہمارے ساتھ پنجہ لڑا کر اچھا نہیں کیا۔ میں ضمانت پر گھر آگیا ہوں اور اب میری باری ہے اس سے کہنا۔۔۔ شاید اسے یاد نہیں رہا کہ اس کے نام نہاد چاچا کی تین جوان بیٹیاں ہیں اور۔۔۔"

"شٹ اپ۔" ملک غضنفر غرائے "اس سے آگے ایک لفظ مت کہنا چوہدری۔۔۔ یہاں بھی کوئی چوڑیاں پہن کر نہیں بیٹھا۔ اور مولوی اللہ یار تمہارے کسی مزارعے کا بیٹا نہیں تھا کہ جس کو قتل کر کے تم بچ جاتے۔۔۔ وہ عنصر علی فاروقی کا بیٹا تھا اور اس کا اور اس کی بیوی کا قتل تمہیں مہنگا پڑے گا۔۔۔ روزِ حساب آپہنچا ہے چوہدری۔۔۔ بہت بچ لیے تم۔۔۔"

دوسری طرف ایک لمحہ کو خاموشی چھائی رہی۔

"یہ ایک نئی کہانی ایجاد کی ہے تم نے ملک۔"

"اس کہانی کی حقیقت بہت جلد معلوم ہو جائے گی تمہیں۔"

جواب میں جانے اس نے کیا کہا تھا کہ ملک غضنفر نے غصے سے "بل شٹ" کہتے ہوئے ریسیور کریڈل پر پھینکا اور عبداللہ کا ہاتھ پکڑا۔

"کون تھا شاید چوہدری اعجاز؟" عبداللہ نے پوچھا۔

"ہاں۔ چوہدری اعجاز ضمانت پر رہا ہو کر گھر آگیا ہے۔ دھمکیاں دے رہا تھا۔"

"تو پھر؟" عبداللہ نے پریشان ہو کر انہیں دیکھا۔

"ڈونٹ وری مائی سن! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کا وقت اب پورا ہو گیا ہے۔ وہ قانون کے ہاتھوں سے کسی طرح بھی نہیں بچ سکتا۔"

وہ یونہی اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے باہر کی طرف بڑھے۔ دانیال ان کے پیچھے تھا کی رنگ ہاتھ میں گھماتا اور مسکراتا ہوا۔

☆ ☆ ☆

"عبداللہ! بیٹا کیا مصروف ہو؟" ماسٹر شفیق احمد نے عبداللہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں کوئی خاص نہیں۔ آیئے چچا جان۔" عبداللہ نے جو "اسلامی فقہ" کا مطالعہ کر رہا تھا۔ کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ ماسٹر شفیق احمد بیڈ کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"بیٹا! تمہارا کیس کہاں تک پہنچا۔؟"

"بس چچا جان! انشاءاللہ اگلی پیشی میں فیصلہ ہو جائے گا گواہیاں تو اس بار ہو گئیں۔ رابعہ ملک کی گواہی اور بیان نے تو مہر ثبت کر دی۔ انہوں نے بغیر کسی خوف اور جھجک کے اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔۔۔ اور عبدالقادر نے بھی گواہی دی ہے۔ لوگوں کو کافی حوصلہ ہوا ہے اس سے۔۔۔ اگر ضرورت پڑی تو ایک دو گواہ اور بھی مل سکتے ہیں۔"

"بیٹا! تمہاری امی جان کی خواہش تھی کہ تمہاری شادی کر دی جائے۔ پہلے تو ہمارا خیال تھا

"جی چچا جان! کیسے۔"

"یہ کہ تم اور انعم۔۔۔ بیٹا! میں نے بہت پہلے سوچا تھا کہ تمہاری اور انعم کی شادی۔ لیکن اب جبکہ تمہیں اپنے عزیز و اقارب مل گئے ہیں۔ تم ان سے پوچھ لو۔ تمہارے دادا ہیں۔ چچا ہیں جو فیصلہ وہ کریں۔۔۔ جہاں بھی جو بھی لڑکی تمہارے لیے پسند کریں۔ ہم تو بس اس گھر میں بھولانا چاہتے ہیں۔۔۔ تمہاری خوشی۔"

"چچا جان!" عبداللہ نے محبت سے ان کے ہاتھ تھامے۔ "میرے متعلق ہر فیصلہ آپ نے

ہی کرنا ہے۔ یہ اختیار صرف آپ کو ہے۔ آپ نے میرے لیے جو سوچا ہے اچھا ہی سوچا ہوگا۔ مجھے آپ کا فیصلہ قبول ہے۔ لیکن چچا جان پلیز! ابھی انعم کا ماسٹر مکمل نہیں ہوا۔۔۔ مجھے سیٹل ہونے کے لیے تھوڑا وقت چاہئے۔ امی جان کچھ رونق بپا کرنا چاہتی ہیں تو اس کیس کا فیصلہ ہو جائے تو منگنی کا فنکشن ارینج کر لیں۔۔۔ آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں تو نکاح کر دیں لیکن رخصتی ابھی نہیں۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے بیٹا! بھلا تم پر اعتبار نہیں ہوگا تو کس پر ہوگا۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ شاید تمہارے تایا ایک غریب ماسٹر کی بیٹی سے۔۔۔"

"چچا جان!" عبداللہ نے انہیں ٹوکا۔ "میں بھی تو ایک غریب ماسٹر کا ہی بیٹا ہوں۔ آپ ایسی باتیں مت کیا کریں۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔"

"میں تم پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔" ماسٹر شفیق احمد کھڑے ہو گئے۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔

"اچھا تم پڑھو میں نے ڈسٹرب کر دیا تمہیں۔"

ڈسٹرب تو وہ ہو ہی گیا تھا۔۔۔ ماسٹر شفیق احمد کے جانے کے بعد اس نے کتاب بند کر کے آنکھیں موند کر ٹیک لگا لی۔

"عبیر!" ایک سسکی سی اس کے لبوں سے نکلی۔ "تو اب مجھے اپنے تڑختے خول کو پھر تعمیر کرنا ہے۔ مجھے اب پھر سنگ تراشی کرنا ہے۔۔۔ زخمی انگلیوں اور فگار دل کے ساتھ۔ مجھے اپنے کشورِ دل کی ہر فصیل کو پھر سے بنانا اور تراشنا ہے۔۔۔ میں یہ کیسے کر پاؤں گا۔ کیسے تمہاری یادوں کے گرد دیوار چن سکوں گا۔ کتنے نوکیلے، کاٹ دار اور پتھریلے راستوں پر چل کر کہکشاں سجانی ہوگی عبیر! کاش میں با اختیار ہوتا۔۔۔ مجھے اپنے اوپر اختیار ہوتا تو تمام عمر کے رت جگے اپنی تقدیر کر لیتا۔

ہر شام کی سرخی میں تمہاری یاد کے پرتو دیکھتا
ہر صبح کی کرن میں تمہارا تصور مہکاتا!

لیکن عبیر! میں کیا کروں۔۔۔ میں چچا جان اور امی جان کے دل کی خوشی کو قتل نہیں کر سکتا۔ یہ بارِ وفا مجھے اٹھانا ہی ہے عبیر! میں احسان فراموش نہیں کہلانا چاہتا۔

مجھے ان محبتوں کا قرض ادا کرنا ہی ہوگا عبیر! جنہیں اب تک میں جھولیاں بھر بھر کر سمیٹتا رہا۔ میں نے تو تمہاری آغوش میں دھڑکنوں کی تال سننا چاہی تھی۔ میں نے تو تمہاری موجودگی سے انجمن سجانا چاہی تھی لیکن سب خواب تعبیر نہیں پاتے عبیر۔۔۔

جانے کیسے کٹے گی شبِ زندگی
اور کیسے اٹھے گا یہ بارِ وفا

"یہ دودھ۔۔۔!" انعم جانے کب بنا آہٹ کیے اندر آ گئی تھی۔

اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور دل کا درد چھپا کر مسکرایا۔

"آؤ انعم! بیٹھو۔"

"آپ کچھ سوچ رہے تھے شاید۔"

"ہاں شاید۔" اس نے انعم کی طرف دیکھا۔

اور کتنے دنوں سے یہ ہونٹ مسکرائے نہیں۔ اور ان آنکھوں میں اداسیاں ڈیرا جمائے بیٹھی ہیں۔ میں تمہارا دکھ سمجھتا ہوں انعم! تم مجھے کھو دینے کے کرب سے گزر رہی ہو۔۔۔ اور اس بات سے بے خبر ہو کہ!

کوئی ہاتھ یونہی اٹھے رہیں
کہیں بن دعا کے ملے کوئی

"انعم! تمہیں پتا ہے امی جان اور چچا جان مجھے اور تمہیں ایک بندھن میں باندھنے کا سوچ رہے ہیں۔ میں نے چچا جان سے کہا ہے کہ انعم کے ماسٹر کرنے کے بعد۔۔۔ میں نے صحیح کہا نا۔"

انعم کی آنکھوں میں پہلے یکدم حیرت اتری پھر ایک ساتھ ہزاروں کرمکِ شب جل اٹھے اور رخساروں پر شفق پھیل گئی اور پلکیں بوجھل ہو کر جھک گئیں۔

"کہو نا، ٹھیک کہا نا۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے نا۔" انعم کی پلکیں اور جھک گئیں۔ رخسار دہک اٹھے۔

خدا نے بن مانگے ہی اس کی جھولی ستاروں سے بھر دی تھی۔

"کیا تمہیں میری رفاقت منظور نہیں انو؟" عبداللہ نے شرارت سے اسے دیکھا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔ ایسی بات تو نہیں۔ امی اور ابا جان نے جو سوچا ہے ٹھیک ہے۔"

"اچھا تو پھر تمہیں اس بات پر اعتراض ہے کہ میں نے تمہارے ماسٹرز کرنے کے بعد کیوں کہا۔ تو خیر ہے۔ میں ابھی جا کر چچا جان سے کہہ دیتا ہوں کہ انو کو بہت جلدی ہے اور وہ کہہ رہی ہے کہ وہ ماسٹرز کرنے کا انتظار نہیں کر سکتی لہٰذا۔۔۔"

"آپ بہت خراب ہیں عبداللہ! میں نے کب کہا ایسا۔" اس نے شرگیں انداز میں اسے دیکھا اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپاتے ہوئے بھاگ گئی۔

عبداللہ کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھری اور ساتھ ہی دو آنسو آنکھوں کے کونوں پر آ کر ٹھہر گئے اور انگلی کی پور سے انہیں پونچھتے ہوئے اس نے پھر آنکھیں موندتے ہوئے تکیے پر سر رکھ دیا۔

اب سفر کا استعارہ اور ہے

اے اینڈڈی سے جوتے لے کروہ باہر نکلی ہی تھی کہ لنہ عبدالطیف نے پیچھے سے آکراس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ تو وہ چونک کر مڑی اور لنہ کو دیکھ کراس کی آنکھوں میں حیرت سی اتر آئی۔

"ہیلو!" لنہ نے اسے اپنی طرف دیکھتے پاکر کہا۔ "تم اتنی جلدی آگئیں؟"

"میں گئی ہی نہیں۔"

لنہ مسکرائی اور لیلیٰ کو لگا جیسے لنہ کی مسکراہٹ نے اردگرد کے ماحول کو بھی اداس کردیا ہو یا پھر یہ اس کے اپنے اندر کا احساس تھا جو ہر آن' ہر لمحہ اور ہر چیز اور ماحول کو اداس کر دیتا تھا۔

"مگر کیوں لنہ؟"

اس نے ہاتھ میں پکڑا شاپر بائیں ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے دایاں ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"اس لیے کہ۔"

لنہ نے ہونٹ بھینچے اور پتا نہیں کیوں اس بات پر لیلیٰ کو لگا جیسے اس کی سبز آنکھوں میں نمی سی تیر گئی ہو۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے پلکیں جھکالیں۔

"یوں ہی پروگرام بدل گیا۔ عبدالحیٔ کا خیال ہے کہ یہ وقت شادی کے لیے مناسب نہیں ہے۔"

"اور تم اتنے دن کہاں رہیں؟" لیلیٰ نے پھر پوچھا۔ جسے شادی ملتوی ہونے کا سن کر ازحد رنج ہوا تھا۔

"میں روٹرڈیم خالہ کے پاس ہی رہی۔"

"لنہ! اگر پروگرام بدل گیا تھا تو تمہیں واپس آجانا چاہیے تھا۔ تمہیں پتا ہے نا۔ ان دنوں ڈاکٹر ونسطر بیکر کتنے اہم لیکچر دے رہے ہیں۔"

لیلیٰ نے پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے اسے سرزنش کی۔

"ہاں۔۔۔ لیکن میرا موڈ نہیں تھا۔"

"اور تم ڈیلف کب پہنچیں؟"

"کل شام آگئی تھی اور انکل قیس کی طرف گئی تھی سیدھی۔۔۔ اور۔۔۔ اور اب آئی۔ ایچ۔ ای جانے کے ارادے سے نکلی تھی سوچا تھا۔ رستے میں کچھ شاپنگ بھی کرلوں گی۔ انکل قیس نے ہی مجھے ڈراپ کیا تھا یہاں۔"

"تو شاپنگ کرلی؟"

"نہیں پھر کسی دن کرلوں گی۔ تم گاڑی میں آئی ہونا۔"

"ہاں' تمہیں پتا تو ہے مجھے سائیکل کی سواری پسند نہیں ہے۔"

"حالانکہ یہاں ہالینڈ میں زیادہ لوگ سائیکلیں پسند کرتے ہیں۔"

لنہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ لیلیٰ نے محسوس کیا کہ لنہ اپ سیٹ ہے۔ شاید عبدالحیٔ کے پروگرام تبدیل کرلینے سے۔ حالانکہ یہ عبدالحیٔ کی ہی تو خواہش تھی کہ وہ ستمبر میں شادی کرلینا چاہتا ہے جبکہ لنہ نے کہا بھی تھا کہ وہ اپنا آخری سمسٹر دے کر ہی شادی کرنا چاہتی ہے۔ لیکن عبدالحیٔ نے تو ضد ہی پکڑلی تھی۔ روٹرڈیم سے لنہ کی خالہ نے فون کیا تھا۔

"لنہ! تم عبدالحیٔ کی بات مان لو پلیز۔" اور لنہ نے خالہ کی بات مان لی تھی۔

"ٹھیک ہے خالہ! میں آجاؤں گی۔ لیکن میرا سمسٹر شروع ہونے والا ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ پندرہ دن رہ سکوں گی۔"

اور جب لنہ نے اپنی شادی کے متعلق بتایا تھا تو تھوڑی حیرت کے بعد سب ہی خوش ہو گئی تھیں۔

انڈیا کی ریتا اور اکرم سلطانہ

سعودیہ کی مجدہ یوسف۔

وہ خود لیلیٰ محبت اللہ شاہ حتی کہ کیتھی اور لنڈا بھی۔ کیتھی نے جو یو۔ ایس۔ اے سے آئی تھی۔ جس کی ماں میکسیکن اور باپ جرمن تھا اور کیتھی کی پیدائش سے پہلے ہی دونوں میں علیحدگی ہو چکی تھی۔ لنہ کی شادی کا سن کر کہا تھا۔

"تم ایشیائی لوگ بہت خوش قسمت ہوتے ہو۔۔۔ تمہارا ایک گھر ہوتا ہے۔ بچے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں اب گھر نہیں بن پاتے۔ مجھے کوئی جاہل' بدصورت مرد بھی گھر بنانے کی آفر

کرے تو میں سب کچھ چھوڑ کر چل دوں۔" وہ الیکٹرانیکل انجینئرنگ کے شعبے میں تھی اور ر...
جگدیش نے بہت خلوص سے اسے مشورہ دیا تھا۔

"کیتھی! اگر زندگی میں کوئی من پسند مرد مل جائے تو اپنے معاشرے کے رواج کے مطابق اس کے ساتھ یونہی زندگی مت بتانا بلکہ اسے شادی کی آفر کر دینا فوراً"۔"

اور کیتھی افسردگی سے مسکرا دی تھی۔

"تمہارے ہاں مرد ذمہ داریاں نبھانے سے ڈرتا ہے شاید۔"

اکرم سلطانہ نے رائے دی تھی اور پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر لنہ کو اپنے مشورے سے نوازنے لگی تھیں کہ اسے اس ایک ہفتے میں کیا کیا کرنا ہے۔ بلکہ انہوں نے لنہ کا چارج ہی اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

ابٹن بنایا جا رہا ہے۔ بیسن اور ہلدی ملا کر اس کے ہاتھوں اور پیروں سے میل اتاری جا رہی ہے اور جانے کیا کیا۔

"ہمارے ہاں دلہن کو مہینوں پہلے سے نائن آ کر ابٹن ملنے لگتی ہے۔" وہ ساتھ ساتھ بتاتی بھی جاتیں۔ رات کو دودھ زبردستی دیا جا رہا ہے۔ جوس پلائے جا رہے ہیں۔"

"اکرم سلطانہ! کیا میں کسی اکھاڑے میں اترنے جا رہی ہوں۔" لنہ ہنستی۔

"بس تم چپ رہو، دلہن نہیں بولتی۔"

اکرم سلطانہ پیار سے اسے ڈانٹ دیتیں۔ اور لنہ کی سبز آنکھوں میں روشنیاں کوندنے لگتیں۔۔۔ اور پھر انہوں نے مل کر اس کے لیے ضروری شاپنگ کی تھی۔ لنہ نے کتنی ہی بار کہا تھا۔

"وہاں خالہ نے ساری شاپنگ کر رکھی ہے۔" لیکن ان دنوں سب نے مادام ووچی، "ledamarry" اور Zeeman کے کتنے ہی چکر لگا ڈالے تھے۔ عبدالحیٔ اور اس کے لیے چھوٹی موٹی شاپنگ کی تھی اور پھر جانے سے دو دن پہلے اکرم سلطانہ نے ہندوستان سے آئی ہوئی مہندی گھول کر اس کے ہاتھوں پر لگائی تھی۔ کیتھی اور لنڈا نے بہت حیرت سے اس کے ہاتھوں پر بنے پھول دیکھے تھے۔

گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے غیر ارادی طور پر لیلیٰ نے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ مہندی لگے ہاتھ۔ لنہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

"تمہاری بات ہوئی عبدالحیٔ سے؟" لیلیٰ نے پوچھا۔

"نہیں۔ اس نے خالہ کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ مجھے بتا دیں کہ وہ روٹرڈیم نہیں آ رہا۔"

لنہ بے حد سنجیدہ تھی۔ گاڑی کا رخ آئی۔ ایچ۔ ای کی طرف موڑتے ہوئے لیلیٰ نے کسی قدر ناراضی سے کہا۔

"مگر لنہ! تمہیں اس سے بات تو کرنا چاہیے تھا کہ اس نے خواہ مخواہ تمہیں کیوں ڈسٹرب کیا۔"

"اس نے خالہ سے کہا تھا کہ وہ ایک ارفع مقصد کے لیے یہ شادی ملتوی کر رہا ہے۔۔۔ بھلا بتاؤ میں کیا کہتی۔"

"مگر وہ ارفع مقصد کیا ہے، تمہیں پوچھنا تو چاہیے تھا نا لنہ؟" لیلیٰ کو لنہ سے بہت محبت تھی۔

"ہر فلسطینی کا اولین مقصد اور آرزو تو وطن کی آزادی ہے۔ شاید وہ بھی اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہتا ہو۔۔۔ سو میں کیا پوچھتی لیلیٰ؟"

وہ افسردگی سے مسکرائی۔

"تمہیں شاید پتا نہیں لیلیٰ! عبدالحیٔ میرا سگا خالہ زاد ہے۔۔۔ روٹرڈیم والی خالہ کا بیٹا نہیں چھوٹی خالہ کا۔۔۔ اور وہ بہت چھوٹا تھا تب اسرائیلیوں نے اس کے بھائی، باپ اور ماں کو مار ڈالا تھا۔ ان کے گاؤں پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔ وہ بہت دنوں تک کیمپ میں رہا تھا بعد میں انکل قیس کو پتا چلا تو وہ اسے لے آئے تھے، وہ تب سے ہی کچھ کرنا چاہتا تھا، اپنے ملک کے لیے مسجد اقصیٰ کے لیے۔۔۔ لیکن یہاں انکل قیس کے پاس رہ کر شاید وہ کچھ نہیں کر پا رہا تھا اس لیے وہ فلسطین چلا گیا تھا۔"

وہ خاموش ہو گئی تو لیلیٰ نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ عبدالحیٔ سے وہ دو ایک بار ملی تھی۔ وہ انکل قیس کے گھر ہی رہتا تھا اور کبھی کبھار لنہ سے ملنے اس کے ہاسٹل میں آتا تھا۔ گھنگریالے بالوں والا یہ گندمی رنگت والا عبدالحیٔ بہت بے چین اور مضطرب لگتا تھا اور لیلیٰ نے ہر بار اس سے ملنے کے بعد یہی سوچا تھا کہ کوئی چیز ہے جو اندر ہی اندر ہمہ وقت اسے مضطرب و بے چین رکھتی ہے۔ پہلی بار جب لنہ نے اس کا تعارف کروایا تھا عبدالحیٔ سے کہ

"یہ لیلیٰ ہیں پاکستان سے آئی ہیں" تو عبدالحیٔ کی آنکھوں میں یکایک اپنائیت کی روشنی کوندی تھی، جیسے کسی اپنے کو دیکھ کر کوندتی ہے پھر اس کے لہجے میں حسرت سی اتر آئی تھی۔

"آپ بہت خوش قسمت ہیں لیلیٰ کہ ایک آزاد ملک کی آزاد شہری ہیں۔"

اور لیلیٰ نے سوچا تھا "پتا نہیں میں خوش قسمت ہوں یا نہیں۔" اسے تو ہمیشہ ہی اپنی خوش قسمتی پر شک ہی رہا تھا۔ ہمیشہ ہی اس نے یہی سوچا تھا کہ کاش ایسا نہ ہوتا ویسا نہ ہوتا۔ کاش وہ سرخ حویلی میں پیدا نہ ہوتی۔

محب اللہ شاہ کی بیٹی نہ ہوتی۔

یا ہر حویلی میں وہ بڑا کنواں نہ ہوتا۔

اسے انیق سلیمان سے محبت نہ ہوتی۔

اور۔۔۔ اور سعد سلیمان اس سے محبت نہ کرتا، کتنے بہت سارے کاش تھے اس کی زندگی میں

اور وہ عبدالحئی لنہ عبداللطیف کا منگیتر کہتا تھا۔ وہ خوش قسمت ہے۔

"اور مجھے خود سے زیادہ تم سب کا خیال تھا۔ تم لوگ شادی کے ملتوی ہونے کا سن کر ہرٹ ہوگی اس لیے تو میں روٹرڈیم میں چھپی رہی اور پھر ڈیلف آ کر انکل قیس کے گھر چلی گئی۔" اس کی سبز گہری سبز آنکھیں پانیوں میں ڈوب گئیں۔

"کم آن لنہ۔۔۔۔! ٹیک اٹ ایزی۔"

لیلیٰ نے ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھے رکھے دوسرے ہاتھ سے اسے تھپکا لیکن وہ سر جھکائے روتی رہی۔۔۔ اور لیلیٰ نے سوچا۔

اچھا ہے وہ رو لے تاکہ دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ وہ دو سالوں سے ساتھی رہ رہی تھیں۔

ای۔ایچ۔ای کے ہاسٹل میں۔ یہ چار سوٹ کا ایک اپارٹمنٹ تھا۔ ہر ایک کے پاس دو روم ایک بیڈ مع باتھ اور ایک سٹنگ تھا۔ چاروں سوٹس کا کچن مشترکہ تھا۔ وہ اور لنہ اکٹھی رہتی تھیں۔

ریتا جگدیش اپنے ہسبنڈ کے ساتھ آئی تھی۔ جگدیش Mangement Construction میں M.S.C. کر رہا تھا اور ریتا کو بھی ساتھ لے آیا تھا ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔

اکرم سلطانہ کا تعلق یو۔پی سے تھا' وہ دونوں میاں بیوی بھی پڑھنے کے لیے غرض سے آئے ہوئے تھے۔ انہیں یہاں آئے ہوئے تین سال ہو گئے تھے۔ اکرم سلطانہ اپنی دو بچیوں کو میکے چھوڑ کر آئی ہوئی تھیں۔

چوتھے سوٹ میں کیتھی اور لنڈا رہتی تھیں۔ کیتھی یو۔ایس۔اے سے آئی تھی اور لنڈا برٹش تھی۔ شروع میں وہ کچھ لیے دیے رہی تھیں لیکن پھر وہ بھی گھل مل گئی تھیں۔ لنڈا' کیتھی' ریتا' اکرم سلطانہ' لیلیٰ اور لنہ میں بہت دوستی تھی۔ لنہ فلسطینی تھی اور یہاں اس کے چچا رہتے تھے لیکن جب وہ تعلیم کی غرض سے آئی تو اس نے آئی۔ایچ۔ای میں ہی ٹھہرنا پسند کیا تھا۔ یوں ویک اینڈ پر وہ انکل قیس کی طرف چلی جاتی تھی۔۔۔ اور لمبی چھٹیوں میں روٹرڈیم اپنی خالہ کے پاس۔

مجدہ یوسف سے جو سعودیہ سے آئی تھی اور سری لنکا کی اینا سے بھی ان کی کافی دوستی تھی اور جس روز لنہ کو روٹرڈیم جانا تھا۔ اس سے ایک روز پہلے اکرم سلطانہ نے ہاسٹل میں خوب رونق لگائی تھی۔ اسے پیلا جوڑا پہنا کر اور چھوٹی ٹیبل پر ہاتھوں سے ڈھولک بجا بجا کر خوب گانے گائے تھے۔ لیلیٰ اور ریتا بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئی تھیں۔ اور کیتھی لنڈا اور اینا نے اس تھاپ اور گیت کے بولوں پر رقص کیا تھا اور آخر میں رخصتی کا گیت گاتے ہوئے اکرم سلطانہ کی آواز بھرا گئی تھی اور آنکھیں آنسوؤں سے جل تھل ہو گئی تھیں۔

"کاہے کو بیاہی بدیس لکھی بابل مورے۔"

اور اس کی آواز کے ساتھ آواز ملاتے ہوئے ریتا جگدیش بھی رو پڑی تھی۔ اور وہ حیران سی بیٹھی کیتھی اور لنڈا کو ان بولوں کا مطلب سمجھانے لگی تھی اور یہ کہ پاکستان ہندوستان میں بیٹی کو رخصت کرتے ہوئے ایسے گیت گانا روایت ہے اور آنسو ان بولوں کے ساتھ خود ہی دل کی زمین سے ابل پڑتے ہیں۔

"اکرم سلطانہ کی آواز بھی خوبصورت ہے اور یہ بول ان سے دل کٹتا اور ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ اس پوئٹری میں بہت درد ہے۔"

کیتھی نے تبصرہ کیا تھا۔

"یہ دل کو چیرتا ہے۔ بہت فیسی نیٹ کرتا ہے۔"

اور اکرم سلطانہ خاموش ہوئیں تو ریتا نے گانا شروع کیا تھا۔

کنکاں لمبیاں نی مائے
کیوں جمیانی مائے
کنکاں لمیاں نی مائے

تو لیلیٰ عبداللطیف کا جی چاہا تھا' وہ خود بھی دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دے اتنا روئے کہ لال حویلی سے ملحق قبرستان میں سوئی ہوئی اس کی ماں اس کے درد سے بے چین ہو کر اٹھ بیٹھے اور وہ اس کے سینے سے لگ کر سب بھول جائے سب کچھ۔

اس نے ایک نظر پھر لنہ پر ڈالی تھی' جو ٹشو سے چہرہ صاف کر رہی تھی اور پھر یکدم ہی ایکسلیٹر پر دباؤ بڑھا دیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس نے ادھر ادھر چور نظروں سے دیکھتے ہوئے اوپر چھت پر جانے والی سیڑھی پر پہلا قدم رکھا ہی تھا کہ پیچھے سے محفوظ فاطمہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا وہ اچھل پڑی۔

"اس وقت دوپہر میں اوپر کہاں جا رہی ہو۔؟"

اور ان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ انہیں دیکھنے لگی۔

"خالہ جانی! آپ کہیں جا رہی ہیں؟"

ان کا سوال بھول کر اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"میں تو کہیں نہیں جا رہی' البتہ تم بتاؤ۔ اس دوپہر میں اوپر چھت پر کیا کرنے جا رہی ہو۔"

"وہ خالہ جانی!"

اس نے چور نظروں سے مڑ کر بڑی اماں کے کمرے کی طرف دیکھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو اماں نے اسے دوپہر میں برآمدے میں بیٹھے دیکھ کر اٹھا کر بڑی اماں کے پلنگ پر زبردستی لٹایا تھا۔

"سو جا منی! ورنہ لو لگ جائے گی۔"

اور بڑی اماں نے جو کروٹ بدلے لیٹی تھیں۔ مڑ کر مچی مچی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

"اماں! اسے اٹھنے مت دیجیے گا۔ چین نہیں ہے ذرا اسے۔ باہر لو میں بیٹھی تھی۔

"تم بھی سو جاؤ حفیظہ!"

"بس اماں! تھوڑا سا کام نبٹا لوں۔"

اور وہ اماں کے خوف سے آنکھیں بند کر کے بڑی اماں کے پیچھے لیٹ گئی تھی مگر نیند تو اسے بالکل نہیں آ رہی تھی۔ عام حالات میں اسے بڑی اماں کے اس سرخ پایوں والے اونچے پلنگ پر لیٹنا اور اس بڑے سارے تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھنا اچھا لگتا تھا۔ یہ بڑے بڑے دو تکیے جن پر پیلے ساٹن کے کڑھائی والے غلاف چڑھے تھے اسے بڑے فیسی نیٹ کرتے تھے اور کوثر آپا نے بتایا تھا کہ یہ بڑی اماں کے جہیز کے ہیں۔

"اور کیا اس زمانے میں لوگ ان بڑے بڑے تکیوں پر سر رکھ کر سوتے تھے۔" اس نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"نہیں منی! دلہنیں ٹیک لگا کر بیٹھا کرتی تھیں۔"

"اور اس ایک تکیے میں جتنی روئی ہے اس سے کم از کم دس تکیے تو بن ہی جائیں گے نا۔" اس نے اپنی عقل کے مطابق سوچا تھا۔

"ان میں روئی نہیں ہے۔ ایک بار اماں نے بتایا تھا کہ ان میں آک کے پھول بھرے ہوئے ہیں۔"

کوثر آپا نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا لیکن اس نے کئی بار دبا دبا کر دیکھا تھا۔ اسے تو روئی ہی لگی تھی۔ اتنے سخت ٹھنسے ہوئے تکیے تھے۔ جب وہ ان سے ٹیک لگا کر بیٹھتی تھی۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ کوئی شہزادی یا ملکہ ہو لیکن سونے کے لیے تو اسے صرف اپنا ہی تکیہ پسند تھا۔ نرم ملائم سنبل کا تکیہ اور اس کے بغیر تو اسے نیند ہی نہیں آتی تھی مگر اس وقت تو اس کا سارا دھیان برساتی کے ایک طاقچے میں رکھی اپنی گڑیوں کی طرف تھا۔ پرسوں شام ہی تو اس نے اپنی گڑیوں والا ڈبہ وہاں رکھا تھا اور سوچا تھا کہ دوپہر میں برساتی میں بیٹھ کر کھیلے گی لیکن کل تو اماں نے دبوچ کر اسے اپنے پاس ہی لٹا لیا تھا اور آج کتنی ہی دیر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ چپکے سے اٹھی تھی۔ بڑی اماں کے خراٹے پورے کمرے میں گونج رہے تھے۔ پہلے اس نے یونہی لیٹے لیٹے چھت پر لگے رنگین شیشے گننے شروع کیے تھے، پہلے سرخ۔۔۔ پھر نیلے، پھر پیلے اور پھر جلد ہی اکتا کر اس نے نظریں بند کھڑکیوں کی طرف لگا دی تھیں۔ اور پھر جب اسے یقین ہو گیا تھا کہ بڑی اماں بہت گہری نیند میں ہیں تو چپکے سے اٹھ کر باہر آئی تھی۔

نانا ابا کا کمرہ بند تھا۔ بڑی اماں، ابا، اماں، ماموں، کوثر آپا شاید سب ہی سو رہے تھے۔ دھوپ بے حد چمکیلی تھی۔ صحن میں لگے امرود اور جامن کے درختوں پر دھوپ ٹھہری ہوئی سی لگتی تھی۔ برآمدے کا فرش بھی گرم تھا۔ اس نے پہلے دایاں پاؤں اٹھا کر بائیں پر رکھا پھر بایاں دائیں پر اور پھر جھک کر تخت پوش کے نیچے سے اماں کی چپلیں اٹھا کر پاؤں میں اڑس لیں اور دبے قدموں چھت کی طرف بڑھی تھی کہ محفوظ فاطمہ نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔

محفوظ فاطمہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"میں۔۔۔ فوظی خالہ! میں اوپر کھیلنے جا رہی تھی اپنی گڑیوں سے۔۔۔" اسے بتانا ہی پڑا۔

"اوپر برساتی میں طاقچے میں میں نے اپنی گڑیوں والا "بکس" رکھا ہوا ہے۔"

"لیکن منی!" محفوظ فاطمہ کے ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔ "اوپر برساتی میں تو چڑیلیں رہتی ہیں، یہ لمبے لمبے دانتوں والی اور تم جیسی پیاری پیاری چھوٹی بچیوں کو تو وہ مکھی بنا دیتی ہیں یا پھر ایک ہی باریوں کر کے ہڑپ کر جاتی ہیں۔"

محفوظ فاطمہ نے اپنا منہ کھولا تو اس کا دھیان ان کے دانتوں کی طرف چلا گیا۔

کتنے سفید۔ چھوٹے چھوٹے دانت تھے۔ ذرا ذرا سے فاصلے سے جیسے مکئی کے بھٹے پر مکئی کے دانے ترتیب سے لگے ہوں۔ اس نے اپنے سامنے کے دو ٹوٹے دانتوں کے خالی حصے پر زبان پھیری اور پھر فوراً ہی ڈر کر انگلیوں سے وہ جگہ صاف کی۔ ابھی کل ہی جب اس کے دانت ٹوٹے تھے تو بڑی اماں نے سمجھایا تھا کہ زبان بالکل مت پھیرنا نہیں تو نئے دانت ٹیڑھے میڑھے نکلیں گے، بالکل چڑیلوں کی طرح۔۔۔"

"مگر خالہ جانی! وہ میرا گڑیوں کا بکسا۔"

"وہ۔۔۔" انہوں نے پرخیال انداز میں اسے دیکھا۔ "اس وقت تو دوپہر میں جب سب سو رہے ہوتے ہیں تو چڑیلیں اوپر برساتی میں کھیلتی کودتی ہیں اور آزادی سے گھومتی ہیں لیکن شام میں تم جا کر اپنا "بکسا" اٹھا لینا۔"

"لیکن اگر شام میں بھی کوئی چڑیل آ گئی تو۔"

اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔ حالانکہ پرسوں شام ہی تو وہ اوپر برساتی میں جا کر بہت دیر کھیلتی رہی تھی اور اسے وہاں کوئی چڑیل نظر نہیں آئی تھی۔"

"شام کو اکثر چڑیلیں سیر کرنے چلی جاتی ہیں اور پھر رات کو واپس آ جاتی ہیں۔"

"لیکن اگر کسی چڑیل کی طبیعت خراب ہو گئی اور سیر کو نہ گئی تو۔۔۔"

اسے بال کی کھال نکالنے کی عادت تھی اور بعض اوقات وہ ایسے ایسے نکتے نکالتی تھی کہ سب حیران رہ جاتے کہ یہ چھ سال کی بچی ہے یا افلاطون۔ محب اللہ شاہ تو اکثر اسے "افلاطون کی

نانی" کہتے تھے اور اس وقت محفوظ فاطمہ کو بھی وہ افلاطون کی نانی ہی لگی تھی اور اس نے کان پکڑ کر ہلکے سے موڑتے ہوئے کہا تھا۔

"افلاطون کی نانی! اب بھاگ جا ورنہ اماں اٹھ گئیں تو ٹھکائی کریں گی اور میں شام میں تمہارے ساتھ اوپر چلی آؤں گی پھر تم اپنا گڑیوں والا "بکسا" اٹھا لینا۔"

اور اس نے بڑی شکرگزاری سے محفوظ فاطمہ کو دیکھا تھا۔ یوں بھی اسے خالہ جانی اچھی لگتی تھیں اماں تو بہت سخت تھیں۔ کبھی کبھی ایک آدھ تھپڑ بھی جڑ دیتی تھیں لیکن خالہ جانی تو ہمیشہ پیار ہی کرتی تھیں۔

"مگر خالہ جانی! مجھے نیند نہیں آ رہی۔ آپ میرے ساتھ آ کر لڈو کھیلیں نا۔"

"تم کوثر سے لڈو کھیل لو، وہ جاگ رہی ہے اور میں ذرا بڑی اماں کے کمرے میں نماز پڑھنے جا رہی ہوں۔"

"آپ اپنے ہی کمرے میں نماز پڑھ لیں نا۔ نہیں تو بڑی اماں آپ سے بھی کہیں گی نماز پڑھ کر سو جائیں۔"

"کمرے میں کوثر نے ریڈیو لگا رکھا ہے اور گانے سن رہی ہے۔ سمجھ میں آیا۔ اب بھاگو۔"

اور وہ مڑ مڑ کر محفوظ فاطمہ کو دیکھتی کوثر آپا کے کمرے میں آ گئی تھی۔ یہ کوثر آپا اور خالہ جانی کا مشترکہ کمرہ تھا۔ دو سنگل بیڈ آمنے سامنے پڑے تھے۔

کوثر آپا اور محفوظ فاطمہ دونوں ہی بڑی نفاست پسند تھیں۔ انہوں نے کمرے کو بڑی نفاست سے سجا رکھا تھا۔ محفوظ فاطمہ کوثر آپا سے صرف چار سال بڑی تھیں اس لیے دونوں خالہ بھانجی سے زیادہ ایک دوسرے کی سہیلیاں تھیں۔ حفیظ فاطمہ سب سے بڑی تھیں ان سے چھوٹے حمزہ شاہ تھے پھر اسرار تھے اور پھر حفیظ فاطمہ سے دس سال چھوٹی محفوظ فاطمہ تھیں۔ حفیظ فاطمہ کی پیدائش کے چھ سال بعد حمزہ پھر دو سال بعد اسرار اور پھر دو سال بعد محفوظ فاطمہ آئی تھیں دنیا میں۔ یوں چھ سال تک حفیظ فاطمہ نے ماں باپ کے لاڈ تنہا اٹھائے تھے جس سے وہ کچھ ضدی ہو گئی تھیں اور خود سر بھی۔

چودہ سال کی عمر میں "باماں بالا" کے سید محب اللہ شاہ کا رشتہ حفیظ فاطمہ کے لیے قبول کر لیا گیا۔ سید محب اللہ شاہ خوبصورت، پڑھے لکھے اور بیوہ ماں کے اکلوتے بیٹے تھے۔ "باماں بالا" میں ان کی حویلی سرخ حویلی سے بڑی ہی ہو گی۔ یہ رشتہ سید اقتدار حسین شاہ کو ہر لحاظ سے موزوں لگا تھا اور انہوں نے اپنی لاڈلی بیٹی کو چودہ سال کی عمر میں رخصت کر دیا۔۔۔ لیکن شادی کے صرف تین ماہ بعد ہی وہ روتی پیٹتی واپس آ گئیں۔ کسی معمولی سی بات پر خفا ہو کر اور انہوں نے محب اللہ شاہ سے کہہ دیا تھا کہ اگر میرے ساتھ رہنا ہے تو سرخ حویلی آ جاؤ۔۔۔ لیکن محب اللہ اپنی زمین،

جائیداد حویلی اور بیوہ ماں کو چھوڑ کر کیسے آ سکتے تھے۔

بڑی اماں اور سید اقتدار نے بیٹی کی بے جا حمایت کی اور سید محب اللہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ گھر داماد بن جائے۔ انہیں اپنی لاڈلی کی دل آزاری منظور نہ تھی جو ساس کے ساتھ رہنا نہ چاہتی تھی اور غصے میں پھر کبھی "باماں بالا" نہ آنے کی قسم کھا چکی تھی۔

یوں دس سال بعد ماں کی وفات کے بعد تھک کر کمزور ہو کر سید محب اللہ اپنی حویلی اور زمینوں کا انتظام ملازموں کے حوالے کر کے سرخ حویلی میں آ گئے تھے۔

اور یوں کوثر سلطانہ سے پورے گیارہ سال بعد وہ دنیا میں آئی تھی اور اس سے دو سال بعد عباس شاہ لیکن سید محب اللہ کو وہ عباس شاہ سے بھی زیادہ پیاری اور لاڈلی تھی۔

اماں کو تو بس کوثر اور عباس سے ہی پیار ہے۔" وہ اکثر سوچتی تھی۔ کوثر جسے اماں سے زیادہ بڑی اماں نے پالا تھا۔

کوثر آنکھیں موندے پاؤں ہلاتے ہوئے مہدی حسن کے گانے سن رہی تھی۔

"آپا!" اس نے قریب جا کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا، تو انہوں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ "تم سوئیں نہیں فتنی!"

"نہیں۔۔۔" وہ اچک کر ان کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"پاؤں نیچے لٹکاؤ۔۔۔ گندے ہیں۔" انہوں نے فوراً ٹوکا۔

"نہیں تو ابھی کھانے کے بعد تو اماں نے نہلایا ہے۔" اس نے اپنے گلابی فراک کو پھیلا کر دکھایا "اور یہ نیا فراک بھی پہنایا ہے۔"

"اچھا بیٹھ جاؤ۔" کوثر نے ذرا سا ہٹ کر اپنے بیڈ پر اس کے لیے جگہ بنائی۔

"آپ کو پتا ہے آپا۔۔۔! اوپر برساتی میں چڑیلیں رہتی ہیں۔ مجھے خالہ جانی نے بتایا ہے۔" اس نے تفصیل بتائی تو کوثر آپا مسکرانے لگیں اور ان کی آنکھیں جگر جگر چمکنے لگیں۔

"نہیں منی! وہاں چڑیلیں نہیں رہتیں، جن رہتا ہے۔۔۔ یہ لمبے لمبے خوفناک دانتوں والا۔ آئندہ تم دوپہر میں کبھی بھی اوپر چھت پر نہ جانا، نہیں تو وہ تمہیں کھا جائے گا۔"

"آپا! آپ نے کبھی جن دیکھا ہے؟"

"نہیں، لیکن مجھے پتا ہے اس کے یہ لمبے لمبے سینگ ہوتے ہیں اور بڑے بڑے دانت۔ جن سے کرچ کرچ کر کے وہ ننھے بچوں کو کھا جاتا ہے۔" وہ خوفزدہ ہو کر کوثر کے زیادہ قریب ہو گئی

"نہیں۔۔۔ وہ جانداروں کو کھاتا ہے۔ بے جانوں کو کھا کر بھلا کیا کرے گا۔" کوثر آپا ہنس پڑیں۔ اور کوثر آپا کو ہنسی بہت آتی تھی۔ ہر بات پر، چاہے وہ ہنسنے والی ہوتی چاہے نا۔ وہ ہر بات پر ہنستی تھیں۔

"اب بھلا جنوں کے ذکر میں ہنسنے والی کیا بات تھی۔" اس نے سوچا۔

اسے اپنی گڑیوں کے کپڑوں کی بھی فکر لگی ہوئی تھی۔ کل شام ہی تو اس نے گلابی سلک کے کپڑے پر گولڈن ستارے لگائے تھے اور سوئی کتنی ہی بار اس کی انگلیوں میں چبھ گئی تھی اور خالہ جانی کتنی مہارت سے ستارے ٹانکتی چلی جاتی تھیں۔

"چلو سو جاؤ۔"

♥ ♡ ♡ ♥

"محبوب کے جمال کی کیا تعریف کریں وہ تو آنکھ کی بینائی کی رسائی سے بھی ماورا ہے۔"

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام پر بحث کرتے ہوئے دیدار حسین شاہ نے مدبر حسین پر ایک گہری نظر ڈالی۔

"محدود میں لامحدود کو سمیٹنے اور سمانے کا جنون انسان کا مقدر ہے مدبر حسین ……! اور لامحدود کبھی محدود میں نہیں بیٹھتا۔"

"پر داجی! میں آپ کے پاس لطیف بھٹائی کا کلام سننے نہیں آیا …… مجھے عارفانہ کلام سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تو آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ میری مدد کریں۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا داجی! آپ بڑے ہیں۔ داجی آپ! بڑے بھائی ہیں کیا آپ تاؤ جی کو نہیں سمجھا سکتے۔ ہم کوئی غیر نہیں ہیں۔ ہماری رگوں میں ایک ہی شخص کا خون دوڑ رہا ہے۔ وہ میرے باپ کے بھائی کی بیٹی ہے داجی اور میرے دل میں اگر اس کی چاہ پیدا ہو گئی ہے تو یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ میں نے سیدھے سادے طریقے سے اس سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا ہے پھر آخر تاؤ جی اتنے غصے میں کیوں ہیں؟ میں خاندان میں، مرتبے میں، حیثیت میں، ان سے کم نہیں ہوں۔ سگے تایا زاد بھائی کی اولاد ہوں۔ اچھی شکل و صورت ہے، پڑھا لکھا ہوں، صاحب جائیداد ہوں۔"

"وہ سب ٹھیک ہے پتر! پر اقتدار بھی اپنی جگہ صحیح ہے نا۔ وہ کیسے دوسرے مسلک میں بیٹی کی شادی کر دے۔ تیرے بادا نے بھی تو چنگا نہیں کیا نا، محسنہ نقوی سے شادی کر کے۔ خود بھی سارے کا سارا بیوی کے مسلک میں رنگا گیا۔"

"داجی! اب بس تاؤ جی سے میری سفارش کریں۔ آپ تو اللہ والے ہیں۔ لوگ آپ سے دعا کرواتے ہیں۔"

"او جھلیا! میں کیا اور میری دعا کیا۔ سیدھے سادے لوگ ہیں۔ چل کر آتے ہیں تو ہاتھ اٹھا دیتا ہوں۔"

"آپ اتنے عالم ہیں، اتنے بزرگ ہیں اور مسلک اور فرقوں کی بات کرتے ہیں۔ ہم سب انسان اللہ کی مخلوق ہیں۔ کیا اتنا کافی نہیں ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ یہ فرقے تو ہمارے اپنے بنائے ہوئے ہیں میں کسی فرقے کو نہیں مانتا۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہے پتر! صبر اور شکر کے ساتھ وقت گزار لے۔ محبت میں وصل ضروری نہیں ہوتا پتر۔"

"میں صوفی نہیں ہوں داجی! اور نہ ولی ہوں۔ میں تو ایک عام سا چھوٹی چھوٹی خواہش پالنے والا بندہ ہوں۔ میں نے کوثر کو پسند کیا ہے تو اس کے ساتھ زندگی بھی گزارنا چاہتا ہوں۔ پل پل، لمحہ لمحہ۔ میری محبت وصل کی طلب گار بھی ہے اور میں آرزو کرتا ہوں ہر لمحہ، زندگی کا ہر دکھ سکھ اس کے ساتھ گزاروں۔"

مدبر حسین کے لہجے میں ناراضی تھی۔ دیدار حسین شاہ ہنس دیے اور بڑے سوز سے شاہ لطیف کو پڑھا۔

"ابھی کل ہی ہمارے محبوب مرشد نے ہمیں تنور کی آگ سے باہر نکالا لیکن یہ معلوم ہوتے ہی کہ ابھی ہمارے پختہ ہونے میں کچھ مدت درکار ہے ہمیں پھر آگ کے حوالے کر دیا۔"

"آپ کا مطلب ہے میرا عشق خام ہے، ابھی اس میں پختگی نہیں آئی۔"

اس کا ناراض لہجہ یک دم غصے میں ڈھل گیا اور وہ کھڑا ہو گیا۔

"میں کوثر کے لیے جان سے بھی گزر سکتا ہوں لیکن آپ خود بھی تو نہیں چاہتے ایسا۔ میں ہی پاگل ہوں جو آپ کے پاس چلا آیا دکھڑا لے کر۔ مجھے تو یاد رکھنا چاہیے تھا کہ آپ کا اور تاؤ جی کا مسلک ایک ہی ہے۔"

وہ باہر کی طرف لپکا تو دیدار حسین شاہ بھی اسے پکارتے ہوئے پیچھے لپکے۔

"او پتر۔ او مدبر حسین! او جھلیا بات تو سن۔"

لیکن وہ غصے سے تنتناتا ہوا حویلی کے طویل برآمدوں اور صحن سے ہوتا بڑا گیٹ پار کر گیا اور دیدار حسین شاہ حویلی کے صحن سے ہی واپس پلٹ آئے۔

وہ جانتے تھے جو مدبر حسین چاہتا ہے، وہ ممکن نہیں ہے۔ غلطیوں کو بار بار دہرانا نہیں چاہیے۔ یہ بات بڑے ابا نے کتنی ہی بار کہی تھی اور اب اگر اقتدار حسین یہ غلطی دہرانا نہیں چاہتے تھے جس نے خاندان میں تفریق ڈال دی تھی۔ تو کچھ غلط بھی نہ تھا۔

"کنجن پالی" میں شاہوں کے گھرانے کی بڑی عزت تھی …… تقسیم سے پہلے سے ہی یہ گھرانا قابل احترام سمجھا جاتا تھا۔ ساتھ ساتھ بنی ہوئی تین حویلیاں تینوں سگے بھائیوں کی تھیں۔ بڑی حویلی میں سید دیدار حسین کا خاندان رہتا تھا تو سرخ حویلی جو درمیان میں تھی اقتدار حسین کی تھی اور اس کے ساتھ چھوٹی حویلی سید بیدار حسین شاہ کی تھی۔ سرخ حویلی کا نام شاید اس لیے سرخ پڑ گیا ہو گا کہ اس کا سارا فرنٹ کرمچی چھوٹی اینٹوں سے بنا تھا اور اس کی دائیں بائیں چھوٹی اور بڑی حویلی تھی۔ اوپر سے چھتیں ملی ہوئی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی فصیلیں انہیں الگ کرتی تھیں۔

سید بیدار حسین کی شادی گو سگی پھپھو کے گھر ہوئی تھی، لیکن اس کے سسرال والوں کا مسلک الگ تھا۔ بیدار حسین جب تک زندہ رہے انہوں نے بیوی کے کسی معاملے میں دخل نہ دیا بلکہ وہ ان کے مسلک کا احترام ہی کرتے تھے۔ وہ مجلس سننا چاہتیں بھجوا دیتے' گھر پر مجلس کا اہتمام کرتیں تو منع نہ کرتے۔ ہاں خود وہ حصہ نہیں لیتے تھے۔ اصل مسئلہ تو ان کی وفات کے بعد شروع ہوا تھا۔ ان کے اکلوتے بیٹے اور بہو اپنے معاملات میں بہت اکھڑ تھے۔ ان کی وفات کے بعد سے تو باقاعدہ چھوٹی حویلی میں مجالس ہوتیں' بڑے اہتمام سے علَم نکالا جاتا۔ گھر کی عورتیں اور بچے امام بارگاہ جاتے۔ قاسم کی مہندی بی بی فاطمہ کی صحنک ہوتی۔ کونڈے پکائے جاتے لیکن بڑی اور سرخ حویلی سے کوئی ان میں شامل نہ ہوتا تھا۔ یوں تینوں خاندانوں کا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا تھا' بظاہر ناراضی نہیں تھی لیکن جب چھوٹی حویلی سے علَم نکالا جاتا اور شامِ غریباں منائی جاتی تو اقتدار علی شاہ کے حکم سے سرخ حویلی کے دروازے بند کر دیے جاتے تھے اور سب کو حکم تھا کہ کوئی کسی کھڑکی اور دراز سے بھی نہ جھانکے۔ ایسے میں مدبر حسین کا پرپوزل اقتدار حسین شاہ کیسے قبول کر لیتے۔ سو صاف انکار کر دیا گیا تھا اور مدبر حسین بار بار بیدار حسین شاہ کے پاس آتے۔ جنہیں سب داجی کہتے تھے۔ داجی کے بارے میں عام خیال یہی تھا کہ وہ صوفی ہیں اور اللہ کے مقرب بھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

لیلیٰ واشنگ مشین میں کپڑے ڈالے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ اس نے اکرم سلطانہ کو شولڈر بیگ کندھے پر لٹکائے اپنے کمرے سے نکل کر اپنی طرف آتے دیکھا۔

پہلی بار جب وہ واشنگ مشین کے لیے سکے لینے رتھ کے پاس آئی تھی تو اس نے بہت حیرت سے دیکھا تھا۔

"تم نے واشنگ مشین کے لیے سکے مانگے ہیں؟"

"ہاں میرے پاس میلے کپڑوں کا ڈھیر لگ گیا ہے۔"

"کمال ہے' یہاں تو انڈین پاکستانی اور بنگلہ دیشی اسٹوڈنٹ کبھی سکے نہیں خریدتے۔"

"پھر کیا وہ کپڑے مشین پر نہیں دھوتے؟" اسے حیرت ہوئی تھی۔

"دھوتے ہیں لیکن ان کے پاس بڑے طریقے ہیں مشین استعمال کرنے کے۔"

رتھ ہنسی تھی زور زور سے۔

"لیکن آپ لوگ کچھ نہیں کرتے ہیں؟"

اسے ازحد شرمندگی ہوئی تھی۔

"یہ چند سکے جو دھوکے اور فریب سے بچا لیے جاتے ہیں بھلا کتنا عرصہ ساتھ دیتے ہوں گے۔"

"تین مشینیں یہ تمہارے انڈین بہن بھائی توڑ چکے ہیں۔ ہر حربہ ناکام کر دیتے ہیں۔"

"تم انڈین ہو؟"

"نہیں پاکستانی۔"

اس نے جلدی سے سکے لیے تھے اور آ گئی تھی' یہ اس کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ مشین میں سکے ڈالتی تھی حالانکہ بعد میں جب لینا اور مجدہ وغیرہ سے اس کی دوستی ہو گئی تھی تو اسے بھی انہوں نے مختلف مشوروں سے مستفید کیا تھا۔ بغیر سکہ ڈالے کافی کا کپ حاصل کرنا کہیں رنگ کرنا اور خاص طور پر واشنگ مشین یوز کرنا۔ یہ سارے طریقے اور حربے انڈین پاکستانی اور بنگلہ دیشی اسٹوڈنٹ سے انہیں معلوم ہوئے تھے۔

"کپڑے دھو رہی ہو؟" اکرم سلطانہ نے قریب آ کر پوچھا۔

"ہاں بس دُھل ہی گئے ہیں۔"

اس نے بہت گہری نظر اکرم سلطانہ پر ڈالی کئی سالوں سے وہ ہر چیز گہری نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔ اکرم سلطانہ کی آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے اور چہرے پر بھی سرخی تھی۔ "شاید وہ روتی رہی ہے۔" اس نے سوچا۔

اکرم سلطانہ کو رونا بہت آتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر آنسو ان کی آنکھوں میں اکٹھے ہو جاتے تھے اور جب وہ ہتھیلیوں سے اور ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھتی جاتیں اور روتی جاتیں تو بالکل کسی بچے کی طرح معصوم لگتی تھیں۔ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ انجینئرنگ کی اعلا تعلیم حاصل کرنے آئی ہوئی ہیں۔

"میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی اس لیے میرے بابا جان نے مجھے اتنی تعلیم دلوائی ـــــ مگر شادی کے بعد میں نے سوچا تھا کہ گھرداری کروں گی۔ سچی مجھے کچن میں کھڑے ہو کر کوکنگ کرنا۔ نوکروں کو ڈانٹ ڈپٹ کر گھر کی صفائی کروانا اور بچوں کے چھوٹے چھوٹے کام کرنا بہت پسند تھا۔ لیکن مونی کی ضد تھی کہ میں اتنی ایجوکیٹڈ ہوں' اتنی ذہین ہوں کہ مجھے مزید پڑھنا چاہیے۔ جب اسکالر شپ کا اشتہار آیا اخبار میں تو اپنے ساتھ اس نے میرے کاغذات بھی بھیج دیے اور یوں ـــــ دو چھوٹی چھوٹی معصوم بچیوں کو چھوڑنا کتنا مشکل ہے۔"

اور ان کی آنکھیں چھم چھم برسنے لگتیں۔ شروع شروع میں تو وہ بچیوں کو یاد کر کے بہت روتی تھیں۔

"ڈولی تو ابھی صرف سوا سال کی تھی۔ مما اسے کیسے سنبھالتی ہوں گی اور سونی تین سال کی۔" انہوں نے انہیں بچیوں کی تصویریں دکھائی تھیں۔ دونوں بچیاں بے حد خوبصورت تھیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ لیلیٰ کو ان پر بہت ترس آتا تھا۔ بچیوں سے دوری نے اکرم سلطانہ کی شخصیت

کچھ عجیب سی بناوٹی تھی بیٹھے بیٹھے رونے لگتیں۔ اپنی مما اور پپا سے ناراضی کا اظہار کرتیں اور مونی سے لڑتیں۔

"تم انکار کر دیتیں اکرم۔" لیلیٰ نے ایک روز ان سے کہا۔ "کہہ دیتیں اتنی چھوٹی بچیوں کو چھوڑ کر نہیں آسکتیں تم۔"

"کیسے انکار کرتی لیلیٰ!" جب مونی نے کہا۔ "اکرم! میں تیرے بغیر تو ایک دن بھی نہیں رہ سکتا۔ ہم دونوں زندگی کے آخری کنارے تک ساتھ رہیں گے۔" تو بس میں ہار گئی اور پھر مما نے بھی کہا تھا۔

"اکرم! میں بچیوں کو رکھ لوں گی تو چلی جا ساتھ۔ منیب الرحمان کا کیا پتا' مرد ہے وہاں گوروں کے دیس میں کسی گوری کو دل دے بیٹھا تو۔ اور لیلیٰ! میں آگئی۔ پر میرا دل پڑھنے میں بالکل نہیں لگتا۔ دیکھ لینا اگلے سمسٹر میں ضرور رہ جاؤں گی۔" لیکن وہ ہر سمسٹر بڑے شاندار طریقے سے کلیئر کر لیتی تھی۔ کپڑے اکٹھے کر کے اس نے ایک طرف رکھے۔

"تم کہیں جا رہی ہو اکرم اور مونی بھائی کہاں ہیں۔"

"مونی تو کہیں باہر گیا ہے کسی دوست سے ملنے اور میں...... ذرا چائنا گارڈن تک جا رہی تھی۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے لیلیٰ۔"

"کیا بچیاں یاد آرہی ہیں؟"

اکرم سلطانہ کچھ نہ بولی بس ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کرنے لگی۔

"کم آن اکرم! چلو میرے کمرے میں...... چل کر بیٹھتے ہیں۔ پھر اکٹھے چلیں گے باہر۔ میں بھی پڑھ پڑھ کر تھک چکی ہوں۔" اس نے کپڑے اٹھائے۔

"کیوں آج وہ تمہارا کزن آئی۔ ٹی سے نہیں آئے گا تمہیں ملنے۔"

"پتا نہیں۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"مگر وہ تو ہر اتوار کو آتا ہے تمہیں ملنے۔"

"ہاں لیکن اب تو کتنے ہی ویک اینڈ گزر گئے تھے اور وہ نہیں آیا تھا۔ اس نے تو شمار بھی نہیں کیا تھا۔ کتنے۔ ایک دو یا تین۔

"اگر آگیا تو وہ بھی آجائے گا وہاں ہی۔ میں لنہ کو بتا جاؤں گی کہ ہم چائنا گارڈن جا رہے ہیں۔ یہاں کتنی گھٹن سی ہے اکرم۔ ہیں نا۔"

اس نے کمرے کا دروازہ دھکیلا اور کپڑے ایک طرف رکھے اور اکرم سلطانہ سے پوچھا۔

"تم کافی پیو گی؟"

اکرم سلطانہ نے اثبات میں سر ہلا دیا تو اس نے الیکٹرک کیتلی میں پانی ڈال کر سوئچ آن کیا اور

"تم روئی تھیں۔"

"ہاں۔" اکرم سلطانہ کی آنکھوں میں پھر پانی جمع ہونے لگا۔

"کیوں؟" اس نے سوئچ آف کیا۔

پتا نہیں کیوں پچھلے کئی سالوں سے اسے دوسروں کے زخم کریدنے اور ان پر پھایا رکھنے کی عادت ہو گئی تھی اور خود اس کے اپنے زخم۔ جن سے خون رستا تھا۔ اور کوئی ہاتھ اس پر پھایا رکھنے والے نہیں تھے خود اس کے اپنے ہاتھ بھی...... اس نے اپنے آنسو منجمد کر کے اپنے اندر اتار لیے تھے۔

"وہ مونی...... مونی نے ڈن سیگ میں ایک آفر قبول کر لی ہے اور وہ اپنا سمسٹر ختم ہوتے ہی جوائن کر لے گا اور وہ چاہتا ہے کہ میں بھی اس دوران جاب تلاش کر لوں' وہ واپس نہیں جانا چاہتا لیلیٰ وہ کہتا ہے ابھی تین چار سال ہمیں جاب کرنا چاہیے۔ اتنی پرکشش آفر ہے کہ چند سالوں میں ہمارے پاس اتنا کچھ ہو جائے گا کہ ہماری بچیاں شہزادیوں کی طرح پلیں گی۔ لیلیٰ ...... لیلیٰ! میں اپنی بچیوں سے زیادہ دن دور نہیں رہ سکتی۔ پلیز لیلیٰ تم کہو مونی سے' سمجھاؤ اسے۔"

وہ رونے لگیں۔ ہمیشہ کی طرح روتی جاتیں اور ہاتھوں کی پشت سے اور انگلیوں کی پوروں سے آنسو پونچھتی جاتیں۔

"او کے۔ او کے اکرم سلطانہ میں سمجھاؤں گی مونی بھائی کو۔ سمجھ لیں گے وہ میری بات۔"

"لو کافی پیو!" اس نے کافی تیار کر کے کپ اس کے سامنے رکھا اور پھر اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے۔ "رونا کسی مسئلے کا حل نہیں ہے اکرم سلطانہ۔"

"مجھے پتا ہے' وہ نہیں مانے گا۔ وہ کبھی بھی نہیں مانے گا۔ لیلیٰ...... وہ کہتا ہے ہماری بچیاں ہیں اور کل کو ہمیں ان کی شادیاں بھی کرنا ہیں اور ہمارے پاس اتنا پیسہ ضرور ہونا چاہیے کہ ہم ان کے لیے اچھے گھر' تعلیم یافتہ اور اچھے دولہا خرید سکیں اور وہاں ہمیں جاب تو شاید مل جائے گی لیکن اتنی سیلری نہیں ہو گی۔"

اور لیلیٰ نے حیرت سے اکرم سلطانہ کو دیکھا۔

"دولہا۔ خریدیں گے آپ؟"

"ہائے لیلیٰ...... تم کتنی خوش قسمت ہو؟" اکرم سلطانہ کے لہجے میں حسرت تھی۔

"تم پاکستان میں رہتی ہو نا اور ہم ہندوستانی مسلمانوں کو اول تو مسلمان لڑکوں کا رشتہ ہی مشکل سے ملتا ہے اور جو مل جائے تو جتنا اچھا لڑکا اتنی ہی سلامی...... اب تو کلرک لڑکے کی بھی کم از کم سلامی پچاس ہزار ہے۔"

"کیا تمہارے ماں باپ نے بھی تمہارے لیے منیب بھائی کو سلامی دی تھی۔"

"ہاں تین لاکھ روپے لیکن مونی اور خالہ نے ڈیمانڈ نہیں کی تھی کہ مونی میری خالہ کا بیٹا تھا نا! وہ تو پپا نے اپنی عزت کے لیے دی تھی نا۔ پھر سوسائٹی میں عزت بھی تو نہیں نا ہوتی۔ اسی طرح مونی نے ایک لاکھ حق مہر دیا تھا۔ اگر وہ کم دیتا تو پپا کی بے عزتی ہوتی نا۔۔۔ پر لیلیٰ میں اور مونی تو اکلوتے ہیں نا۔ ہمارا تو کوئی رشتہ دار بھی نہیں۔۔۔ ہمیں تو اچھے لڑکوں کے لیے۔"

وہ پھر رونے لگی۔

"اُفوہ! اکرم کون کہے گا کہ تم اتنی پڑھی لکھی ہو۔ اتنی انٹلیکچول۔"

"کیا پڑھی لکھی لڑکیوں کے سینے میں دل نہیں ہوتا لیلیٰ۔" اور لیلیٰ کو لگا جیسے اس کے سینے میں موجود دل نے ایک دم دہائی دی ہو۔

تب ہی بیڈ روم سے لنہ آنکھیں ملتی ہوئی باہر نکلی۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ اس لیے وہ ابھی تک سو رہی تھی۔ پتا نہیں اب ان کی باتوں سے اس کی آنکھ کھلی تھی یا کافی کی خوشبو نے اسے جگایا تھا۔ "ہیلو اکرم سلطانہ!" وہ ہمیشہ اکرم سلطانہ کو اکرم ہی کہتی تھی۔

اکرم سلطانہ نے سر کے اشارے سے اس کے ہیلو کا جواب دیا اور کافی کی چسکیاں لینے لگی۔

"کافی!"

لیلیٰ نے کافی کا کپ لنہ کے سامنے رکھا اور خود اپنے لیے ریک سے ایک اور کپ اٹھایا۔

"تھینک یو لیلیٰ اس وقت کافی کی بہت خواہش ہو رہی تھی مجھے۔"

لنہ نے کپ تھام لیا۔

"تم کہیں جا رہی تھیں؟"

"ہم لوگ چائنا گارڈن جا رہے ہیں۔ یوں ہی گھومنے۔ یہاں کتنی گھٹن ہے۔ ہے نا۔ تم چلو گی۔"

لیلیٰ نے اپنے لیے کافی بناتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں چلوں گی۔ لیکن وہ تمہارا افیانسی۔۔۔ کیا اسے آج نہیں آنا۔"

"شاید نہیں۔"

"اپنی پریشانی میں شاید لنہ کو یاد ہی نہیں رہا کہ وہ تو پچھلے سنڈے کو اور پھر اس سے پچھلے سنڈے کو بھی نہیں آیا تھا۔" لیلیٰ نے سوچا۔

اور لنہ پر یکدم کتنی پریشانی آئی تھی وہ صحیح طرح سے پڑھ بھی نہیں پا رہی تھی۔

وہ عبدالحیٔ سے پیار کرتی تھی شاید تب سے جب سے وہ ڈیلف آئی تھی اور انکل قیس کے گھر عبدالحیٔ سے ملی تھی۔ عبدالحیٔ جو اس کی سگی خالہ کا بیٹا تھا اور اپنے خاندان کا واحد بچ جانے والا

فرد۔ اور عبدالحیٔ بھی اپنی اس عم زاد کو دل دے بیٹھا تھا۔ جب ہی تو بھاگ کر آئی۔ ایچ۔ ای آتا تھا۔ اور اب عبدالحیٔ۔

"کیا عبدالحیٔ اس سے بےوفائی کر رہا ہے؟"

ایک بار لیلیٰ نے سوچا تھا اور لنہ عبداللطیف نے بڑی سختی سے اس کی تردید کی تھی لیکن وہ جب سے روٹرڈیم سے آئی تھی راتوں کو تکیے میں منہ چھپا چھپا کر روتی تھی۔

"پھر کون سی چیز اسے رلاتی ہے۔" لیلیٰ نے سوچا تھا۔ "مہینے بعد دو مہینے بعد سال بعد کبھی تو وہ ایک ہوں گے نا۔"

"اور تم کیوں روتی ہو۔ لیلیٰ محب اللہ شاہ تم بھی تو۔۔۔"

"ہاں میں کیوں روتی ہوں جبکہ۔۔۔ پر میرے آنسو تو میرے اندر گرتے ہیں قطرہ قطرہ کر کے اور لنہ عبداللطیف کے آنسو مجھے ڈسٹرب کرتے ہیں۔"

"چلو نا تم دونوں چینج کر لو۔" اکرم سلطانہ نے کپ خالی کر کے ٹیبل پر رکھا۔ رو دھو کر اب وہ کچھ ریلیکس ہو گئی تھیں۔

"لیلیٰ! کیا میں تمہارا موبائل استعمال کر سکتی ہوں بس ایک منٹ صرف بچیوں کی خیریت معلوم کروں گی۔"

"ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔"

وہ موبائل اکرم سلطانہ کو پکڑا کر خود کپڑے اٹھا کر واش روم میں گھس گئی اور لنہ کافی پیتے ہوئے اکرم سلطانہ کو نمبر ملاتے دیکھنے لگی۔

♥ ♡ ♡ ♥

پوری دوپہر اس نے کروٹیں بدلتے گزار دی تھی کئی بار چپکے چپکے بڑی اماں اور اماں کی چارپائی پر نظر ڈالی تھی گو وہ گہری نیند سو رہی تھیں لیکن اس کی ہمت نہ ہوئی کہ اٹھ کر باہر جائے اور کیا خبر برآمدہ اور صحن خالی دیکھ کر چڑیلیں اور جن چہل قدمی کے لیے نیچے چلے آئے ہوں۔ اور اب۔۔۔ صحن میں اور برآمدے میں گھوم رہے ہوں۔ اور کیا خبر ساری پکی پکی جامنیں توڑ کر کھا جائیں۔ پکی پکی جامنوں کے خیال سے اس کے منہ میں پانی بھر آیا وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور بلی کی سی پھرتی سے وہ پلنگ سے اتری۔۔۔ بڑی اماں خراٹے نشر کر رہی تھیں اور اماں دیوار کی طرف منہ کیے سو رہی تھیں۔ حسب معمول وہ ننگے پاؤں باہر آئی اور کچھ دیر سانس روکے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی رہی۔ ہر طرف سناٹا تھا بس کوثر آپا کے کمرے سے ریڈیو کی آواز آ رہی تھی۔

اور کیا خبر فوظی خالہ میرا گڑیوں والا "بکسا" طاق سے اٹھا کر لے آئی ہوں۔

شام فوظی خالہ کے کہنے پر بھی وہ اوپر چھت پر نہیں گئی تھی حالانکہ کل شام سے پہلے اسے

چھت پر گھومنا اچھا لگتا تھا اور کبھی کبھی اپنے گھر کی فصیل سے چھوٹی اور بڑی حویلی کے چھت پر کود کر پوری چھت کا چکر لگانا بہت خوش کرتا تھا۔ اس نے کوثر آپا اور فوقی خالہ کے مشترکہ کمرے کی طرف قدم بڑھاتے بڑھاتے صحن میں جامن کے پیڑ کی طرف دیکھا تھا۔ پکی پکی جامنیں اسی طرح موجود تھیں۔ اور وہ صحن کی طرف بڑھی تھی پھر اچانک ہی اس کی نظر سیڑھیوں کی طرف اٹھی تھی محفوظ فاطمہ فیروزی دوپٹے کے پلو میں کچھ ڈالے سج سج نیچے اتر رہی تھیں۔ ان کے گلابی لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی اور ہاتھوں اور بانہوں میں گجرے تھے موتیے کے گجرے۔ رخسار گلاب رنگ کے ہو رہے تھے اور دلکش آنکھوں میں جیسے موتی دمک رہے تھے۔

"خالہ جانی!" اس نے ان کا پلو پکڑ کر کھینچا تھا اور موتیے کے ڈھیر سارے پھول آخری سیڑھی پر اس کے قدموں میں گر گئے تھے۔

"خالہ جانی! میرا بکسا۔"

اور اس کی بات کا جواب دیے بغیر بے اختیار وہ نیچے بیٹھ کر پھول چننے لگی تھیں۔

اور اس نے سوچا تھا موتیے کے جھاڑ تو چھوٹی حویلی میں ہیں جو برآمدے کے ستونوں سے لپٹ کر اوپر چھت تک آ گئے ہیں۔

تو کیا خالہ جانی اس کی طرح منڈیر پر سے کود کر چھوٹی حویلی میں گئی تھیں۔ ان کے صحن میں تو دیواروں سے چنبیلی لپٹی ہوئی تھی۔ گلاب کی کیاریاں تھیں۔ گل داؤدی تھے۔ نرگس تھے لیکن پتا نہیں موتیا کیوں نہیں تھا۔۔۔ اور اسے موتیا پسند تھا بہت اور اس نے کتنی بار موجو بابا سے کہا بھی تھا کہ وہ موتیے کے پودے ضرور لگائے۔ موتیے کے جھاڑ۔۔۔ جو ستونوں سے لپٹ کر اوپر چھت تک چلے جائیں جیسے بوگن ویلیا کی بیلیں اتنی پھیل گئی تھیں کہ ستون چھپ گئے تھے۔

اور محب اللہ شاہ نے بھی ایک بار کہا تھا۔

"موجو! منی کو موتیا پسند ہے لگا دو۔"

"جگہ نہیں ہے صاحب! گملے میں پودا لگا دوں گا۔"

مگر پھر اس نے لگایا ہی نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں حالانکہ رات کی رانی کے لیے تو اس نے جگہ بنالی تھی۔

محفوظ فاطمہ نے ایک ایک پھول چن کر اپنے پلو میں ڈال لیا تھا۔

فیروزی سوٹ میں ان کا سرخ و سفید رنگ دمک رہا تھا۔

"خالہ جانی! میرا بکسا۔"

اس نے پھر انہیں اپنی طرف متوجہ کیا تھا جو جانے کس خیال میں آپ ہی آپ مسکرائے چلی

جاتی تھیں۔

"ہاں کل۔ کل لے آؤں گی۔ آج میں گئی تھی لینے ابھی تو ڈر کر سیڑھیوں سے ہی واپس آ گئی اوپر برساتی میں بہت شور تھا۔"

"اچھا!"

اور وہ مایوس سی ہو کر جامنوں کا خیال بھی چھوڑ کر اپنے "گڑیوں" کے بکسے کے غم میں افسردہ ہو کر کوثر آپا کے پاس چلی آئی تھی۔

کوثر آپا کے کمرے میں اب بھی ریڈیو بج رہا تھا اور وہ اپنے بیڈ پر آلتی پالتی مارے سامنے کتابوں اور کاپیوں کا ڈھیر پھیلائے پڑھ رہی تھیں۔ انہیں ریڈیو پر گانے سننا بہت پسند تھا اور پڑھتے ہوئے بھی فرمائشی پروگرام لگا رہتا تھا انہوں نے بس ایک نظر اسے دیکھا تھا اور پھر تیزی سے کچھ لکھنے لگی تھی اور وہ اپنی گڑیوں کے "بکسے" کے غم میں چپ چاپ خالہ جانی کے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی اور اس بکسے میں کتنے پیارے پیارے کپڑے تھے اور وہ گڑیا جو موجو کی بیوی نے بنائی تھی اپنے نیچے کے پرانے شٹل کاک برقعے کو پھاڑ کر اور اپنے پراندے سے اس کے بال بنائے تھے۔ پف بنا کر جیسے اس کی بہو بناتی تھی کالے دھاگے سے اس کی آنکھیں بنائی تھیں اور سرخ دھاگے سے ہونٹ اور پھر اس کے گلے میں موتیوں کا ہار بھی تو ڈالا تھا اور ماتھے پر ٹیکا بھی لٹکایا تھا۔ اور اسے یہ گڑیا بہت پسند تھی حالانکہ بابا جانی نے اسے کتنی ہی خوبصورت گڑیاں لا کر دی ہوئی تھیں۔

گلابی سلولائیڈ کی گڑیاں۔

بولنے والی۔ ڈانس کرنے والی ہنسنے والی ہر طرح کی گڑیاں تھیں اس کے پاس پر موجو بابا کی بیوی کی بنائی ہوئی گڑیا کو روز ایک نیا جوڑا پہنانا اور اس کے ساتھ کھیلنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔

"آپا! یہ جن بھی گڑیوں سے کھیلتے ہیں؟" اپنے غم میں ڈوبے ڈوبے اس نے پوچھا۔

"نہیں، وہ تو پریوں سے کھیلتے ہیں۔" کوثر اندر آتی محفوظ فاطمہ کو دیکھ کر مسکرائی۔

"خوبصورت لمبے بالوں والی اور قاتل آنکھوں والی پریوں سے جیسے۔ جیسے ہماری خالہ جانی۔"

"کوثر!" محفوظ فاطمہ نے اسے گھورا۔ "تم بہت شریر ہو گئی ہو۔"

اور دوپٹے میں ڈالے ہوئے موتیے کے پھول اپنے بیڈ پر تکیے کے پاس رکھے اور ہاتھوں سے گجرے بھی اتار کر وہیں رکھ دیے اور بیڈ پر اداس بیٹھی منی کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

"وعدہ رہا کل تمہارا "بکسا" برساتی سے ضرور لے آؤں گی۔"

اور وہ کل کے وعدے پر خوش ہو کر باہر بھاگ گئی تھی تاکہ موجو بابا سے کہہ کر پکی پکی جامنیں اتروا سکے۔

موجو کی بیوی نے اس کی گڑیا کے لیے چھینٹ کا پھولدار لہنگا اور چولی سی تھی۔ اس نے وہ لہنگا اور چولی وہیں رہنے دی اور سوچا تھا کہ کل جب خالہ جانی گڑیوں والا بکسا لے آئیں گی تو وہ اپنی گڑیا کو یہ لہنگا پہنائے گی۔

لیکن وہ کل تو پھر کبھی نہیں آئی جب خالہ جانی چھت پر جاکر برساتی کے طاقچے سے اس کی گڑیا والا بکسا لے آتیں۔ صبح ہوتے ہی حویلی میں کہرام مچ گیا تھا۔

محفوظ فاطمہ صحن کے کنوئیں میں گر گئی تھیں۔

رات کیوں وہ باہر نکلی تھیں۔ شاید پانی پینے لیکن گھڑونچی تو برآمدے میں تھی اور فریج کچن میں۔ پھر وہ صحن میں کیا کرنے گئی تھیں اور کنوئیں کی منڈیر اتنی نیچی بھی نہ تھی۔

"محفوظ فاطمہ کو نیند میں چلنے کی بیماری تھی۔"

بڑے ماموں نے سب کو بتا کر مطمئن کر دیا۔

لیکن کوثر آپا وہ تو بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہر ایک کو دیکھتی تھیں۔ اور بڑے ماموں کو تو دیکھتے ہی منہ پھیر لیتی تھیں۔

"خالہ جانی بھی تو پریوں جیسی خوبصورت تھیں کوثر آپا۔۔۔ کیا خبر جن انہیں اڑا کر لے جا رہے ہوں اور وہ کنوئیں میں گر گئی ہوں۔"

ایک روز اس نے خیال ظاہر کیا تھا جب سے خالہ دنیا سے رخصت ہوئی تھیں وہ کوثر آپا کے کمرے میں ان سے لپٹ کر سونے لگی تھی۔

"ہاں شاید۔۔۔" کوثر آپا کی آنکھیں ضبط گریہ سے سرخ ہونے لگی تھیں اور اسی رات داجی نے کوثر آپا سے کہا تھا۔

"محفوظ فاطمہ کو سوتے میں چلنے کی عادت تھی تو تم دروازے کو کنڈی لگا کر کیوں نہیں سوتی تھیں۔"

انہیں بھی محفوظ فاطمہ کی موت کا بہت دکھ تھا۔ اپنی اس بھتیجی کو بہو بنانے کی خواہش بہت عرصہ سے ان کے دل میں تھی لیکن ان کے چھوٹے بیٹے نے جو پڑھنے کی غرض سے امریکہ گیا تھا وہیں ہی کسی انڈین فیملی کی مسلم لڑکی سے بیاہ رچا لیا تھا اور وہیں کا ہو گیا تھا۔۔۔ اور اب بڑی حویلی میں صرف ان کی بڑی بہو اور بڑا بیٹا اور ان کے بچے رہتے تھے۔

"شاید اس کی موت اسی طرح لکھی تھی۔ بچی! تم حوصلہ کرو۔"

"وہ سوتے میں نہیں چلتی تھیں۔" کوثر کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ "بڑے ماموں آدھی رات کو انہیں جگا کر باہر لے گئے تھے اور میں نے انہیں خالہ جانی کے ساتھ صحن کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ وہ تو بار بار پوچھ رہی تھیں کہ اس وقت کیا کام ہے لیکن بڑے ماموں نے بتایا ہی

نہیں۔"

وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھیں' خالہ جانی کی وفات کے اتنے دن بعد۔۔۔ اور داجی نے بہت تاسف سے بڑے ماموں حمزہ شاہ کی طرف دیکھا تھا۔

"تو کیا کرتا داجی! اور کیا کرتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے اعظم سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔"

"اور تم نے یہ حل ڈھونڈا اس کا۔"

وہ ایک نفرت بھری نظر ان پر ڈالتے ہوئے چلے گئے تھے۔ لیکن کوثر تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی یوں جیسے خالہ جانی کی موت آج ہوئی ہو۔

وہ اور کوثر تو سہیلیاں تھیں۔ ایک دوسرے کی رازدار اور بھیدی۔

اس صبح حویلی سے ملحق قبرستان میں محفوظ فاطمہ کی قبر پر وہ کوثر آپا کے ساتھ گئی تو قبر پہلے ہی سفید موتیے کے پھولوں سے بھری ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے "کنجن پالی" کے سارے موتیے کے پھول اس قبر پر ڈال دیے ہوں۔

اور واپسی پر اس نے اعظم کو دیکھا تھا۔۔۔ اٹیچی کیس اٹھائے سر جھکائے اسٹیشن کی طرف جاتا ہوا۔

دبلا پتلا لمبا گندمی رنگ کا اعظم جو چھوٹی حویلی کا مہمان تھا۔ محسنہ نقوی کا دور پار کا عزیز جو مراد آباد ہندوستان سے پاکستان کی سیر کے لیے آیا تھا اور سب جگہیں گھوم پھر کر اب "کنجن پالی" میں اپنی ماں کی خالہ زاد بہن محسنہ نقوی کے گھر میں مقیم تھا۔ آیا تو وہ صرف دو دن کے لیے تھا لیکن آتے ہی کسی کے معصوم حسن نے اسیر کر لیا تھا اسے۔

"اعظم بھائی۔"

کوثر اس کا ہاتھ چھوڑ کر دوڑتی ہوئی اعظم کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔

"کوثر!" اعظم کی آواز جھرجھرا رہی تھی۔ "کوثر! وہ کیوں چھوڑ کر چلی گئی۔ کیوں۔۔۔؟ ابھی کل شام ہی تو میں نے اسے بتایا تھا کہ میری مراد آباد اماں سے بات ہو گئی ہے اور وہ کچھ دنوں تک آئیں گی تو محسنہ خالہ کے ساتھ سرخ حویلی بھی آئیں گی۔ وہ۔ وہ تو بہت خوش تھی۔ وہ کیسے گر گئی کوثر۔ کیسے۔؟"

اور کوثر ایک دم ہی دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی تھی۔ اعظم کچھ دیر کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں بال بکھرے ہوئے اور کپڑے ملگجے تھے۔ پھر وہ سر جھکائے ہولے ہولے چل پڑا تھا اور کوثر اس وقت تک وہیں ہی کھڑی اسے جاتے دیکھتی رہی تھی جب تک وہ نظر آتا رہا۔

محفوظ فاطمہ مر گئی تھیں۔ بڑی اماں کو چپ لگ گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ بہت اونچی آواز میں رونے لگتیں۔

اور کوثر جو ہر وقت ہنستی رہتی تھیں جنہیں ہر بات پر ہنسی آتی تھی۔ نہ ہنسنے والی بات پر بھی۔۔۔ اور اب تو وہ ہنسنے والی بات پر بھی نہیں ہنستی تھیں اور جو محفوظ فاطمہ کی طرح ہی خوبصورت تھیں بالکل پریوں ایسی۔۔۔ اور منی کے دل میں خوف سا بیٹھ گیا تھا کہ کہیں جن کسی روز انہیں بھی اڑا کر ساتھ نہ لے جائیں۔ وہ اب بڑی اماں کے پاس سونے کے بجائے کوثر آپا کے پاس سونے لگی تھی اور رات کو ان سے لپٹ کر سوجاتی اپنے ننھے ننھے بازو بہت مضبوطی سے ان کے گرد حمائل کیے۔

"منی! گرمی ہے۔ پیچھے ہٹ کر سوؤنا۔"

مگر اسے تو مدتوں خوف رہا کہ کہیں سوتے میں جن کوثر آپا کو بھی اڑا کر نہ لے جائیں اور وہ اس روز کے بعد کبھی چھت پر نہ گئی اور اس کا گڑیوں والا بکسا وہاں اوپر "طاقچے" میں ہی پڑا رہ گیا تھا۔ اور موتیے کے پھول جو اس رات محفوظ فاطمہ کے ہاتھوں میں گجرے بن کر مہکے تھے کوثر فاطمہ نے اٹھا کر اپنی الماری میں ڈال دیے تھے اور کبھی کبھی راتوں کو اٹھ کر وہ الماری کھول کر ان پھولوں کو دیکھتیں جو سوکھ کر پتی پتی ہو گئے تھے اور الماری کے طاق پر سر رکھ کر سسک سسک کر روتیں۔ اور منی دونوں ہتھیلیوں میں ٹھوڑی رکھے چپ چاپ انہیں دیکھتی رہتی۔۔۔ اور اس کے اندر دل پر کہیں کوئی آنسو گر کر منجمد ہو جاتے۔

کوثر آپا کے آنسو۔۔۔

♥ ♡ ♡ ♥

"آپ نے تاؤجی سے بات کی داجی؟"

مدبر حسین آج پھر ان کے سامنے بیٹھے تھے۔

وہ صرف اپنے پوتوں پوتیوں کے ہی نہیں دوسرے بھائیوں کی اولاد کے بھی 'داجی' تھے' اسی طرح سید اقتدار حسین شاہ کو بھی سب تاؤجی ہی کہتے تھے ان کے اپنے نواسے نواسیاں اور پوتے پوتیاں بھی۔

"ہاں کی تھی پتر۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑی شاہ لطیف کے کلام پر لکھی گئی کتاب الٹی کر کے اپنے سامنے رکھ دی۔

"پھر؟" مدبر حسین نے مضطرب سا ہو کر انہیں دیکھا۔

"پھر کیا پتر! سن شاہ عبداللطیف کیا کہتا ہے۔" اے میرے محبوب تیرے دیدار کا ہیجان لیے جیسے ہی میں دریا کے حوالے ہوتی ہوں تو دریا کی طغیانی میری الفت کو اور بھی وسعت دیتی ہے۔

میرے وجود کے خارج اور داخل تیرے ہی تصور سے منور ہیں۔"

"داجی۔۔۔ داجی پلیز! میں یہاں شاہ لطیف کو سننے نہیں آتا۔ مجھے بتائیں تاؤجی نے کیا فیصلہ کیا ہے۔"

"فیصلہ تو تجھے پتا ہے پتر!" انہوں نے بڑے دکھ سے مدبر حسین کو دیکھا "فیصلہ تو ایک ہی بار کیا جاتا ہے نا پتر مدبر حسین! اور جو بدل جائے وہ فیصلہ نہیں ہوتا۔"

"اور محب انکل؟" اس کی آواز ٹوٹ سی گئی۔ "انہوں نے کچھ نہیں کہا۔۔۔؟ وہ نہیں بولے کچھ۔ آخر فیصلہ کرنے کا اختیار تو انہیں ہے نا نہ کہ تاؤجی کو۔ سرخ حویلی کا ہر فیصلہ تاؤجی ہی کرتے ہیں کیوں؟"

"محب اللہ کو اقتدار کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہے پتر مدبر حسین!"

داجی نے پھر کتاب اٹھالی اور مدبر حسین نے ان کے ہاتھ سے کتاب لے کر بند کر دی۔

"داجی! میں مر جاؤں گا۔" وہ سسکا۔ "میں نے بہت بچپن میں سوچ لیا تھا کہ میں کوثر سے ہی شادی کروں گا۔"

"ہر سوچ حقیقت میں نہیں ڈھلتی پتر۔"

"میں۔۔۔ میں خود بات کرتا ہوں تاؤجی سے جا کر۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا تو سید دیدار حسین شاہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا لیا۔

"بیٹھ جا۔۔۔"

"نہیں داجی! مجھے جانے دیں۔ میں تاؤجی سے کہوں گا۔ یہ صرف میری زندگی کا سوال نہیں ہے۔ کوثر بھی میرے بغیر۔۔۔"

"چپ!" داجی نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ "آئندہ یہ بات منہ سے مت نکالنا مدبر حسین۔"

"مگر۔۔۔"

"تجھے محفوظ فاطمہ یاد ہے؟"

"ہاں یاد ہیں۔۔۔؟"

مدبر حسین نے ان کی طرف دیکھا۔ کوئی اتنی زیادہ پرانی بات تو نہیں صرف چھ سال پہلے ہی تو محفوظ فاطمہ کنوئیں میں گر گئی تھیں۔

محفوظ فاطمہ گو رشتے میں اس کی پھپھو لگتی تھیں۔ باپ کی چچا زاد بہن لیکن ان میں اچھا خاصا دوستی کا رشتہ استوار تھا۔ وہ ان سے یہی کوئی تین چار سال ہی تو بڑی تھیں' اور جب کبھی وہ چھوٹی حویلی آتی تھیں تو خوب محفل جمتی تھی۔۔۔ بیت بازی کی اور کیرم کی بازیاں ہوتی تھیں۔

چھوٹی حویلی بڑی حویلی اور سرخ حویلی کے مکین ایک دوسرے کے گھروں میں سارا سال جاتے رہتے تھے سوائے ایک مہینے کے۔

انہیں محفوظ فاطمہ کی موت کا بہت دکھ ہوا تھا۔

وہ کتنی زندہ دل تھیں۔

انہیں یاد آیا جن دنوں مراد آباد سے اعظم بھائی آئے ہوئے تھے تو وہ چھوٹی حویلی میں بہت آتی تھیں اور اعظم بھائی چپکے چپکے انہیں تکا کرتے تھے اور کئی بار انہوں نے ان کی یہ چوری پکڑی تھی اور اعظم بھائی کو جتایا بھی تھا۔

"ہم تو اللہ کی کاریگری دیکھتے ہیں۔" وہ معصومیت سے کہتے تھے۔

"تاؤجی کو چاہیے تھا کہ انہیں کسی اچھے اسپیشلسٹ کو دکھاتے۔ نیند میں چلنے کی عادت بھی تو ایک بیماری ہوتی ہے نا داجی۔"

"اسے نیند میں چلنے کی عادت نہیں تھی مدبر حسین!" داجی نے بہت آہستگی سے کہا تھا۔ اور ان کا منہ حیرت سے کھلا تھا لفظ ہونٹوں پر آنے سے پہلے ہی گم ہو گئے تھے اور انہوں نے یکدم سختی سے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ ایک تلخ حقیقت کا ادراک ہوا تھا۔

"اور کیا حویلیوں میں کنوئیں اس لیے بنائے جاتے ہیں؟ "اس کا جی چاہا تھا وہ داجی سے پوچھے۔

لیکن اس نے لب سی لیے اور داجی سے کچھ نہیں کہا بس سر جھکائے اضطراب سے انگلیاں چٹخاتا رہا۔

داجی نے پھر کتاب اٹھالی۔۔۔ اس کتاب میں مصنف نے شاہ لطیف کی شاعری پر بہت خوبصورت تبصرہ کیا تھا۔

"یہ جو تو بے حضور و بے سرور سجدے کر رہا ہے چونکہ تیری جذباتی صداقت سے ان کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اس لیے ان سجدوں اور وظیفوں سے تیرا کوئی بھلا نہیں ہونے والا۔"

"واہ۔۔۔ کیا بات کہتا ہے شاہ لطیف بھی۔" سید اقتدار حسین شاہ نے سر دھنتے ہوئے کہا۔

"سن مدبر حسین! سن۔"

"تو اگر کل قربان ہو جاتی تو کل ہی اپنے محبوب کو پا لیتی۔ بغیر قربانی' درد اور اذیت کے کوئی بھی اپنی منزل کو نہیں پہنچا۔ ادھر سے ادھر جانے میں بس ایک لمحہ کی دیر ہے دیار محبوب صرف ایک قدم کے فاصلے پر ہے۔"

"داجی!" مدبر حسین نے یک دم سر اٹھا کر انہیں دیکھا جو آنکھیں بند کیے جھوم رہے تھے۔

"میں اگر اپنا مسلک چھوڑ دوں۔۔۔ یہ قربانی دے دوں تو۔۔۔ کیا تاؤجی مجھے قبول کر لیں

گے؟"

"عقیدہ۔۔۔ مسلک۔" داجی نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ لمحہ بھر دیکھتے رہے۔

"عقیدہ محبت سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے پتر! وہ تو آدمی کی گھٹی میں پڑا ہوتا ہے۔ پالنے میں ہی رگ رگ میں گھل جاتا ہے۔ وجود میں رچ جاتا ہے۔ اسے الگ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جب بڑے شاہ جی نے بیدار حسین کی شادی پھپھو صدیقہ کے گھر ٹھہرائی تھی تو انہوں نے بھی یہی سوچا تھا کہ بیدار حسین بیوی کو اپنے رنگ میں رنگ لے گا۔ لیکن بھلا عقیدہ بھی کبھی آدمی سے جدا ہوا ہے۔ جو لہو میں شامل ہوتا ہے۔ بیدار حسین اسے اپنے رنگ میں نہ ڈھال سکا۔۔۔ اور اولاد بھی بیوی کے رنگ میں ہی رنگی گئی۔"

"پر داجی! میں تو اپنے دادا کا مسلک ہی اپناؤں گا۔ آخر میرے لہو میں کچھ تو میرے دادا کا رنگ بھی شامل ہو گا نا۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

سید اقتدار حسین نے کچھ بھی نہ کہا بس خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ محبت کے حسن نے اور جدائی کے حزن نے اس کی شخصیت میں عجب دلکشی بھر دی تھی۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور انہوں نے نظریں جھکا لیں اور گنگنانے لگے۔

سولی پر چڑھ جانے کا بلاوا آیا ہے
کوئی ہے جو یہ دعوت قبول کرے
وہ جانے کی تیاری کر رہے ہیں
جن کا محبوب کے عشق سے تعارف ہو چکا

اور ہمیشہ کی سی تیزی سے مدبر حسین بڑی حویلی کے برآمدے اور صحن پار کرتا گیٹ سے نکل گیا۔

♥ ♡ ♡ ♥

کیتھی' لیلیٰ' مجدہ' ریتا اور اکرم سلطانہ واک کے لیے ہاسٹل سے نکلیں تو انہوں نے چرچ کی طرف جاتی دلہن کو دیکھا۔ ادھیڑ عمر دلہن جس کے عروسی جوڑے کو چودہ' بارہ اور دس دس سال کی عمروں کے بچوں نے تھاما ہوا تھا۔

"یہ جوڈی الزبتھ ہے۔" کیتھی نے بتایا۔ "اور یہ چاروں جنہوں نے اس کے عروسی جوڑے کے کونوں کو تھام رکھا ہے اس کے بچے ہیں۔ جان اور جوڈی تقریباً اٹھارہ سال سے اکٹھے رہ رہے ہیں اور اب انہوں نے شادی کا فیصلہ کیا ہے۔"

"چار بچوں کے بعد؟" لیلیٰ کو ازحد حیرت ہوئی تھی۔

پتا نہیں کیوں' اب بھی اتنا عرصہ یہاں رہنے کے بعد بھی وہ ہر بات پر نئے سرے سے حیران

ہوتی تھی۔

"ہاں اب۔۔۔ تمہیں پتا تو ہے یہاں شادیوں کا اتنا رواج نہیں ہے۔۔۔ نوجوان جوڑے یوں ہی زندگی گزار لیتے ہیں۔ مگر اپنا گھر' اپنا شوہر' اپنا آشیانہ' اپنے بچے یہ سب کس قدر فینسی نیٹ کرتے ہیں مجھے۔ تمہارا مشرق کتنا خوبصورت ہے لیلیٰ۔۔۔ اس میں کتنا افسانوی سا حسن ہے۔"

کیتھی کے لہجے میں حسرت تھی۔

"لیکن تمہارے ہاں عورتیں ایک ہی مرد کے ساتھ رہتے رہتے اوب نہیں جاتیں؟"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔" ریتا نے فوراً" کہا۔ "ایک مرد کے ساتھ زندگی بتانا' صرف اس کے بچوں کی ماں بننا۔ یہی تو زندگی کا حسن اور خوبصورتی ہے کیتھی! احساسِ ملکیت کا نشہ تو لوٹس کے نشے سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔"

"یہ مرد۔۔۔ صرف اور صرف میرا ہے۔"

"کاش میں مشرق میں پیدا ہوتی۔ میرا ایک چھوٹا سا گھر ہوتا۔ میرے بچے ہوتے۔۔۔ وہ بڑے ہوتے ان کی شادیاں ہوتیں۔ پھر میں نانی اور دادی بنتی اور اپنے گرینڈ چلڈرن کو اپنے پاس بٹھا کر کہانیاں سناتی۔"

کیتھی جیسے خواب دیکھ رہی تھی۔

"تم ہندو مذہب کیوں نہیں اختیار کر لیتیں کیتھی؟" ریتا نے فوراً" کہا۔

"اگر تم ہندو ہو جاؤ تو پرامس میں تمہاری شادی اپنی موسی کے بیٹے سے کروا دوں گی۔ وہ بہت اچھا ہے۔"

"ہشت۔" مجدہ نے فوراً" ٹوکا۔ "ایسے مذہب نہیں تبدیل ہوتے۔"

اور لیلیٰ نے بھی سوچا تو تھا کہ اگر کیتھی مسلمان ہو جائے تو۔۔۔"

لیکن اس میں ریتا جیسی جرأت نہیں تھی۔ لیکن کیتھی کو کیا پتا کہ اب تو مغرب مشرق کے آنگن میں آ پہنچا ہے۔

پتا نہیں کیتھی نے جواب میں کیا کہا تھا' اس نے سنا نہیں تھا اس کا سارا دھیان تو اسی شادی کے جلوس کی طرف تھا۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی اس نے محسوس کیا تھا کہ یہاں ادھیڑ عمر' بوڑھے اور بچے تو تھے لیکن جوانوں کی تعداد کم تھی اور یہ سب اس لیے تھا کہ یہ لوگ شادیاں کر کے گھر نہیں بناتے تھے۔ لیکن اب پھر شادی کر کے گھر بنانے کا رجحان ہو رہا تھا۔ شاید۔۔۔ تب ہی۔۔۔ تب ہی تو یہ چار بچوں کی ماں چرچ میں شادی کرنے جا رہی تھی اور تب ہی تو کیتھی چاہتی ہے کہ اس کا ایک گھر ہو بالکل مشرقی گھروں ایسا۔۔۔

اس نے سوچا وہ کیتھی کو اسلام پر لٹریچر دے گی۔۔۔ تاکہ اسے پتا چلے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے اسلام نے زندگی گزارنے کے جو طریقے بتائے تھے وہ کتنے مکمل اور صحیح تھے اور انیق کے پاس ضرور ایسا لٹریچر ہو گا۔ اسے خیال آیا۔

انیق نے کتنے دنوں سے اس کی خبر نہیں لی۔ حالانکہ۔۔۔ اور لنہ کے ساتھ اتنا بڑا حادثہ ہو گیا اور اس نے خود آئی۔ سی میں فون کیا تھا جو اس کے دوست نے اٹینڈ کیا تھا کیونکہ وہ موجود نہ تھا اور تب اس نے اس کے لیے پیغام چھوڑا تھا۔ مگر انیق نہیں آیا تھا' لنہ بھی کیا سوچتی ہو گی کہ انیق ایسا ہے۔

"لنہ کو اب تک آ جانا چاہیے تھا۔ ہے نا۔"

اکرم سلطانہ نے چلتے چلتے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"ہاں لیکن اکرم! یہ بھی تو سوچو حادثہ کتنا بڑا ہے۔ شاید اسے سنبھلنے میں بہت دن لگ جائیں یہ اچھا ہوا کہ انکل قیس اسے آ کر لے گئے۔ ورنہ اس کی حالت دیکھ دیکھ کر تو میرا دل ہولتا رہتا تھا۔"

"لیلیٰ محب اللہ! ایک بات بتاؤ سچ سچ۔۔۔ کیا عبدالحیٔ نے اچھا کیا۔"

ریتا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"کبھی کبھی یہ فیصلہ کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے اچھے اور برے کا۔ بعض اوقات بعض باتیں بیک وقت اچھی بھی ہوتی ہیں اور بری بھی۔ بہت سارے دنوں سے وہ خود سوچ رہی تھی کہ پتا نہیں اس نے اچھا کیا تھا یا برا۔

"اس کے سامنے ایک خوبصورت زندگی تھی۔ لنہ جیسی حسین بیوی کے ساتھ وہ ایک مکمل اور بھرپور زندگی گزار سکتا تھا۔ پھر اس نے ایسا کیوں کیا؟" ریتا نے پھر پوچھا۔

"ہاں' وہ ایک بھرپور زندگی گزار سکتا تھا پھر بھی اس نے ایسا کیوں کیا؟"

لیلیٰ نے دہرایا۔

"شاید ایک بڑے کاز (مقصد) کے لیے ریتا! جب سامنے ایک عظیم اور اعلا مقصد ہو تو چھوٹی خوشیاں بے معنی ہو جاتی ہیں۔"

"لیکن اس طرح خودکش حملے میں خود کو ہلاک کر کے اسے کیا ملا؟" کیتھی نے بھی بحث میں حصہ لیا۔

"یہ بات تو وہ خود ہی جان سکتا ہے کیتھی! کہ اسے کیا ملا۔۔۔ جو ہم سوچتے ہیں ممکن ہے وہ ایسا نہ سوچتا ہو ممکن ہے وہ سوچتا ہو کہ اس طرح اپنی زندگی قربان کر کے شاید وہ اپنے اہلِ وطن کے لیے کوئی راستہ بنا رہا ہو۔۔۔ کوئی بنیاد رکھ رہا ہے۔ جس پر اس کے وطن کی آزادی کی عمارت

استوار ہو سکے۔" لیلیٰ نے مفصل جواب دیا۔

"مجھے لنہ پر ترس آتا ہے۔" کیتھی حقیقتاً اس کے لیے افسردہ تھی۔ "وہ عبدالحئی سے کتنی محبت کرتی تھی اور عبدالحئی نے کچھ بھی نہ سوچا۔"

"جب من میں آگ جلتی ہو جو جسم و جان کو جلاتی ہو' دہکاتی ہو' کیتھی! تو پھر کوئی کسی کے متعلق نہیں سوچتا۔ چاہے وہ آگ کیسی بھی ہو۔ کسی بھی خواہش کی۔"

اور اس نے بھی تو کچھ نہیں سوچا تھا کسی کے متعلق بھی نہیں۔ بات مکمل کر کے اس نے سوچا۔

"مجدہ یوسف! لیلیٰ' محب اللہ اور اکرم سلطانہ تم تینوں کا مذہب ایک ہے۔ تمہارے مذہب میں خودکشی حرام ہے۔ تو تم اس کو کیا کہو گی؟ خودکشی یا شہادت؟ یہ ایسے خودکش حملے جو تمہارے یہ سرپھرے نوجوان کر رہے ہیں تم انہیں کیا گردانتی ہو؟"

ریتا کبھی کبھی متعصب ہو جاتی تھی۔

"اس کا فیصلہ کرنے والا تو اللہ ہے ریتا! ہم کون ہوتے ہیں کچھ فتویٰ دینے والے۔" مجدہ یوسف نے تحمل سے جواب دیا۔

"ہمارے ہاں۔" اکرم سلطانہ چلتے چلتے رک گئیں۔ "ایک چیز ہوتی ہے نیت...... جس پر ہمارے اعمال کا انحصار ہوتا ہے...... اگر ہم کوئی اچھا کام بری نیت سے کرتے ہیں۔ تو ہمیں اس کی جزا و سزا ہماری نیت کے حساب سے ملے گی اور اگر ہم اچھی نیت کے ساتھ کوئی کام کرتے ہیں اور وہ غلط ہو جاتا ہے تو ہمیں اس کی جزا ہماری نیت کے حساب سے ملے گی۔ ریتا جگدیش! اور ہم اس پر یقین رکھتے ہیں' ہماری تو وہ عبادتیں جو لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے اور نمائش کے جذبے سے کی جاتی ہیں بارگاہِ الٰہی میں قبول نہیں ہوتیں...... عبدالحئی کو اس کی نیت کا اجر ملے گا۔"

لیلیٰ نے ممنون نظروں سے اکرم سلطانہ کو دیکھا۔ ململ کی گرین ساڑھی باندھے وہ اس وقت بہت باوقار لگ رہی تھی۔ اور ایسے مشکل اوقات میں ہمیشہ وہی کام آتی تھی۔ لیلیٰ تو کبھی بھی بول نہ پاتی تھی۔ سب جانتے ہوئے بھی وہ دلائل دینا اور قائل کرنا نہیں جانتی تھی۔ جبکہ اکرم سلطانہ جو بظاہر بہت سادہ اور بقول لنہ کے بھولی بھالی لگتی تھیں' اتنے دھیمے انداز میں بات سمجھاتیں کہ بندہ قائل ہو جاتا۔ ابھی چند دن پہلے ہی ریتا اور جگدیش' کشمیر کی جنگ آزادی پر بہت بول رہے تھے۔

"یہ دہشت گردی ہے۔" ریتا کا موقف تھا۔

"ہر زمانے میں آزادی کی جنگ لڑنے والے حکومت وقت کی نظروں میں باغی ہوتے ہیں۔

ریتا! اگر تمہاری حکومت انہیں دہشت گرد کہتی ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

اکرم سلطانہ نے اس طرح دلائل دیے تھے کہ ریتا کو کوئی جواب نہیں سوجھا تھا اور جگدیش نے موضوع بدل دیا تھا۔

"چلو کل ہم سب لنہ کی طرف چلتے ہیں انکل قیس کے گھر۔"

مجدہ نے آئی۔ ایچ۔ ای والی سڑک کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ صحیح ہے۔" اکرم سلطانہ نے تائید کی۔

"اور اگر لنہ کی طبیعت اچھی ہوئی تو ہم اسے لے آئیں گے ساتھ۔"

"ہاں اور اب پلیز واپس چلو۔ میری ٹانگیں جواب دے گئی ہیں اور سنو۔ لیلیٰ آج میں تمہارے ہاتھ کا بنا ہوا زبردست ناشتہ کروں گی۔" مجدہ نے فیصلہ سنایا۔

ان دنوں وہ سب ہی فارغ تھیں اور یہ اس وقت واک کا پروگرام اکرم سلطانہ نے بنایا تھا۔ ان پر ان دنوں گھبراہٹ کے دورے پڑ رہے تھے۔

منیب پچھلے چار دنوں سے ڈن ہیگ گیا ہوا تھا اس نے ایک جگہ جاب کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا اور وہ اپنے فیصلے سے ایک انچ بھی نہیں ہلا تھا۔ اس نے ایک جگہ اکرم سلطانہ کے بھی پیپرز بھجوا دیے تھے' اس کا ارادہ تھا کہ آئی۔ ایچ۔ ای سے فارغ ہوتے ہی وہ جاب اسٹارٹ کر دے گا۔ اکرم سلطانہ چار بار دن میں اپنی بچیوں کو یاد کر کے ضرور دھواں دھار روتی تھیں۔ اور ان کے آنسوؤں سے لیلیٰ کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ وہ کتنی ہی بار مونی سے بات کر چکی تھی۔

"وہ ماں ہے منیب بھائی! چار سالوں سے بچیوں سے بچھڑی ہوئی ہے۔"

"بچیاں اپنی نانی کے پاس ہیں اور بہت خوش ہیں لیلیٰ بہن! اور میں ان ہی کی خاطر تو یہاں رکنا چاہتا ہوں۔ کیا میں باپ نہیں ہوں۔"

اور لیلیٰ خاموش ہو جاتی۔ پر اگلے روز اکرم سلطانہ کے آنسو پھر اسے منیب الرحمان کے سامنے لے جاتے۔

"منیب بھائی پلیز! آپ سوچیں نا......" اکرم سلطانہ اداس تھیں۔

لنہ عبداللطیف...... کے ساتھ کتنی ٹریجڈی ہوئی تھی۔ ایک شام انکل قیس نے آ کر بتایا تھا کہ عبدالحئی پرسوں صبح ہونے والے خودکش حملے میں شامل تھے اور لنہ کو سکتہ سا ہو گیا تھا وہ یونہی ہاتھ گود میں دھرے ساکت بیٹھی رہ گئی تھی...... پھر سب ہی اکرم سلطانہ کا دکھ بھول کر لنہ کی دلجوئی میں لگ گئے تھے لیکن اس کی حالت تو خراب ہی ہوتی جا رہی تھی۔ تب انکل قیس اسے اپنے ساتھ گھر لے گئے تھے اور آج اسے گھر گئے ہوئے بھی دو ہفتے ہونے والے تھے۔

اپنے اپارٹمنٹ میں آ کر لیلیٰ نے فریج سے آٹا نکالا تاکہ پراٹھے بنا سکے تو اکرم سلطانہ نے اس

سے اٹھا لے لیا۔

"لیلیٰ! تم آملیٹ بنالو۔ پراٹھے میں بناتی ہوں۔"

اکرم سلطانہ کوکنگ کی ماہر تھیں۔ لیلیٰ نے ان سے کئی طرح کے کھانے سیکھے تھے۔

مجدہ صوفے پر نیم دراز ہوگئی تھی اور ریتا اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ لیلیٰ نے فریج سے انڈے نکالے اور آملیٹ کے لیے پھینٹنے لگی تب ہی مجدہ نے آواز دی۔

"لیلیٰ! لنہ آگئی ہے۔"

اور وہ انڈے وہیں کچن کے کاؤنٹر پر رکھ کر بے اختیار اپنے کمرے کی طرف لپکی اور اسے دیکھتے ہی لنہ اس کے گلے سے آلگی۔

کتنی ہی دیر تک وہ اس کے کندھے پر سر رکھے روتی رہی اور لیلیٰ ہولے ہولے اسے تھپکتی رہی اور اس کا دل لہو ہوتا رہا۔ اور پھر بہت دیر بعد جب اکرم سلطانہ اور مجدہ ناشتہ کرکے اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں تو لنہ نے پرس سے خط نکال کر لیلیٰ کو دیا تھا۔ عبدالحئی کا خط۔۔۔ جو اس نے اس مشن پر جانے سے پہلے لکھا تھا اور روٹرڈیم میں خالہ کو بھیجا تھا۔ جو خالہ نے اسے بھجوا دیا تھا۔ عبدالحئی نے لکھا تھا۔

لنہ۔۔۔!

شاید تم بہت خفا ہوگی اس طرح شادی جلدی کرنے کی ضد کرکے پھر خود ہی ملتوی کردینا۔ میں جب یہاں سے گیا تھا تب سے ہی میرے ذہن میں تھا کہ مجھے اپنے وطن کی آزادی کے لیے کچھ کرنا ہے۔ مجھے سوتے میں مسجد اقصیٰ کی چیخیں سنائی دیتی تھیں لنہ؟ مجھے میرے وطن کی مٹی بین کرتی سنائی دیتی تھی۔ مجھے لیلیٰ کے اقبال رحمتہ اللہ علیہ کی آوازیں آتی تھیں کہ

" قبا چاہیے اس کو خون عرب سے "

جب میں نے فیصلہ کرلیا لنہ تو پھر شاید میں کچھ دیر کو خود غرض ہوگیا۔ میں نے سوچا جانے سے پہلے کچھ دن تمہارے ساتھ گزار لوں۔ میں نے ہمیشہ تمہارے ساتھ کا خواب دیکھا تھا۔ میں نے سوچا تھا وہ ساری باتیں جو میں تم سے کرنا چاہتا تھا اور نہیں کرسکا تھا کروں گا اور پھر ایک روز۔۔۔

لیکن لنہ پھر میں نے اپنی خوشی سے اپنی خود غرضی سے بالاتر ہو کر سوچا تو مجھے لگا' مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ تمہیں چند روز رفاقت کے بعد عمر بھر کی جدائی دینا انصاف تو نہیں ہے نا لنہ۔۔۔!

اور پھر میں نے یہ بھی سوچا کیا خبر تمہاری موجودگی اور رفاقت مجھے کمزور کردے۔۔۔ اور میں نے جو سوچا ہے نہ کرسکوں۔

لنہ میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

کاش ہم سب ایک ہوتے۔۔۔ تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں غلام نہیں رکھ سکتی تھی۔

لیلیٰ نے ایک بار کہا تھا۔۔۔

"کالی بھیڑیں نہ ہوتیں تو کشمیر کب کا آزاد ہوچکا ہوتا۔"

پتا نہیں کیوں کی یہ بات بار بار مجھے یاد آتی ہے اور میں سوچتا ہوں۔۔۔ مجھے یہی کرنا ہے۔۔۔ بس یہی۔ کل شام ہم تین لڑکے اپنے جسموں سے بم بندھ کر۔۔۔ یہ یقینی موت ہے۔

پر نہیں نے اسے خودکش حملوں کا نام دیا ہے۔

لیکن لنہ! میں اسے آزادی کی راہ میں اٹھنے والا ایک قدم کہتا ہوں۔

لنہ! میں نے تم سے بہت محبت کی ہے' بہت سوچا ہے تمہیں۔۔۔ آزادی میری پہلی محبت ہے۔ اور تم میری دوسری محبت ہو۔ آخری سانس تک میں نے تم سے محبت کی ہے۔ اللہ حافظ میری محبت۔۔۔! لیلیٰ کو کہنا تمہارا بہت خیال رکھے۔۔۔ اور تم۔۔۔ میں تھوڑی دیر کو آنکھیں بند کرکے تمہیں اپنے قریب محسوس کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ لنہ اپنی بانہوں میں۔۔۔ اللہ حافظ اپنا خیال رکھنا۔

تمہارا
عبدالحئی

"دیکھا۔۔۔ دیکھا تم نے لیلیٰ۔۔۔! دیکھا وہ کہتا ہے اس نے مجھ سے اپنے آخری سانس تک محبت کی۔۔۔ لیکن پھر اس نے مجھے اپنے ساتھ شامل کیوں نہیں کیا۔ اس نے یہ کیوں نہ چاہا لیلیٰ کہ میں بھی اس کے سنگ اس کے ساتھ آخری لمحوں تک رہتی اور ہم دونوں۔۔۔ ہاں ہم دونوں آزادی کے راستے میں یہ ایک قدم اکٹھے اٹھاتے۔۔۔ اس نے مجھے اتنا کمزور کیوں سمجھا۔۔۔ اس نے مجھے اپنے سنگ کیوں نہیں رکھا۔ اتنے لمبے سفر پر اکیلا کیوں چلا گیا۔

کیا فلسطین صرف اس کا ہے۔

کیا مجھے آزادی سے محبت نہیں ہے لیلیٰ؟ کیا میں اس کے ساتھ آزادی کے نام پر مر نہیں سکتی تھی۔"

وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اور خط کو پیپر ویٹ کے نیچے دبا کر لیلیٰ نے ایک بار پھر اسے گلے لگالیا اور اپنے ساتھ لگائے ہولے ہولے تھپکنے لگی۔

♥ ♡ ♡ ♥

اندر کی گھٹن اور حبس سے گھبرا کر وہ کمرے کے دروازے پر آکھڑی ہوئی تھی اور وہیں کھڑے کھڑے اس نے برآمدے اور صحن پر نظر ڈالی تھی۔ دھوپ برآمدے سے ہٹ کر اب صرف صحن میں چمک رہی تھی اور سورج سامنے درختوں سے پیچھے بڑی حویلی کے عین اوپر نظر

آرہا تھا۔

"سب دوپہر میں سوجاتے ہیں' پتا نہیں مجھے کیوں نیند نہیں آتی۔"

اس نے بالکل غیرارادی طور پر برآمدے کے دائیں کونے سے اوپر چھت کی طرف جاتی سیڑھیوں پر نظر ڈالی تھی اور پھر جیسے اس کی نظریں لمحہ بھر کو وہیں ہی جم گئی تھیں۔ سیڑھیوں کی ریلنگ پر ہاتھ دھرے کوثر کھڑی تھی غالباً' اوپر چھت پر جانے کے لیے۔ اس نے پہلا قدم سیڑھی پر رکھا تھا کہ وہ یوں ہی ننگے پاؤں بے چین ہو کر اس کی طرف دوڑی اور پیچھے سے اس کا پلو تھام کر کھینچا۔

"کوثر آپا۔۔۔! کوثر آپا!" اس کی آواز میں لرزش تھی اور آنکھوں میں خوف کوثر نے مڑ کر اسے دیکھا۔

گلابی لبوں پر دھیمی مسکان تھی۔ آنکھیں کسی خیال سے جگر جگر کر رہی تھیں یوں جیسے ہیرے دمک رہے ہوں۔ سفید لباس میں وہ کوئی اپسرا لگ رہی تھیں۔

پریوں کے دیس کی کوئی حسین پری۔

یا کوئی شہزادی۔

صرف چھ برس پہلے۔۔۔۔ ہاں چھ برس پہلے خالہ جانی کو بھی تو اس نے سیڑھیوں سے اترتے دیکھا تھا اور ان کی آنکھیں بھی ایسے ہی دمک رہی تھیں اور خالہ جانی کے بعد کوثر آپا کتنی سنجیدہ ہو گئی تھیں۔۔۔۔ کوثر آپا جو خالہ جانی کی سہیلی بھی تھیں اور جو ہر بات پر ہنستی تھیں۔ نہ ہنسنے والی بات پر بھی۔ مگر خالہ جانی کے بعد انہوں نے ہنسنا چھوڑ دیا تھا اور وہ ہنسنے والی بات پر بھی نہیں ہنستی تھیں ایک بار انیق سلیمان نے اسے لطیفوں والی کتاب سے لطیفے پڑھ کر سنائے تھے اور وہ دونوں ہنس ہنس کر دہرے ہو گئے تھے اور جب اس نے انیق سے کتاب لاکر کوثر آپا کو دی تھی۔ اس کا کتنا دل چاہتا تھا کہ کوثر آپا پہلے کی طرح ہی ہنسا کریں۔ پر کوثر آپا کو تو ذرا بھی ہنسی نہیں آئی تھی۔ انہوں نے لطیفے پڑھ کر اسے کتاب واپس کر دی تھی۔

خالہ جانی کے بعد وہ بہت سنجیدہ ہو گئی تھیں۔ ہر وقت کمرے میں گھسی پڑھتی رہتیں اور بڑے ماموں سے تو بالکل بات ہی نہیں کرتی تھیں انہیں دیکھتے ہی منہ پھیر لیتی تھیں۔ پھر انہوں نے قریبی قصبے سے بی۔ اے کر لیا تھا اور لاہور چلی گئی تھیں اور چند ماہ پہلے ہی سوشیالوجی میں ماسٹرز کر کے واپس آئی تھیں اور اتنے سالوں بعد چھ سالوں بعد اس نے ان کے ہونٹوں پر مسکان سجی دیکھی تھی اور ان کے وجود سے چارلی کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

"کیا ہے منی؟" کوثر نے پوچھا۔

"آپا۔۔۔! آپ اوپر مت جائیں۔ اوپر برساتی میں تو جن رہتے ہیں اور چڑیلیں اور انہوں نے

خالہ جانی کو کنوئیں میں دھکا دے دیا تھا۔"

"نہیں منی! خالہ جانی کو تو۔۔۔۔" اور کوثر کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ایک لمحہ کو بجھ سی گئی تھی مگر دوسرے ہی لمحے وہ مسکرا دی تھیں۔

"نہیں منی۔۔۔! اوپر کوئی جن نہیں رہتے۔ چلو تم بھی میرے ساتھ۔"

"مگر کوثر آپا!" بارہ سالہ منی کا بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ کوثر کے ساتھ چھت پر جائے۔ اس کا رنگ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا لیکن کوثر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اوپر چھت پر لے گئی تھیں۔

"دیکھو تو کہاں ہے جن؟"

اور چھوٹی حویلی کی چھت پر ٹہلتے مدبر حسین کو دیکھ کر منی کا خوف کم ہو گیا تھا اور اس نے سوچا تھا اگر جن آ بھی گیا تو مدبر بھائی ہیں نا۔۔۔۔ اور وہ سرخ حویلی اور چھوٹی حویلی کے چھتوں کو الگ کرتی فصیل پر اچک کر بیٹھ گئی تھی۔ ایک پاؤں ادھر اور ایک پاؤں ادھر لٹکائے مدبر حسین سے باتیں کرنا اسے اچھا لگ رہا تھا اور کوثر آپا منڈیر پر ہاتھ دھرے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بس مسکرائے جا رہی تھیں۔۔۔۔ اور مدبر بھائی منی سے باتیں کرتے ہوئے مسلسل کوثر آپا کو دیکھے جا رہے تھے۔

منی نے محسوس کیا کہ مدبر حسین کا دھیان اس کی طرف نہیں ہے تو وہ دیوار سے کود کر برساتی میں آ گئی۔ سامنے ہی وہ طاقچہ سا تھا جس میں چھ برس پہلے اس نے اپنی گڑیوں والا بکسا رکھا تھا اور پھر کبھی "بکسا" لینے نہیں آئی تھی۔ وہ "بکسا" اب بھی پڑا تھا۔۔۔۔ ٹین کا چھوٹا سا ڈبہ جسے وہ "بکسا" کہتی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ "بکسا" کھول کر دیکھے۔ وہ کالا جارجٹ کا سوٹ اور وہ ستاروں والی گلابی سلک کا لہنگا۔ لیکن پھر وہ ڈر کر باہر آ گئی۔

مدبر حسین اور کوثر آپا کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ اور مدبر بھائی بھی اسے بہت اچھے لگتے تھے وہ جب کبھی چھٹیوں میں آتے تو اس کے لیے ڈھیروں کہانیوں والی کتابیں لاتے تھے۔ اور جب سرخ حویلی میں آتے تو یہ کتابیں اسے دے دیتے تھے۔ کئی بار انہوں نے اسے چاکلیٹ اور چیونگم بھی دی تھیں۔ وہ بھی لاہور سے سول انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر کے آئے تھے اور کوثر آپا بھی لاہور میں پڑھتی تھیں اور کبھی کبھی چھٹیوں میں وہ اکٹھے ہی آ جاتے تھے بابا جان انہیں فون کر دیتے تھے کہ وہ آتے ہوئے انہیں بھی لے آئیں۔

"دیکھا منی! یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

"یہ مدبر بھائی ہیں۔" منی نے ان کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"اور کیا مدبر بھائی تمہیں جن نظر آتے ہیں' کوثر آپا کھل کھل کر کے ہنس پڑی تھیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیوں سے اتر آئی تھیں۔

گو اسے چھت پر کوئی جن نظر نہیں آیا تھا لیکن کتنے ہی دن وہ خوف زدہ سی رہی تھی کہ کہیں چھت پر جانے کی پاداش میں جن کوثر آپا کو اور اسے خالہ جانی کی طرح اڑا کر نہ لے جائیں اور کنوئیں میں گرا دیں اور وہ کئی بار رات کو اٹھ کر دیکھتی کہ کوثر آپا اپنے بیڈ پر سو رہی ہیں کہ نہیں۔ لیکن کوثر آپا کو تو ذرا بھی ڈر نہیں لگتا تھا وہ تو ان دنوں بہت خوش خوش رہنے لگی تھیں۔ اور اب تو وہ ہنستی بھی تھیں کبھی کبھی اور منی کو وہ ہنستے ہوئے بہت اچھی لگتی تھیں اور وہ چپکے چپکے انہیں دیکھتی رہتی تھی۔

اور اس نے بڑی حویلی میں جا کر انیق کو بھی بتایا تھا۔

"انی! پتا ہے کوثر آپا اب پھر ہنسنے لگی ہیں۔"

"کیوں کیا پہلے انہیں ہنسنا نہیں آتا تھا یا ان کے ہنسنے پر پابندی لگی ہوئی تھی؟" انیق کی عادت تھی حجت کرنے کی۔

وہ اس سے ناراض ہو کر بڑی حویلی سے چلی آئی تھی۔ تب کئی دنوں بعد انیق آیا تھا۔ تو وہ منہ پھلائے بیٹھی رہی تھی۔

"منی! کوثر آپا کہاں ہیں۔ میں انہیں ہنستے ہوئے دیکھنے آیا ہوں۔"

وہ ایسا ہی تھا پہلے اس کی بات کو ذرا بھی اہمیت نہ دیتا اور رد کر دیتا اور پھر خود ہی کرید کرید کر پوچھتا۔

پر اس روز تو کوثر آپا بالکل چپ بیٹھی کچھ سوچ رہی تھیں۔۔۔۔ اور پھر اس روز کے بعد کوثر آپا ایک بار پھر چپ چپ رہنے لگی تھیں اور وہ سوچتی ہی رہ گئی تھی کہ کب کوثر آپا اسے ہنستی نظر آئیں اور وہ انیق کو بھاگ کر بلا لائے۔ اس نے کتنی بار جتایا تھا کہ کوثر آپا تو بالکل بھی نہیں ہنستیں بلکہ مسکراتی بھی نہیں اور وہ یونہی جھوٹ بولتی ہے۔

لیکن کوثر آپا تو بہت اداس رہنے لگی تھیں۔ اکثر ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوتیں اور اب تو مدبر بھائی بھی ادھر نہیں آتے تھے اور بہت سارے دنوں سے انہوں نے اسے کوئی کہانیوں کی کتابیں بھی نہیں دی تھیں اور اس نے اپنے پاس موجود کہانیوں کی کتابیں دو دو بار پڑھ لی تھیں۔

اور اس دوپہر کو وہ کوثر آپا کو ڈھونڈتی ہوئی بڑی اماں کے کمرے میں آئی تھی تا کہ ان کو بتا کر چھوٹی حویلی چلی جائے اور مدبر بھائی سے اچھی سی کتاب لے آئے پڑھنے کو کہ اس نے بڑی اماں کے کمرے میں کوثر آپا کو اماں کے گھٹنے پر سر رکھے روتے ہوئے دیکھا تھا۔

"اور پتا نہیں کوثر آپا کیوں روتی ہیں۔" اس نے سوچا تھا۔ "کیا انہیں خالہ جانی یاد آتی ہیں۔"

اور اماں کہہ رہی تھیں۔

"آخر برائی کیا ہے دبیر میں؟"

"کوئی برائی بھی نہ ہو اماں۔۔۔ پر نہیں اماں مجھے حمزہ ماموں کی بہو نہیں بننا پلیز اماں۔"

"تو کیا دبیر بھائی کے ساتھ کوثر آپا کی شادی ہو رہی ہے۔"

اس نے سوچا تھا اور وہاں سے مڑ آئی تھی۔ دبیر بھائی اسے بھی اچھے نہیں لگتے تھے۔ مغرور اور غصیلے سے ذرا ذرا سی بات پر غصے سے لال پیلے ہو جاتے تھے۔ اس سے تو اچھا ہے کوثر آپا کی شادی مدبر بھائی سے ہو جائے اور یہی بات رات کو اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے کوثر آپا سے کہہ دی اور کوثر آپا کتنی ہی دیر تک اسے چپ سی تکتی رہی تھیں۔

"منی! تمہیں خالہ جانی یاد ہیں؟" پتا نہیں انہوں نے کیوں پوچھا تھا۔ منی نے سر ہلا دیا۔

"منی! باہر چلو گی۔ یہاں کمرے میں کتنی گھٹن ہے۔"

"ہاں!" وہ بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور وہ دونوں کتنی ہی دیر تک صحن میں ٹہلتی رہی اوپر چودھویں کا چاند چمک رہا تھا اور اس کی روشنی پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ سب اپنے اپنے کمروں میں تھے۔۔۔۔ کوئی جاگ رہا تھا کوئی سو گیا تھا۔ لاؤنج سے ٹی۔وی کی آواز آ رہی تھی۔

صحن میں چلتے چلتے منی نے کتنی ہی بار اوپر آسمان پر چمکتے چاند کو دیکھا اور پھر کوثر آپا کو جو جانے کیا سوچ رہی تھیں۔

"منی!" چلتے چلتے وہ صحن کے کونے میں کنوئیں کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

"منی! میرا جی چاہتا ہے میں اس کنوئیں میں کود جاؤں۔ لیکن مجھے حرام موت سے ڈر لگتا ہے۔ منی! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تو مجھے اس کنوئیں میں دھکا دے دے۔"

اور منی نے یوں سہم کر اسے دیکھا جیسے وہ پاگل ہو گئی ہوں۔

"کوثر آپا!" اس نے مضبوطی سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ "چلیں واپس کمرے میں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"منی!" واپس مڑتے ہوئے انہوں نے بڑے دکھ سے کہا۔ "اس حویلی کی لڑکیوں کو محبت راس نہیں آتی تم کبھی محبت مت کرنا منی۔۔۔۔"

اس رات وہ بہت دیر تک تکیے میں منہ چھپائے روتی رہیں اور منی ان کی سسکیاں سنتے سنتے جانے کب سو گئی اور صبح اس کی آنکھ حمزہ ماموں کی اونچی آواز سے کھلی تھی۔ وہ ان کے کمرے میں کھڑے غصیلی نظروں سے کوثر آپا کو دیکھ رہے تھے۔

"تم نے کل اماں سے کیا کہا کوثر؟"

"میں نے بڑی اماں سے کہا کہ مجھے ایک قاتل کے بیٹے سے شادی نہیں کرنا۔۔۔۔ چاہے

ساری عمر کنواری بیٹھی رہوں۔" کوثر آپا نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔
"آج کے بعد یہ لفظ اپنی زبان سے مت نکالنا کوثر اور اب ساری عمر اسی دہلیز پر بیٹھی رہنا۔۔۔ میں آج ہی زبیر کی منگنی اس کی خالہ زاد سے کر رہا ہوں۔"
"تھینک یو ماموں!" کوثر آپا کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا۔
مگر پھر پتا نہیں کیا ہوا تھا' اگلی صبح حویلی میں کہرام مچا تھا۔ رات کوثر آپا نیند میں چلتے ہوئے کنوئیں میں گر گئیں۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی کچھ دیر دروازے میں کھڑی رہی۔ صحن میں پورے "کنجن پالی" کی عورتیں اکٹھی ہو رہی تھیں اور بڑی اماں کے ساتھ اماں صحن کے بیچوں بیچ کھڑی بین کر رہی تھیں تب ہی لاٹھی ٹیکتے ہوئے داجی نے برآمدے میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے اقتدار حسین کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بہت آہستگی سے کہا۔
"اقتدار حسین کیا سرخ حویلی کی ساری لڑکیوں کو نیند میں چلنے کی عادت ہو گئی ہے۔ تم اس کنوئیں کو بند کیوں نہیں کروا دیتے اقتدار حسین۔۔۔؟"
اور منی جو اپنے کمرے کے دروازے پر حیران سی کھڑی تھی۔ یک دم دوڑ کر داجی سے لپٹ گئی اور زور زور سے رونے لگی۔ چیخ چیخ کر۔

♥ ♡ ♡ ♥

"پتر مدبر حسین! اٹھ جا بہت دیر ہو گئی' تیری ماں دو بار تجھے بلانے کے لیے بندہ بھیج چکی ہے۔" سید دیدار حسین شاہ نے پاس بیٹھے مدبر حسین کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"داجی! میرا جی نہیں چاہتا کہیں جانے آنے کو۔ مجھے یہیں ہی بیٹھے رہنے دیں پلیز۔"
"نہ پتر! تیری ماں راہ تکتی ہو گی تیری۔"
"داجی! آپ نے آج مجھے شاہ عبداللطیف کی کافیاں نہیں سنائیں۔" مدبر حسین نے ان کی طرف دیکھا۔
"بس آج تمہیں جو سنتا رہا ہوں سارا دن۔"
"داجی! آپ نے جواب تو نہیں دیا۔"
"کیا جواب دیتا۔۔۔ کچھ باتوں کے جواب نہیں ہوتے۔"
"داجی! وہ اتنی کمزور تو نہیں تھی۔ داجی! اس شام اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں بار بار ابو اور امی کو نہ بھیجوں اس لیے کہ کچھ باتیں طے ہوتی ہیں۔۔۔ اور یہ بھی طے ہے کہ سرخ حویلی اور بڑی حویلی والوں کو چھوٹی حویلی والوں سے کتنی ہی محبت کیوں نہ ہو۔۔۔ وہ چھوٹی حویلی سے آنے والا کوئی رشتہ قبول نہیں کریں گے اور نہ کوئی رشتہ لے کر چھوٹی حویلی جائیں گے۔ داجی! وہ تو مجھے حوصلہ دے رہی تھی۔ مجھے سمجھا رہی تھی کہ میں خوامخواہ ضد نہ کروں اور حسنہ خالہ کی

فریال سے شادی کر لوں۔ اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی داجی! نہیں تو وہ مجھے بھی اپنا ہم قدم پاتی۔ وہ تنہا کنوئیں میں کیوں کودتی داجی! میں بھی ساتھ جاتا۔ میں بھلا کیسے پیچھے رہ سکتا تھا اس سے۔ اس نے کہا تھا داجی۔۔۔! اسے حمزہ ماموں کے بیٹے سے شادی نہیں کرنا۔۔۔! اس لیے نہیں کہ وہ عمر میں اس سے دو سال چھوٹا ہے اگر وہ بڑا بھی ہوتا تب بھی نہیں۔۔۔ کیونکہ وہ حمزہ ماموں کو پسند نہیں کرتی۔۔۔ اور اس نے کہا تھا داجی۔۔۔ اس نے بڑی اماں اور تائی جی کو یہ بات بتا دی ہے کہ وہ جہاں جی چاہے اس کی شادی کر دیں لیکن حمزہ ماموں کے بیٹے سے نہیں۔"
"داجی!" اس نے پھر نظریں اٹھائیں۔ "کیا صرف اتنی سی بات پر کہ وہ دبیر سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔۔۔"
اس نے سوالیہ نظروں سے داجی کو دیکھا۔
"نہیں داجی! میرا دل اس بات کو تسلیم نہیں کرتا اور یہ گتھی مجھ سے سلجھتی کہ کیوں کس لیے۔۔۔؟ میں بہت الجھ گیا ہوں اتنا کہ اس کی جدائی کا غم بھی اس سوال میں الجھ کر کہیں دب گیا ہے۔ آپ یہ مسئلہ سلجھا نہیں سکتے داجی۔۔۔؟"
"نہیں۔۔۔ میں کیسے سلجھاؤں پتر۔" داجی نے نظریں چرا لیں۔
"آپ جانتے ہیں داجی؟" اس نے پھر پوچھا۔
"سن شاہ لطیف کہتا ہے۔
وہ درد جو محبوب سے ملا اس کی ماہیت دنیاوی دکھوں سے کہیں مختلف ہے' اس میں۔۔۔"
"داجی! میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے۔ آپ جانتے ہیں نا؟"
"نہ جاننا جاننے سے بہت بہتر ہوتا ہے پتر۔"
"داجی!" اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ "یہ کوئی ایسی ناجائز خواہش تو نہ تھی کہ میں اپنے باپ کی سگی تایا زاد بہن کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔"
"ہاں بیٹا خواہش تو ناجائز نہیں تھی لیکن ضروری تو نہیں کہ ہر جائز خواہش پوری ہو جائے۔"
"نہ ہوتی خواہش پوری داجی! نہ ہوتی پر وہ زندہ رہتی۔۔۔ ہنستی رہتی' خوش رہتی۔ محفوظ پھپھو کے بعد اسے زندگی اچھی نہیں لگتی تھی۔۔۔ میں نے اسے زندگی سے محبت کرنا اور ہنسنا سکھایا۔ اسے زندگی سے محبت تھی داجی۔۔۔ پھر وہ یہ زندگی اپنے ہاتھوں کیسے ختم کر سکتی تھی؟"
"ہر جاندار کو فنا ہے مدبر حسین۔۔۔! اسے ایک دن اپنی منزل پر روانہ ہونا ہے۔ بس وہ ذرا جلدی چلی گئی۔۔۔ تو دل کو سنبھال' حوصلہ کر۔"
"کیسے سنبھالوں داجی! سنبھلتا نہیں۔"

"سنبھالنا تو پڑے گا پتر۔۔۔! اپنے لبوں سے اس کا نام مت نکالنا۔۔۔"

"بھول جاؤں اسے، کیسے ممکن ہے؟۔"

"کون کہتا ہے جھلیا! بھول جا اسے، یاد رکھ پر لبوں کو سی لے۔ لطیف کہتا ہے۔

مجھے میرے اندر ہی ساجن کا ٹھکانا محسوس ہوتا ہے ہر جانب وہ ہی ہے اور اس کے بغیر اور کوئی سوجھتا ہی نہیں۔"

"وہ زندہ رہتی۔ خوش رہتی، اس کا گھر ہوتا بچے ہوتے تو میں بھول جاتا اسے پر اب تو۔۔۔ اب تو واجی وہ یہاں۔۔۔" اس نے دل پر ہاتھ رکھا۔ "یہاں ہی ساکت ہو گئی ہے۔ ٹھہر گئی ہے۔"

آنکھوں میں چمکنے والے آنسو رخساروں پر ڈھلک آئے۔

"اتنے دن گزر گئے۔ ابھی تک تیرے دل کو سکون نہیں آیا۔ کام پر جا پتر۔ دل لگا کام میں۔ ہولے ہولے بہل جائے گا۔"

مدبر حسین نے کچھ نہیں کہا۔ بس نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"دل بہل بھی گیا تو کیا ہو گا واجی! اندر جو آگ لگی ہے کیسے بجھے گی۔۔۔ یہ جو سوالوں کے تھور اگ آئے ہیں میرے اندر۔۔۔ ان کا جواب کون دے گا واجی؟؟"

"مل جائے گا مدبر حسین۔۔۔! مل جائے گا ہر سوال کا جواب بھی۔ خود بخود ادراک ہو گا۔"

"اور یہ جو بھانبڑ جل رہے ہیں میرے اندر، یہ آگ کیسے ٹھنڈی ہو گی۔؟؟"

"پتر! جو عشق کی آگ میں جلنے کی مشق کرتے ہیں۔ وہ باطل کے اندھیرے کی نفی کرتے ہیں۔ جوگی کا حسن اس کے عشق کا خمار ہوتا ہے۔ وہ آگ ہوتی ہے جو ہر لمحہ اس کے دل کی آرزو کو دہکاتی رہتی ہے۔"

"پر واجی!" اس نے بازو موڑ کر آستینوں سے آنسو پونچھے۔

"میں جوگی نہیں ہوں۔ نہ ہی صوفی ہوں میں تو ایک عام سا بندہ ہوں۔ میرے دل کی آرزو بھی بہت عام سی تھی۔ من پسند لڑکی کی معیت میں زندگی بسر کرنا۔ اب تو نہ آرزو رہی ہے اور نہ تمنا، پھر بھی آگ دہکائے جاتی ہے دل کو اور جلائے جاتی ہے جسم و جان کو۔ کیا کروں واجی! کیا کروں۔ مجھے اپنے سینے سے لگا لیجیے واجی! زور سے بھینچ لیجیے۔ نہیں تو میرا دل پھٹ جائے گا۔"

اور سید دیدار حسین شاہ نے بے اختیار بازو پھیلا دیے اور مدبر حسین ان کے سینے سے آ لگے۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"اور میں تو جلالی جوگیوں کی جلائی ہوئی آگ سے منور ہوئی ہوں اس لیے ان سے علیحدہ ہو کر

زندہ نہیں رہ سکتی۔"

لیلیٰ محب اللہ نے زیر لب شاہ لطیف کی کافی دہرائی۔ پتا نہیں کیوں آج اسے واجی بہت یاد آ رہے تھے۔ واجی جو شاہ عبداللطیف کی کافیاں بہت پڑھتے تھے۔ جنہیں بابا فرید سے عشق تھا۔

جنہیں بُلھے شاہ ازبر تھا۔

جو میاں محمد اور وارث شاہ کو پڑھتے تو لیلیٰ کو لگتا جیسے ہر چیز ان کی آواز کے سوز سے تھم گئی ہو حتی کہ چلتا پانی بھی۔

"کاش۔۔۔ اے کاش واجی زندہ ہوتے تو۔"

وہ اوندھی لیٹی بازوؤں میں منہ چھپائے بہت دیر سے اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ لنہ یا کوئی اور اس کے آنسو دیکھ کر اس سے استفسار کرے۔ اسے اپنے زخم چھپانے کی عادت تھی۔ وہ خود ہی انہیں جھیلتی اور ان پر مرہم رکھتی رہتی تھی۔ یہاں ہر دوسرا شخص پہلے سے زیادہ دکھی اور رنجیدہ ہے پھر انسان اپنے درد کیوں عریاں کرے۔ کیوں اپنے زخموں سے پردہ اٹھائے۔ یہاں سکھی کون ہے؟

اکرم سلطانہ جو بچیوں سے دور تڑپتی تھیں، ماہی بے آب کی طرح؟

یا لنہ سکھی تھی جس کے محبوب نے خودکش حملے میں خود کو ختم کر کے آزادی کی راہ میں محض ایک قدم اٹھایا تھا۔

یا کیتھی۔۔۔ جس نے ساری زندگی گھر کا سکھ نہیں دیکھا تھا۔ جسے بہت بچپن میں ہی سوشل ویلفیئر نے اس کے والدین سے لے کر ایک برٹش جوڑے کے حوالے کر دیا تھا جو چودہ سال کی عمر تک تین مختلف فیملیوں کے ساتھ رہی تھی؟

پھر وہ کیوں اپنے آنسو ارزاں کرے اور پھر اس کا دکھ ایسا تو نہیں تھا کہ وہ کسی سے کہتی۔۔۔ کیا بتائے کسی کو کہ "کنجن بالی" جو ایک چھوٹا سا گاؤں ہے لیکن جس میں ایک بڑی حویلی کے صحن میں موجود کنوئیں کا دکھ ہے اسے۔

وہ کیا کہے کہ اسے نیند میں چلنے والی حویلی کی لڑکیوں کا دکھ ہے جنہیں یہ ظالم کنواں منہ پھاڑے ہڑپ کر لیتا تھا۔

اور اسے اس کنوئیں کے اب تک موجود ہونے کا دکھ ہے۔ اور اسے۔۔۔ بھائی مدبر حسین کا دکھ ہے۔ اسے برساتی کے ایک طاقچے میں رہ جانے والے اپنے گڑیوں والے "بکسے" کا دکھ ہے اور اسے سید محب اللہ شاہ کا دکھ ہے۔ اور اسے "باماں بالا" کی اس وسیع اور بڑی حویلی کی ویرانی کا دکھ ہے، جو بالکل نئے اور ماڈرن انداز میں ڈیکوریٹڈ ہے۔

اور۔۔۔ اور اسے اپنی محبت کے بچھڑ جانے کا دکھ ہے۔

اس محبت کے بچھڑ جانے کا جس کے لیے اس نے پردیس کے دکھ بھوگے اور جس کے لیے اس نے سب کو چھوڑا۔ اس محبت کے بچھڑ جانے کا دکھ۔

اور یہ دکھ جیسے آج سارے دکھوں پر بھاری ہو رہا تھا۔

انیق سلیمان جس نے بڑے بڑے دعوے کیے تھے اور جس نے کہا تھا اگر لیلیٰ اسے نہ ملی تو وہ بڑی حویلی کی اونچی چھت سے چھلانگ لگا دے گا۔

اور جو کہتا تھا۔ اس کی صبح لیلیٰ محب اللہ شاہ کے نام سے طلوع ہوتی ہے اور اس کے نام پر ہی ختم ہو جاتی ہے اور جو پچھلے چار ماہ سے نہ جانے کہاں غائب تھا وہ جو ہر چھٹی والے دن صبح ہوتے ہی آئی۔ سی۔ سی سے بھاگا چلا آتا۔

"تم جانتی ہو لیلیٰ! یہ سات دن میں نے کیسے گزارے ہیں۔ یہ دن اتنے لمبے کیوں ہوتے ہیں اور ہر دن کی رات اس سے بھی زیادہ لمبی۔۔۔۔ پتا ہے لیلیٰ یہ سات دن سات صدیاں بن کر گزرتے ہیں مجھ پر۔"

لنہ اور کیتھی اس کی خوش نصیبی پر رشک کرتیں۔

"How lucky you are" (لیلیٰ تم کتنی خوش قسمت ہو)

لیکن پتا نہیں کیوں اسے اپنی خوش قسمتی پر کبھی رشک نہ آیا۔ پتا نہیں کیوں اسے ہمیشہ لگا جیسے وہ اتنی خوش قسمت نہیں ہے۔ ہمیشہ ایک دھڑکا سا لگا رہا کہ کوثر آپا کہتی تھیں۔

"منی! کبھی کسی سے محبت نہ کرنا اس لیے کہ اس حویلی کی لڑکیوں کو محبت راس نہیں آتی۔"

مگر اسے تو محبت مل گئی تھی۔

اس کی محبت میں تو کہیں کوئی دیوار کھڑی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے انیق سلیمان سے محبت کی تھی۔۔۔۔ اور وہ انیق سلیمان کی ہو گئی تھی بغیر کسی رکاوٹ کے۔ نکاح کے بعد بھی کتنی ہی دیر تک اسے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ لیلیٰ محب اللہ سے لیلیٰ انیق سلیمان ہو گئی ہے لیکن یہ سچ تھا کہ اس کا نکاح انیق سلیمان سے ہو گیا تھا۔ گو رخصتی دو سال بعد انیق کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ٹھہری تھی۔۔۔۔ پھر بھی اس کی محبت تو کامیاب تھی۔

شاید اس لیے کہ وہ کنجن بالی کی حویلی میں نہیں باماں بالا میں رہتی تھی۔

اور شاید اس لیے کہ تاؤ جی نے سرخ حویلی کا وہ کنواں بند کر کے اوپر موٹر لگوا دی تھی لیکن جب موٹر چلتی تو اسے موٹر کی آواز سے خالہ جانی اور کوثر آپا کی چیخیں سنائی دیتی تھیں اور وہ دیوانوں کی طرح روتی چلی جاتی۔

تب داؤ جی اسے اپنے گھر لے جاتے، صبح سے شام تک تاؤ جی کے گھر رہ کر جب وہ گھر لوٹتی تو اسے اکیلے کمرے میں ڈر لگتا۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھے بیٹھے کوثر آپا کے بیڈ کی طرف دیکھتی تو اسے

لگتا جیسے کوثر آپا وہاں بیٹھی ہوں آلتی پالتی مارے سامنے کتابوں کا ڈھیر پھیلائے اور کبھی ہولے ہولے گنگناتے ہوئے موتیے کے گجرے پروتے ہوئے۔

موتیے کے پھول جو چھوٹی حویلی میں موتیے کے جھاڑوں پر لگتے تھے جو ستونوں سے لپٹے اوپر چھت تک چلے گئے تھے۔۔۔۔ اور کبھی کوثر آپا کے پاس خالہ جانی بھی آ بیٹھتیں۔

اور پھر اچانک لمبے لمبے دانتوں اور خوفناک آنکھوں والا جن کہیں سے آ جاتا اور انہیں اپنے لمبے بازوؤں میں دبوچ کر اڑ جاتا اور پھر کنوئیں سے چیخوں کی آوازیں آتیں۔

خالہ جانی اور کوثر آپا کی چیخیں ایسی ہی ایک رات میں وہ چیختی ہوئی اپنے کمرے سے نکلی تھی اور برآمدے میں اپنے کمرے کی طرف جاتے سید محب اللہ شاہ سے لپٹ گئی تھی۔

"بابا جانی۔۔۔۔!"

اور سید محب اللہ شاہ نے جو ابھی ابھی دو ہفتے "باماں بالا" رہنے کے بعد سرخ حویلی لوٹے تھے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ دونوں بازو اس کے گرد حمائل کیے وہ بار بار اس سے پوچھ رہے تھے۔

"کیا ہوا منی۔۔۔۔! کیا ہوا بیٹے؟"

وہ ان کے بازوؤں میں بے ہوش ہوئی جاتی تھی۔ شور سن کر حمزہ ماموں اور دبیر حسین اپنے کمروں سے باہر نکلے تھے۔ حمزہ ماموں نے قریب آ کر پوچھا تھا۔

"کیا ہوا بھائی صاحب؟"

اور اس نے سر اٹھا کر حمزہ ماموں کو دیکھا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کے سر پر سینگ نکل آئے تھے اور لمبے لمبے دانت ہونٹوں سے باہر جھانکنے لگے تھے اور اسے لگا تھا جیسے انہوں نے اپنے لمبے بازو آگے بڑھائے ہوں۔

وہ زور سے چیخی تھی۔

"بابا جانی! جن۔۔۔۔ یہ جن ہے۔ یہ مجھے خالہ جانی اور کوثر آپا کی طرح اڑا کر کنوئیں میں پھینک دے گا۔"

اور پھر وہ چیختی ہی چلی گئی اور یونہی بابا جانی کے بازوؤں میں بے ہوش ہو گئی اور پھر اس رات محب اللہ شاہ اسی کے کمرے میں سوئے تھے۔ شاید انہوں نے ساری رات جاگ کر گزاری تھی کہ منہ اندھیرے ہی جب قریبی مسجد میں فجر کی اذان ہو رہی تھی وہ سرخ حویلی کا بڑا گیٹ کھول کر مسجد میں چلے آئے تھے جہاں وضو کرتے سید دیدار حسین شاہ نے بڑی حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ فجر کی نماز میں اس سے پہلے محب اللہ شاہ کبھی شامل نہیں ہوئے تھے۔

"خیر تو ہے بیٹا؟"

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنا ہے داجی! ایک سوال پوچھنا ہے داجی جس نے ساری رات مجھے سونے نہیں دیا۔" سید دیدار حسین شاہ نے ایک لمحہ انہیں دیکھا۔

"نماز سے فارغ ہو کر حویلی میں چل کر بات کرتے ہیں۔"

"پتا نہیں سید محب اللہ نے اتنی دیر صبر کیسے کیا تھا کہ حویلی میں داخل ہوتے ہی ابھی دیدار حسین نے اپنے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ ان کے ساتھ ساتھ چلتے سید محب اللہ نے بے اختیار پوچھا۔

"داجی۔۔۔ محفوظ فاطمہ اور پھر کوثر۔۔۔ دونوں کی ہی موت کنوئیں میں گر جانے سے ہوئی۔۔۔ داجی کنوئیں کی منڈیر اتنی چھوٹی تو نہ تھی کہ چلتے چلتے اندھیرے میں کوئی اندر گر جائے۔"

"تم پوچھنا کیا چاہتے ہو؟" داجی نے اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بظاہر اطمینان سے کہا لیکن ان کے دل میں ارتعاش سا پیدا ہوا تھا۔

"آپ جانتے ہیں داجی! میں کیا پوچھنا چاہتا ہوں۔ رات بھر جو حساب کتاب میں نے کیا ہے۔ سب کا حاصل جمع ایک ہی ہے داجی۔"

"جب جانتے ہو سب تو پھر مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہو۔"

"جانتا نہیں ہوں داجی۔۔۔! جاننا چاہتا ہوں۔ اندازوں پر یقین کی عمارت کھڑی نہیں کی جاسکتی۔"

"یقین کی عمارت کھڑی کر کے کیا کرو گے محب اللہ شاہ۔"

سید دیدار حسین شاہ کی آنکھیں بہت دیر تک سید محب اللہ کے چہرے پر ٹکی رہیں۔۔۔ اور پھر انہوں نے نظریں جھکا لیں۔

"داجی کوثر میری بیٹی تھی۔۔۔ میرے وجود کا حصہ تھی۔۔۔ اس کے متعلق فیصلے کا اختیار کسی اور کو کیسے ہو گیا تھا؟"

ان کی آواز میں آنسو تھے اور داجی کے کمرے کے کسی کونے میں کارپٹ پر سوئے ہوئے مدبر حسین نے اپنے اوپر سے کھیس اتارا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ اکثر یہاں آکر سو جاتا تھا اور داجی کچھ نہیں کہتے تھے۔ جانتے تھے کہ ابھی وہ "فراق و ہجر" کے دکھ کو سنبھال نہیں پا رہا۔۔۔ ابھی اس کا آئینہ کرچی کرچی ہے۔ ابھی اس کے زخم تازہ ہیں۔۔۔ انہوں نے محسنہ سے کہہ دیا تھا۔ "بیٹی اس کی فکر نہ کیا کر۔ جلد ہی سنبھل جائے گا۔۔۔" بس وہ اطلاع بھجوا دیتے ہیں کہ مدبر حسین ان کی طرف ہے۔۔۔ کبھی وہ دو دو ہفتے نہ آتا اور کبھی ہفتہ ہفتہ یونہی داجی کے کمرے میں پڑا رہتا۔

"انکل! آپ "باماں بالا" کیوں نہیں چلے جاتے منی اور عباس کو لے کر۔۔۔"

اور سید محب اللہ شاہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"باماں بالا" کی اونچی حویلی کی قسمت میں کیا سدا ویران رہنا ہی لکھا ہے محب اللہ شاہ؟" ماں نے مرتے وقت درخواست کی تھی۔ "بیٹا! اس حویلی کو آباد کر دو۔ اور حفیظ فاطمہ کا خیال چھوڑ کر شادی کر لو۔"

لیکن کم عمر اور ضدی سی حفیظ فاطمہ کا چند ماہ کا ساتھ ان کے دل میں اس کی تصویر اتنی گہری نقش کر گیا تھا کہ ان کا جی ہی نہیں چاہتا کہ وہ حفیظ فاطمہ کی جگہ کسی اور کو دیکھیں۔۔۔ اور پھر کوثر بھی تو تھی ان کی بیٹی جسے ابھی تک انہوں نے دیکھا بھی نہ تھا۔ سو وہ ماں کے بعد "کنجن بالی" آگئے تھے۔

"کیا باماں بالا کی حویلی میں بھی کوئی کنواں ہے انکل! جہاں نیند میں چلنے والی لڑکیاں گر کر خاموش ہو جاتی ہیں۔"

مدبر حسین نے بڑی معصومیت سے پوچھا اور وہ ایک دم ہی تڑپ کر کھڑے ہو گئے۔۔۔ اور پھر اسی روز منی اور عباس کی انگلی پکڑے پکڑے سید محب اللہ شاہ نے حفیظ فاطمہ سے کہا۔

"حفیظ فاطمہ! اٹھو۔۔۔ بہت عرصہ میکے کی حویلی آباد کر لی۔ اب چلو "باماں بالا"۔"

اور حفیظ فاطمہ حیرت سے انہیں دیکھتی رہ گئی تھیں۔

"لیکن۔۔۔" انہوں نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"حفیظ فاطمہ!" انہوں نے انہیں بات پوری نہ کرنے دی۔ "میں نے چودہ سال تمہاری خواہش کے احترام میں یہاں گزار دیے ہیں۔ کیا تم میری خواہش کے احترام میں باقی کے دن وہاں نہیں گزار سکتیں؟"

"لیکن میں نے تو قسم کھائی تھی کہ اب کبھی وہاں قدم نہ رکھوں گی۔"

"قسموں کا کفارہ بھی دیا جاسکتا ہے حفیظ فاطمہ! لیکن زندگی ختم ہو جائے تو پھر پلٹ کر نہیں آتی۔ اس کا کوئی کفارہ نہیں ہے۔ میں بچوں کو لے کر جا رہا ہوں۔۔۔ چاہو تو داجی سے پوچھ کر کفارہ ادا کر دینا۔۔۔ نہ چاہو تو تمہاری مرضی۔"

ان کے لہجے کی خوفناک سنجیدگی سے ڈر کر حمزہ شاہ نے انہیں روکنا چاہا۔

"بھائی صاحب۔۔۔!"

"سوری حمزہ۔۔۔ میں اپنی بیٹی کے قاتل کے گھر میں مزید کیسے رہ سکتا ہوں۔"

اور ان کی بات پر جہاں حمزہ شاہ کا رنگ بدلا تھا' وہاں حفیظ فاطمہ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھا تھا۔ بڑی اماں تو غش کھا کر گر پڑی تھیں اور سید محب اللہ دونوں کا ہاتھ تھامے حویلی

سے نکلتے چلے گئے تھے اور انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

منی کو اپنا یہ گھر پسند آیا تھا' اس کے لان کے بڑے بڑے سرو کے درخت اور ست رنگے پانیوں والے فوارے۔۔۔

"دس سال فارغ وقت میں۔۔۔ میں حویلی کو ہی سجایا کرتا تھا۔"

ایک روز انہوں نے منی کو بتایا۔ "اور سوچتا تھا جب کبھی تمہاری ماں واپس آئے گی تو کس قدر خوش ہوگی مگر وہ کبھی نہیں آئی۔"

منی خوش تو تھی۔۔۔ یہاں جن نہیں رہتے تھے' لیکن یہاں عباس کے اور اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔۔۔ نہ انیق سلیمان' نہ زارا۔۔۔ نہ عابد نہ حبیبہ نہ بڑی اماں اور نہ اماں۔۔۔

سب سے زیادہ اسے اماں ہی یاد آتی تھیں اور اگر اماں بھی یہاں ہوتیں تو سب کے نہ ہونے کے باوجود یہ حویلی کتنی مکمل ہوتی لیکن اماں کبھی نہیں آئیں۔۔۔ بارہ سال کی عمر میں حویلی سے آنے والی منی بیس سال کی ہوگئی تھی اور لاہور یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی۔ اس سارے عرصہ میں وہ تین بار "کنجن پالی" گئی تھی۔

داجی کی وفات پر۔

تاؤجی اور پھر بڑی اماں کی وفات پر۔

بڑی اماں کی وفات پر اماں اسے بہت کمزور اور بیمار سی لگیں۔ وہ کتنی ہی دیر تک ان کے سینے سے لگی چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی۔

"مجھے محفوظ فاطمہ اور کوثر کا غم کھا رہا ہے منی۔۔۔! تمہاری اور عباس کی دوری نے اس غم کو اور بڑھا دیا ہے۔"

"اب تو بڑی اماں بھی نہیں رہیں۔ تاؤ بھی نہیں رہے۔ اب تو آپ ہمارے ساتھ چلیں۔"

لیکن محفوظ فاطمہ بس اسے دیکھتی رہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

"ساری زندگی نہیں آئی۔ اب کیسے آؤں ؟"

"بابا جان کہتے ہیں۔ قسم کا کفارہ دیا جا سکتا ہے اور کیا آپ عباس کی شادی پر بھی نہیں آئیں گی۔"

اور وہ روتی رہیں۔۔۔ اسے کتنا انتظار تھا کہ وہ عباس کی شادی پر آئیں گی لیکن وہ نہیں آئی تھیں۔

عباس کی بارات بڑی حویلی جانی تھی۔ ثمرہ سلیمان بالکل گڑیا جیسی خوبصورت تھی اور دلہن بنی ثمرہ کے پاس کھڑی اماں کو اس نے بہت شاکی نظروں سے دیکھا تھا۔

"لیلیٰ!" اماں نے پہلی بار اسے اس کے نام سے پکارا تھا۔ لیکن وہ سر جھکائے کھڑی آنسو پیتی

رہی تھی۔

تب ہی انیق سلیمان نے اس کے قریب سرگوشی کی تھی "لیلیٰ! بہت جلد تمہیں یہاں آنا ہے۔"

اور وہ انیق سلیمان کی نظروں کی تپش سے گھبرا کر اماں کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی۔

"لیلیٰ! میں نے بہت چاہا لیکن شاید اب بہت دیر ہو چکی ہے۔"

"نہیں اماں! ابھی بھی دیر نہیں ہوئی۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں نا۔"

لیکن حفیظ فاطمہ کے اندر جانے کیسی زنجیریں پڑی تھیں کہ قدم اٹھتے ہی نہ تھے۔

"باماں بالا" کی حویلی میں ثمرہ کے آنے سے رونقیں اتر آئی تھیں۔۔۔ ہر لمحہ جیسے رنگوں کی برسات ہوتی تھی۔ ثمرہ فطرتاً شوخ مزاج تھی اور عباس کے ساتھ مل کر وہ رونق لگائے رکھتے تھے لیکن ایک اماں کے نہ ہونے سے اس کا دل اندر سے بجھا رہتا تھا۔

ثمرہ "باماں بالا" کیا آئی تھی کہ انیق کی آمد بڑھ گئی تھی۔ آتا تو وہ پہلے بھی تھا لیکن اب زیادہ آنے لگا تھا اور اس کی نظریں لیلیٰ کو پیام دیتی تھیں۔۔۔ اور وہ جتنا بھی ان نظروں سے بچنے کی کوشش کرتی اتنا ہی یہ نظریں اس کا پیچھا کرتی تھیں۔۔۔ وہ جہاں جاتی وہ وہیں آ جاتا۔

"کیا ہے انیق ثمرہ کے پاس بیٹھو نا۔" وہ جھنجھلا جاتی۔

"اس کے پاس عباس ہے نا۔ میں تو تمہارے لیے آیا ہوں۔"

"لیکن مجھے محبت نہیں کرنا۔" وہ سوچتی۔

کوثر نے کہا تھا۔ "اس حویلی کی لڑکیوں کو محبت راس نہیں آتی۔"

"لیکن تم اس حویلی کی لڑکی نہیں ہو۔" انیق اسے سمجھاتا۔

"تمہارا گھر یہ ہے۔۔۔ "باماں بالا" میں۔"

اور اس نے کتنا روکا تھا خود کو' کتنا سمجھایا تھا لیکن دل کب کسی کی سنتا ہے اور کب اس نے کسی کی مانی ہے جو اس کی مان لیتا۔۔۔ وہ انیق کی شدتوں کے سامنے ہار گئی تھی۔

"مجھے ڈر لگتا ہے انیق! ہماری محبت۔"

"تم پاگل ہو منی بالکل پاگل۔۔۔! ہماری محبت میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ تم ابا کی فرسٹ کزن کی بیٹی ہو۔۔۔ میری پھپھو کی بیٹی۔"

"کوثر آپا اور رمد بھائی کا بھی تو یہی رشتہ تھا نا پھر وہ کیوں ایک نہیں ہو سکے۔"

"ان کا اور مسئلہ تھا لیلیٰ۔۔۔! ہمارے درمیان ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

نیو کیمپس کی طرف جاتے' اس کے ساتھ چلتے ہوئے اس نے تسلی دی تھی۔

وہ لاہور بھی اس سے ملنے چلا آتا تھا۔ ہر دس دن بعد وہ اس کے ہاسٹل کے وزیٹنگ روم میں

کھڑا ہوتا اور اس کی اس جنونی محبت سے وہ خوفزدہ ہو جاتی۔

"ڈرنے کی کیا بات ہے۔۔۔ یہ تو داجی کی بھی خواہش تھی اور انہوں نے مرنے سے پہلے ابو سے کہا تھا کہ منی کو اس گھر کی بہو بننا ہے اور یہ ان کی دیرینہ خواہش ہے۔۔۔ اور ابو نے وعدہ کیا تھا کہ تم اس گھر کی بہو ضرور بنو گی لیلیٰ۔"

اور وہ اپنا ماسٹرز مکمل کر کے آئی ہی تھی کہ بڑی حویلی سے اس کا رشتہ آ گیا تھا لیکن انیق کے لیے نہیں سعد سلیمان کے لیے۔

سید محب اللہ شاہ نے سوچ کر جواب دینے کا کہا تھا۔

"یہ داجی کی خواہش تھی۔" سلیمان شاہ نے انہیں یاد دلایا۔ "اور آپا کو بھی اعتراض نہیں ہے۔"

"مجھے بھی اعتراض نہیں ہے سلیمان بھائی! لیکن میں لیلیٰ سے پوچھوں گا اور پھر عباس سے بھی مشورہ کروں گا۔"

"ہاں ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔"

جب سید محب اللہ نے لیلیٰ کو سعد سلیمان کے پرپوزل کا بتایا تو اس کا رنگ یوں سفید پڑ گیا جیسے اس میں خون کا قطرہ تک نہ ہو۔

اور سید محب اللہ شاہ جو بہت سمجھ دار اور بہت پڑھے لکھے اور بہت گہری نظر رکھتے تھے یکدم چونکے تھے۔ سعد سلیمان میں کوئی خامی نہ تھی۔ خوبصورت ویل ایجوکیٹڈ اور خاندانی۔

"تمہیں اعتراض تو نہیں کوئی؟"

"نہیں۔" اس کی آواز پھنسی پھنسی تھی اور سر جھک گیا تھا۔

"پھر بھی سوچ لو۔۔۔ میں نے ابھی حتمی جواب نہیں دیا۔ عباس آ جائے تو پھر اس سے بھی مشورہ کر لوں۔ تمہاری اماں کو اعتراض نہیں۔"

لیکن عباس کے آنے سے پہلے ہی انیق چلا آیا۔ وہ لاہور سے سیدھا "باماں بالا" آیا تھا اور سعد سلیمان کے رشتے کے متعلق سن کر ہکا بکا رہ گیا۔

"نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے انکل! ام۔۔۔ میں اور لیلیٰ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔"

وہ بلا جھجک سید محب اللہ شاہ کے سامنے اپنی پسند کا اظہار کر کے ٹھہرے بنا "بڑی حویلی" چلا گیا۔ لیلیٰ سید محب اللہ شاہ سے چھپی چھپی پھرنے لگی۔ بڑی حویلی میں سلیمان شاہ نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ جس پر اس نے چھت سے کود جانے کی دھمکی دی اور اماں نے گھبرا کر اسے فون کیا۔

"یہ سب کیا ہے لیلیٰ؟" اور وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی بس روتی رہی۔ اتنا بھی نہ کہہ سکی کہ

اس سب میں اس کا قصور نہیں ہے۔۔۔ یہ انیق ہی تھا جو اس کی طرف دوڑ دوڑ کر آتا تھا اور اس نے تو خود کو محبت کے اس آزار سے بچانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن۔۔۔

سید محب اللہ شاہ نے کتنی ہی بار اس سے پوچھا تھا لیکن وہ ایک لفظ تک نہ کہہ پاتی۔ بس سر جھکائے ہونٹ کاٹتی آنسو پینے کی کوشش کرتی رہتی۔ اور سوچتی۔ کاش "باماں بالا" کی اس شاندار حویلی کے صحن میں بھی کوئی کنواں ہوتا۔

انیق کہتا "لیلیٰ! تمہارے بابا جان تم سے بہت محبت کرتے ہیں کہہ دو ان سے سب کچھ۔"

سعد سلیمان فون کرتے۔۔۔ "کیا تم بھی انیق کو پسند کرتی ہو لیلیٰ۔۔۔" یہی سوال اماں نے کئی بار پوچھا لیکن اس کے لب تو جیسے سِل گئے تھے۔ تب سید محب اللہ شاہ نے فیصلہ کیا اور بڑی حویلی فون کر کے کہہ دیا کہ انہیں لیلیٰ کے لیے انیق سلیمان کا رشتہ قبول ہے۔

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟" سلیمان شاہ نے کہا۔

"کیوں ممکن نہیں ہے دونوں آپ کے بیٹے ہیں۔"

"مگر سعد بڑا ہے۔"

"دو سال کی بڑائی چھوٹائی سے کیا فرق پڑتا اور تم بے شک پہلے سعد کی شادی کر دو۔"

"لیکن انیق کے لیے اس کی ماں کی خواہش اپنی بھانجی کے لیے تھی۔"

سلیمان شاہ متذبذب تھے لیکن پھر جانے اماں نے انہیں قائل کیا تھا یا انیق کی دھمکیاں کام کر گئی تھیں یا مدبر حسین کی زندگی سے بیزاری دیکھ کر سلیمان شاہ نے سوچا تھا کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ انیق اور سعد دونوں ان ہی کے تو بیٹے ہیں' وہ "باماں بالا" چلے آئے اور اب کی بار انیق سلیمان کے نام کی انگوٹھی اس کی انگلی میں سج گئی اور اس کے چہرے پر کھلتے رنگ دیکھ کر محب اللہ شاہ نے سوچا۔

"شکر خدا کا میں نے ایک صحیح فیصلہ کر کے اپنی لیلیٰ کی زندگی بچا لی۔"

اور منگنی کے صرف ایک ہفتے بعد سرخ حویلی سے اماں کا فون آ گیا۔ رات کا کوئی ایک بجا تھا جب سید محب اللہ شاہ گھبرائے ہوئے سے اپنے کمرے سے نکلے اور لیلیٰ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"لیلیٰ!" ان کی آواز جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھی۔

"لیلیٰ۔۔۔! منی! تمہاری اماں کا فون آیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ میں ابھی آ کر انہیں "باماں بالا" لے آؤں۔ انہوں نے قسم توڑ دی ہے منی۔"

پتا نہیں کیوں اس کا دل ڈوب سا گیا تھا۔

"بابا جان! میں بھی چلوں آپ کے ساتھ۔"

"نہیں بھلا تم کیا کرو گی۔"

اور پھر کچھ سوچ کر اسے بھی ساتھ چلنے کا اشارہ کیا تو وہ چادر لپیٹتی ان کے پیچھے بھاگتی چلی آئی اور جب تین گھنٹے کا سفر کر کے صبح پانچ بجے وہ حویلی پہنچے تو ڈاکٹر حویلی کے گیٹ سے باہر آ رہا تھا اور دبیر حسین اس کے ساتھ تھے۔

"دل ٹھیک سے کام نہیں کر رہا۔" اس نے سید محب اللہ شاہ کو بتایا۔ "بار بار ہارٹ بیٹ مس ہو رہی ہے' آپ آ گئے ہیں تو اچھا ہے انہیں لاہور کارڈیالوجی میں لے جائیں۔"

وہ حویلی کے خاندانی ڈاکٹر تھے۔

"کون کس کا دل ٹھیک کام نہیں کر رہا۔" سید محب اللہ نے بے قراری سے پوچھا۔

"حفیظ بی بی کا۔"

اور اس نے تقریباً دوڑتے ہوئے حویلی کا صحن پار کیا تھا اور برآمدہ عبور کر کے اماں کے کمرے میں چلی گئی۔ اماں تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں اسے دیکھ کر حیران ہوئیں۔ بازو پھیلائے۔

"منی! تمہارے بابا جان......"

"وہ میرے ساتھ آئے ہیں اور ڈاکٹر صاحب سے بات کر رہے ہیں۔" لیلیٰ نے بتایا اور تب ہی محب اللہ شاہ اندر داخل ہوئے۔

"حفیظ فاطمہ......!" ان کی آواز میں بے قراری تھی۔ "آپ نے اتنی دیر کیوں کی؟"

"نہیں۔ بہت دیر تو نہیں ہوئی ابھی۔" وہ مسکرائیں اور لیلیٰ کو زندگی میں پہلی بار لگا کہ اماں کی مسکراہٹ کتنی خوبصورت ہے۔

"چلیں۔" انہوں نے محب اللہ شاہ کی طرف دیکھا۔

"ابھی۔" محب اللہ شاہ نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے تو رات ہی ضروری سامان پیک کر لیا تھا۔"

"آپ کی طبیعت کب سے خراب ہے؟" اگلا سوال تھا۔

"چھوٹی موٹی بیماری تو اب عمر کا حصہ ہے۔" وہ پھر مسکرائی تھیں اور بیڈ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

"عباس آ گیا کراچی سے؟"

"نہیں دس بارہ دن تک آئے گا' وہ تو منگنی کی شام ہی چلا گیا تھا واپس اور ثمو بھی۔"

"چلیں پھر......"

"اب قسم توڑی ہے تو ایک منٹ کی دیر بھی منظور نہیں۔" محب اللہ ہنسے۔ "دو منٹ رکو۔ ذرا فریش ہو کر ایک کپ چائے پی لوں۔"

"اچھا!"

وہ دوبارہ بیٹھ گئیں۔ تب ہی دبیر حسین آ گیا دوائیں لے کر۔

"پھپھو! یہ دوائیں ہیں۔" اس نے ٹیبل پر دوائیں رکھیں۔

"اور آپ پلیز لیٹ جائیں پھپھو! ڈاکٹر نے ریسٹ کا کہا ہے۔"

اور پھر وہ ان کی بیماری کی تفصیل بتانے لگا کہ کیسے اچانک ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی' رات ایک بجے کے بعد محب اللہ اٹھ کر واش روم میں گئے تو دبیر حسین بھی اٹھ گیا۔

"اچھا پھپھو! میں نماز پڑھ لوں پھر ابا جان وغیرہ کو بھی بتاؤں۔"

وہ لیلیٰ کی طرف مڑا۔

"میری تو اچانک ہی آنکھ کھل گئی تھی اور پھر پھپھو نے منع کر دیا سب کو جگانے سے۔ اور تم لوگ رکو گے نا کچھ دن۔"

"نہیں ہم ابھی چلے جائیں گے اماں کو لے کر۔"

لیلیٰ کی نظر اچانک ہی حفیظ فاطمہ پر پڑی تھی جن کا رنگ اچانک خطرناک حد تک زرد پڑ گیا تھا اور وہ ہولے ہولے سینے کو مسل رہی تھیں۔

"اماں!" انہوں نے پتھرائی آنکھوں سے اسے دیکھا پھر ان کی نظریں واش روم کی طرف اٹھیں اور لیلیٰ نے واش روم کا دروازہ پیٹ ڈالا۔

"بابا جان...... بابا جان اماں......!"

دبیر حسین' حفیظ فاطمہ کو سنبھال رہے تھے۔

محب اللہ شاہ واش روم سے گھبرائے ہوئے باہر نکلے تھے۔

"آپ پلیز مجھے معاف کر دیجیے گا۔" انہوں نے ہاتھ جوڑ دیے۔

"کیا کر رہی ہو حفیظ فاطمہ! میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہوا۔" انہوں نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"پھر بھی کہہ دیجیے نا۔"

"چلو میں نے تمہیں معاف کیا لیکن معافی سے کام نہیں چلے گا تمہیں "باماں بالا" آنا ہے حفیظ۔"

"ہاں مجھے "باماں بالا" لے جائیے گا۔ میں مر بھی گئی تب بھی۔"

"اماں!" وہ رونے لگی "ایسا مت کہیں۔"

انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"یہاں بڑی حویلی میں کھچڑی پک رہی ہے۔ سعد ناراض ہے اور بھابھی اسے سعد کی بے

عزتی سمجھ رہی ہیں لیکن آپ میری بیٹی کو انیق کے ساتھ ہی بیاہنا۔ چاہے کتنا ہی دباؤ کیوں نہ پڑے۔۔۔۔ آپ جانتے ہیں نا انیق اور منی۔۔۔۔"

پھر انہوں نے ہاتھ اونچا کر کے اس کے آنسو پونچھنے چاہے مگر ان کا ہاتھ نیچے گر گیا۔

"اماں۔۔۔۔ اماں پلیز! ایسا نہ کریں۔"

وہ زور زور سے چیخنے لگی۔۔۔۔ لیکن محب اللہ نے ان کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

اور دو گھنٹے بعد وہ اماں کو لے کر "باماں بالا" جا رہے تھے۔ ایک بار پہلے بھی وہ "باماں بالا" رخصت ہوئی تھیں مگر تب پھولوں سے سجی گاڑی تھی' گو آج بھی ڈھیروں پھول سرخ حویلی والوں نے ان پر ڈالے تھے لیکن آج وہ ایمبولینس میں تھیں۔ آنکھیں بند کیے پُرسکون سی اور ایمبولینس کے پیچھے گاڑیوں کا ایک قافلہ تھا۔

سعد سلیمان اور اس کی امی کے سوا سب ہی "باماں بالا" آئے تھے۔۔۔۔ اور اس بات کو سعد سلیمان نے ہی نہیں انیق سلیمان نے بھی شدت سے محسوس کیا تھا۔

تب ہی تو اگلے ماہ جب انیق کو ہالینڈ میں آئی۔ٹی میں ایڈمیشن اور اسکالرشپ کی اطلاع ملی تو اس نے ضد کی کہ وہ جانے سے پہلے لیلیٰ سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔

سید محب اللہ جو بڑی حویلی والوں کے تیور دیکھ رہے تھے' انہوں نے انیق کی بات مان لی اور اماں کے چالیسویں کے بعد بڑی خاموشی کے ساتھ انیق سلیمان کے ساتھ اس کا نکاح کر دیا۔ چھوٹی حویلی اور سرخ حویلی سے تو سب ہی آئے تھے ہاں بڑی حویلی سے انیق سلیمان کے ساتھ صرف سلیمان شاہ آئے تھے۔ اس یقین کے ساتھ کہ رخصتی تک سب ٹھیک ہو جائے گا۔

لیکن محب اللہ شاہ کو جانے کیا وہم تھا کہ انہوں نے چھ ماہ بعد اس کا بھی آئی۔ایچ۔ای میں ایڈمیشن کروا دیا تھا۔

"اچھا ہے دونوں ایک ہی ملک میں ہوں گے۔ انیق تمہاری خبر لیتا رہے گا۔"

اور یہ تو بعد میں اسے پتا چلا تھا کہ یہ انیق کی ضد تھی۔۔۔۔ وہ رخصتی چاہتا تھا جبکہ سلیمان شاہ مجبور تھے کہ جب تک سعد سلیمان شادی کے لیے رضامند نہیں ہوتا انیق کی رخصتی نہیں ہو سکتی۔

اور انیق سلیمان اس کے ڈیلف آنے پر کتنا خوش تھا۔۔۔۔ اس کا بس چلتا تو وہ ہر روز ہی اس کے پاس بھاگا چلا آتا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا لیلیٰ؟"

لنہ عبداللطیف نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے آنسوؤں سے تر چہرہ اوپر اٹھایا اور

پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"ہاں۔ سر میں درد تھا۔" اس نے چہرہ دوپٹے سے پونچھا۔

"لیلیٰ! تم جھوٹ بول رہی ہو نا۔" لنہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

"تم اپنے فیانسی کے لیے اداس ہو۔ وہ نہیں آیا نا بہت دنوں سے۔"

وہ خاموش رہی۔

"کیا تم اس سے بہت محبت کرتی ہو لیلیٰ؟"

"پتا نہیں محبت کی صحیح تعریف کیا ہے۔"

اس نے سوچا۔۔۔۔ اور شاید وہ انیق سے محبت کرتی ہے اس لیے اُداس ہے۔۔۔۔ لیکن جب انیق آتا تھا ہر اتوار کو تب بھی وہ یوں ہی اداس رہتی تھی۔ اگر محبت ہی سب کچھ ہوتی ہے تو پھر وہ کیوں اداس رہتی تھی۔۔۔۔ کیوں اسے "باماں بالا" کے قبرستان میں سوئی اماں یاد آتی تھیں۔ بابا جان یاد آتے تھے' کوثر آپا یاد آتی تھیں۔

"کیا سب لوگ چلے گئے ایمسٹرڈیم میوزیم دیکھنے۔"

"نہیں۔" لنہ نے محسوس کیا کہ وہ اس کے سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی تو اس نے اپنا سوال نہیں دہرایا اور بتانے لگی کہ "جگدیش اور ریتا چونکہ ایجنسی چلے گئے تھے۔ اس لیے پروگرام رہ گیا۔ اکرم سلطانہ بھی مونی کے ساتھ چلی گئی ہے کہیں۔"

"اکرم ہمیں بہت یاد آئے گی۔۔۔۔" لیلیٰ نے آہستگی سے کہا۔

"ہاں۔۔۔۔ وہ بہت پیاری نیچر کی اور محبت کرنے والی ہے۔" لنہ نے اس کی تائید کی۔

"اور مجھے اکرم سلطانہ کا دکھ ہے بہت۔ ابھی مزید جانے کب تک وہ بچیوں سے نہیں مل سکے گی۔ اس دکھ نے اسے کچھ عجیب سا کر دیا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر رونے لگتی ہے۔ صبح چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا تو رونے لگی۔"

"ہاں!" لیلیٰ کو بھی دکھ ہوا تھا بہت یہ سن کر کہ مونی نے ڈن ہیگ میں کسی کمپنی میں جاب کر لی ہے اور اکرم سلطانہ نے بھی اور وہ چار سال تک واپس جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔۔۔۔ ان کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی اور وہ ایک دو روز میں ڈن ہیگ جا رہے تھے۔ سب نے ہی انہیں گفٹ دیے تھے اور دعوتیں دی تھیں' کیتھی اور لنڈا چھٹیاں گزارنے فرانس گئی ہوئی تھیں۔

"میرا خیال تھا تم اس بار چھٹیوں میں انیق کے ساتھ کہیں جاؤ گی گھومنے۔"

لنہ کو اس کی افسردگی کھل رہی تھی۔

"میرا موڈ نہیں تھا۔"

وہ لنہ کو نہیں بتانا چاہتی تھی کہ انیق نے تو پچھلے چند ماہ سے اس کی خبر نہیں لی۔ فون تک نہیں کیا۔

"اچھا چلو، انکل قیس کے گھر چلتے ہیں۔" اس نے تجویز پیش کی۔

"چلو۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ڈریسنگ ٹیبل سے برش اٹھایا تب ہی کیتھی اندر داخل ہوئی۔

"ہیلو کیتھی! تم لوگ آ گئے؟" لنہ نے اس کو خوش آمدید کہا۔

"ہاں کوئی گھنٹہ بھر پہلے۔۔۔ اور لیلیٰ۔۔۔ لیلیٰ۔" اس نے لیلیٰ کے مڑنے پر جوش سے کہا۔

"وہ تمہارا افیانسی انیق وہ فرانس میں ایک بہت خوبصورت لڑکی کے ساتھ اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا جس میں ہم اور اس نے ہم سے ہیلو ہائے بھی کیا تھا۔۔۔ وہ لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ لیلیٰ! لیکن تم سے زیادہ نہیں اور مشرق میں تو وفا کا ایک خاص تصور ہے پھر انیق تم سے بے وفائی کیوں کر رہا ہے۔ اوہ گاڈ لیلیٰ! انیق کے ساتھ اسے دیکھ کر مجھے تمہارا خیال آتا رہا بار بار تب ہی تو اپنے کمرے میں سامان رکھتے ہی میں تمہاری طرف دوڑی چلی آئی۔"

برش لیلیٰ کے ہاتھ سے گر پڑا تو لنہ نے چونک کر لیلیٰ کو دیکھا اور تیزی سے اس کی طرف لپکی۔

"آر یو رائٹ لیلیٰ۔"

"یس آئی۔ ایم۔۔۔" لیلیٰ بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"تم بہت پیاری ہو لیلیٰ! اکرم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارے ہاں شادی بیاہ کے فیصلے والدین کرتے ہیں۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیلیٰ۔۔۔! تمہارے والدین تمہارے لیے یقیناً" کوئی اور بہت اچھا لڑکا تلاش کر لیں گے۔ اداس نہیں ہونا پلیز۔ میں تھکی ہوئی ہوں۔ ریسٹ کروں گی کچھ دیر۔"

کیتھی اس کا گال تھپتھپا کر اسے تسلی دے کر چلی گئی۔

"کیتھی کو کیا پتا کہ وہ صرف میرا فیانسی نہیں ہے میں اس کی منکوحہ بھی ہوں۔"

"شدید درد نے اس کے دل میں پنجے گاڑ دیے لیکن وہ حیرت انگیز سکون کے ساتھ بیٹھی رہی۔

"لیلیٰ! انیق آخری بار کب ملنے آیا تھا تم سے؟" لنہ نے اچانک پوچھا۔

"پتا نہیں۔۔۔ شاید اس روز جب ہم تمہاری شادی کے لیے شاپنگ کرنے گئے تھے۔"

"اور اتنا عرصہ گزر گیا تم نے اس سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟" لنہ کو حیرت ہوئی۔ "اور مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ انیق نہیں آ رہا۔ میں تو اپنے ہی غم میں الجھی ہوئی تھی۔"

"کیا تھا۔۔۔ عبدالحئی کا بتایا تھا فون پر اسے۔۔۔ کہہ رہا تھا۔ لنہ کے پاس آؤں گا۔"

"پھر۔۔۔" لنہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"پھر نہیں آیا۔۔۔ کئی بار فون کیا ملا ہی نہیں۔ میسج بھی ریکارڈ کروایا۔۔۔ پھر ایک بار اس کے دوست نے بتایا۔ وہ کچھ دوستوں کے ساتھ چھٹیاں گزارنے چلا گیا ہے۔"

"آ جائے تو بات کرنا اس سے بلکہ لڑنا۔" لنہ مسکرائی۔ "دراصل یہاں ترغیب بہت ہے۔ مرد کے لیے خود کو بچانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔۔۔ پھر بھی آئی ہوپ کہ اسے تم سے کوئی چھین نہیں سکتا۔ میں نے ہمیشہ اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے جو محبت دیکھی ہے لیلیٰ! وہ محبت ختم ہونے والی نہیں ہوتی۔ وہ لوٹ کر تمہاری طرف ہی آئے گا۔ ہو سکتا ہے وہ یہاں کے رنگ میں رنگ گیا ہو وقتی طور پر۔"

لنہ نے خیال ظاہر کیا۔

"اسے کیا پتا کہ ہماری حویلی کی لڑکیوں کو محبت راس نہیں آتی۔۔۔ کوثر آپا نے کہا تھا اور میں نے سوچا تھا۔ مجھے محبت راس آ گئی ہے کیونکہ میں تو "بالاں بالا" میں رہتی ہوں۔"

"کم آن لیلیٰ! آؤ۔ ہم انکل قیس کی طرف جا رہے تھے اور وہاں اپنا نائٹ ڈریس لے لو۔ رات وہاں ہی رک جائیں گے۔"

"نہیں لنہ! رات واپس آ جائیں گے۔ اکرم سلطانہ کی یہ آخری رات ہے ہمارے ساتھ۔ کل صبح تو وہ چلی جائے گی نا۔"

"اوہ ہاں۔ ٹھیک ہے۔"

"اور لیلیٰ لنہ کے ساتھ انکل قیس کی طرف چلی گئی۔۔۔ بظاہر وہ لنہ کی ہر بات کا جواب دے رہی تھی۔۔۔ لیکن اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ وہ مسلسل انیق سلیمان اور محبت کے متعلق سوچ رہی تھی۔

انکل قیس کے ہاں پاکستان سے کچھ لوگ تبلیغ کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے' ان کا اسلام کے متعلق بیان اور قرآنی تعلیم کا سبق بہت پر اثر تھا۔ لیلیٰ وقتی طور پر سب بھول گئی۔۔۔ پہلی بار اسے کیتھی کی بات سچ لگی کہ وہ بہت لکی ہے۔

ہاں وہ بہت لکی ہے کہ وہ مسلم ہے۔ اور اس کے دل میں خدا اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت موجود ہے۔

عصر کی نماز پڑھ کر جب وہ واپس آئی تو پہلے کی طرح بے چین نہ تھی وہ سیدھی اکرم سلطانہ کے کمرے میں گئی تھیں اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ کمرے میں اس کا سامان پیک کیا رکھا

تھااور وہ ستے ہوئے چہرے کے ساتھ بیٹھی تھی۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں؟"

"ہم انکل قیس کی طرف گئے تھے۔" لنہ نے بتایا۔

"اگر تمہیں صبح جانا نہ ہوتا تو ہم وہیں رک جاتے۔ کچھ لوگ پاکستان سے آئے ہوئے تھے۔۔۔۔ ان کی باتیں سننا بہت اچھا لگا۔ رات کو انہیں جہاد کے متعلق اسلام کی تعلیمات کی وضاحت کرنا تھی۔" لنہ نے بتایا۔

"مجھے پتا ہوتا تو میں تمہارے ساتھ چلتی۔"

"تم لوگ کہاں گئے تھے؟"

"بس اچانک ہی مونی نے کہا اس کے ساتھ چلوں کیونکہ ان میں سے کسی سے ملنا تھا اور Tahp بھی گئے۔۔۔۔ مائی گاڈ۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "وہاں عورتیں شیشے کے بکسوں میں کھڑی تھیں اپنے جسم کی نمائش کرتی۔ میں نے مونی سے کہا۔۔۔۔ یہیں سے گاڑی موڑ لو۔ واپس چلو۔۔۔۔ عورت کی اتنی ناقدری' اتنی بے حرمتی۔۔۔۔ ارے ظالمو! عورت تو چھپانے کی چیز ہے۔ سیپ میں بند موتی کی طرح سب کی غلیظ نظروں سے۔۔۔۔ مگر وہاں تو وہاں تو لنہ۔۔۔۔"

آنسو اکرم سلطانہ کی آنکھوں میں اتر آئے۔

"ہم عورتوں کو تو۔۔۔۔ ساری دنیا کی عورتوں کو جن میں حیا ہے اس بے حیائی اور اپنی اس بے حرمتی پر مرجانا چاہیے۔ اجتماعی خودکشی کر لینی چاہیے۔ یہ۔۔۔ یہ کیا ہے کیتھی کے اس مغرب میں لنہ عورت کی یہ بے حرمتی۔"

وہ رونے لگی۔

"ان کو کوئی منع نہیں کرتا۔۔۔۔ ان کو کوئی نہیں روکتا اپنی اس نمائش سے۔۔۔۔ ہائے لیلیٰ کیسا ظالم معاشرہ ہے اور کیسے ظالم لوگ ہیں۔"

وہ یکدم لیلیٰ کے گلے آ لگی اور لیلیٰ انہیں ہولے ہولے تھپکنے لگی۔

♥ ♡ ♡ ♥

وقت کبھی ٹھہرتا نہیں آگے ہی آگے بھاگتا چلا جاتا ہے اور گزرتا وقت اپنے ساتھ بہت ساری تبدیلیاں بھی لاتا ہے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ گھرانوں کی روایات اور طور طریقے بھی بدلتے رہتے ہیں لیکن "کنجن پالی" میں شاہوں کی حویلی کے طور طریقے اور روایات نہیں بدلیں۔

سید دیدار حسین شاہ' اقتدار حسین شاہ چلے گئے' بڑی اماں رخصت ہوئیں اور ان کے پیچھے

حفیظ فاطمہ اور حفیظ فاطمہ کے بعد حمزہ شاہ بھی دل پر بہت سارا بوجھ لیے دنیا سے رخصت ہوئے اور ان کی وفات کے دس سال بعد بھی حویلیوں کی روایات وہی تھیں۔

اور مدبر حسین داجی کے بڑے کمرے میں بیٹھے سوچتے رہتے ہیں اور داجی کہیں سے اس کے کانوں میں سرگوشی کرتے ہیں۔

"عقیدۂ محبت سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے مدبر حسین۔"

مدبر حسین' شاہ لطیف کی کوئی کتاب اٹھا کر پڑھنے لگتے ہیں۔ لیکن انہیں شاہ عبداللطیف کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ پھر بھی وہ پڑھتے رہتے ہیں' بڑھتے رہتے ہیں۔

"اے میرے محبوب تیرے دیدار کا پیان لیے میں جیسے ہی دریا کے حوالے ہوتی ہوں تو دریا کی طغیانی میری الفت کو اور بھی وسعت دے دیتی ہے لیکن میری پیاس بڑھ جاتی ہے۔"

وہ پڑھتے پڑھتے تھک کر کتاب بند کر دیتے ہیں۔ حلق میں کانٹے پڑ جاتے ہیں اور پورا وجود کسی ان دیکھی آگ سے دہک اٹھتا ہے تو وہ ہمیشہ کی طرح داجی کے کمرے کا دروازہ کھول کر پیچھے دیکھے بنا تیزی سے بڑی حویلی کے برآمدے اور صحن کو پار کرتے گیٹ سے باہر نکل جاتے ہیں اور پھر "کنجن پالی" کی اونچی نیچی گلیوں میں دیوانہ وار چکراتے پھرتے ہیں کچھ لوگ کہتے ہیں۔۔۔۔ مدبر حسین کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔

کچھ کہتے ہیں کہ اس نے کوئی چلہ کاٹا تھا جو الٹ گیا۔۔۔۔ اور چھوٹی حویلی والے سمجھتے ہیں کہ کوثر شاہ کی محبت اور جدائی سے مدبر حسین کا دماغی توازن خراب ہو گیا ہے۔

پھر بھی جب وہ باہر نکلتے ہیں تو لوگ احتراماً ان کا راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔۔۔۔ بڑی حویلی میں جاتے ہیں تو ملازم مودب ہو جاتے ہیں۔ داجی کا کمرہ ان کے لیے مخصوص ہو چکا ہے اور کبھی کبھی وہ ہفتہ ہفتہ چھوٹی حویلی سے باہر نہیں نکلتے اور بڑی بڑی کتابیں پڑھتے رہتے ہیں۔ حدیث کی' فقہ کی تفسیر کی۔

اور محسنہ نقوی کے اندر ایک امید کا دیا سا جل اٹھتا ہے اور وقتاً فوقتاً ان کے کمرے میں جا کر ہولے ہولے پوچھتی رہتی ہیں۔

"مدبر پتر! تو کہے تو۔۔۔۔ تو راضی ہو تو۔۔۔ تیرے لیے لڑکی دیکھوں۔"

مگر وہ کچھ نہیں کہتے اور جب ان کی خاموشی سے شہہ پا کر محسنہ نقوی کا تقاضا بڑھ جاتا ہے تو وہ یکدم اٹھتے ہیں اور تیز تیز قدموں سے بڑی حویلی کی طرف چل پڑتے ہیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

Leda marry سے شاپنگ کر کے وہ باہر نکلی تو کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ

رکھا۔وہ مڑی۔
"ارے لنہ عبداللطیف تم۔"
وہ یکدم ہی اس کے گلے لگ گئی۔
لنہ بالکل ویسی ہی تھی' دس سال پہلے کی طرح سیاہ اسکارف میں اس کے بال چھپے تھے اور وہ ایک لمبا میکسی نما لبادہ پہنے تھی۔ اسے پہچاننے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگا تھا۔
"کیسی ہو تم لیلیٰ۔۔۔۔ اور کیا تم ڈیلف میں ہی رہتی ہو؟" اس نے دونوں سوال ایک ساتھ کیے۔
لیلیٰ مسکرادی۔
"نہیں۔۔۔۔ میں آج ہی آئی تھی اور شام کو واپس جا رہی ہوں۔ میں اپنی کمپنی کے کام سے آئی تھی۔ کیا تم یہاں آئی مین اسی ملک میں ہو۔"
"ہاں۔۔۔!" لیلیٰ نے اثبات میں سرہلایا۔ "تم کیسی ہو۔۔۔۔ کب آئیں ڈیلف؟"
"میں تقریباً" دو ہفتے قبل ڈیلف آئی تھی۔ انکل قیس کے ہاں ٹھہری ہوں اور تین چار روز میں چلی جاؤں گی۔"
"انیق کیسا ہے؟"
"پتا نہیں۔" لیلیٰ مسکرائی۔
"کیا مطلب؟" لنہ نے آنکھیں پھاڑیں۔
"کیا تم انیق کے ساتھ نہیں رہتیں؟"
"نہیں۔" لیلیٰ کی آنکھوں میں دھند چھا گئی۔
"کیوں۔۔۔۔ کیوں پلیز مجھے بتاؤ۔"
لنہ دس سال بعد بھی اس کے لیے اپنے دل میں ویسی ہی محبت رکھتی تھی۔ دس سال پہلے وہ خود آئی۔ٹی میں جا کر انیق سے ملی تھی۔
"تمہیں پتا ہے انیق! لیلیٰ تمہارے لیے کتنی پریشان ہے۔"
"سوری لنہ! میں ذرا مصروف تھا۔ تمہارے پاس بھی نہیں آسکا مجھے عبدالحیٔ کا بہت دکھ ہے۔"
"میرا چھوڑو انیق! لیلیٰ کی خبر لو۔ وہ ہر وقت روتی رہتی ہے۔ گو اپنے آنسو مجھ سے چھپاتی ہے۔"
"پاگل ہے وہ۔۔۔ میں یہاں اسٹڈی کے لیے آیا ہوں۔ اب ہر وقت تو۔۔۔۔"
"تمہاری اسٹڈی اور مصروفیات کیتھی نے بتائی تھیں۔"

"اوہ آئی سی۔۔۔۔" وہ زور سے ہنسا تھا۔ "مجھے پتا تھا کہ کیتھی ضرور بتائے گی لیکن لنہ عبداللطیف! ہم صرف دوست ہیں۔۔۔۔ میں فرانس جانا چاہتا تھا اور مجھے پتا تھا لیلیٰ ہرگز میرے ساتھ نہیں جائے گی تو جسٹ فار کمپنی میں نینسی کے ساتھ چلا گیا۔ اسے بھی جانا تھا یوں ہم نے شیئر کرلیا اور میرا خرچ کم ہوا۔"
"لیکن انیق سلیمان! وہ تمہاری فیانسی ہے' تم نے اسے بتایا تک نہیں کہ تم جا رہے ہو۔" وہ مسلسل لیلیٰ کی وکالت کر رہی تھی۔
"وہ صرف میری فیانسی ہی نہیں ہے لنہ عبداللطیف۔۔۔۔! وہ میری منکوحہ بھی ہے اور اس سے کہو کہ ہمارا رشتہ اتنا کمزور نہیں کہ ٹوٹ سکے۔"
"کوئی بھی رشتہ اتنا مضبوط نہیں ہوتا لنہ! کہ نہ ٹوٹ سکے۔"
ریسٹورنٹ میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے لیلیٰ نے لنہ کے استفسار پر بتایا۔ وہ لنہ کے اصرار پر اور خود اس کا اپنا بھی دل چاہ رہا تھا کہ اتنے سالوں بعد وہ ملے ہیں تو کچھ دیر مل بیٹھیں۔ اس ریسٹورنٹ میں آکر بیٹھی تھیں۔
"مگر کب لیلیٰ؟" لنہ نے اپنے سامنے رکھا کافی کا کپ اٹھایا۔
"جب تم آئی۔ٹی گئی تھیں اس سے ایک ماہ بعد انیق نے مجھے طلاق دے کر نینسی سے شادی کرلی تھی۔"
"اور تم نے بتایا تک نہیں۔" لنہ نے شکوہ کیا۔
"تمہارا سمسٹر چل رہا تھا۔ میں نے سوچا یونہی تم پریشان ہوگی۔"
"اور تم نے اکیلے۔۔۔۔ لیلیٰ اتنا بڑا دکھ سہا۔"
لیلیٰ خاموشی سے کافی کی چسکیاں لیتی رہی۔
"وہ نینسی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔ اور مجھے بھی طلاق نہیں دینا چاہتا تھا لیکن لنہ! میں نے کہا جب اسے نینسی سے شادی کرنا ہے تو پھر اس نام نہاد بندھن کا فائدہ۔۔۔۔"
"تم پاکستان نہیں گئیں۔"
لنہ نے جو ابھی تک اس کی طلاق کے صدمے میں تھی' چونک کر پوچھا۔
"نہیں۔"
"اور شادی بھی نہیں کی؟"
"نہیں۔"
"تم ایک بار بھی پاکستان نہیں گئیں؟" لنہ نے پوچھا۔
"میں بابا جان کو دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے انیق کو منع کردیا تھا کہ وہ اس کے متعلق

کسی کو نہ بتائے اور میں نے بھی بابا جان سے ہی کہا کہ ہم یہاں ہی سیٹل ہو رہے ہیں۔"
"اور کیا ابھی تک تمہارے بابا جان کو نہیں پتا کہ تم انیق کے ساتھ نہیں تنہا رہ رہی ہو۔"
"نہیں' لاسٹ ایئر انیق اور نینسی پاکستان گئے تھے اور انیق "باماں بالا" بھی گیا تھا' شمو سے ملنے پھر بابا جان نے مجھے فون کیا تھا اور وہ بہت روئے تھے انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں پاکستان لوٹ آؤں۔ لیکن میری ہمت ہی نہیں پڑتی لنہ۔۔۔! مجھے لگتا ہے جیسے میں نے جو اپنے آپ کو اتنا سنبھال سنبھال کر رکھا' پاکستان کی زمین پر قدم رکھتے ہی کرچی کرچی ہو جاؤں گی۔۔۔ بکھر جاؤں گی۔ جیسے کوئی کسی اپنے کو دیکھے تو برسوں کے رکے آنسو بہہ نکلیں۔"
لنہ نے آہستگی سے ٹیبل پر رکھے اس کے نازک نازک سفید ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا۔
"یہاں تم اندر سے ٹوٹ رہی ہو اور جیسا تم نے خود کو سنبھال کر رکھا ہے نا۔۔۔ وہ تو نظر آ رہا ہے۔ پتا ہے میں نے تمہیں کافی دیر بعد پہچانا۔ تم مانوس سی لگی تھیں لیکن تمہارا رنگ پہلے جیسا فیئر نہیں رہا اور تم بہت کمزور ہو گئی ہو لیکن جب تم نے آنکھیں اٹھائیں اور سیلز گرل کی کسی بات پر مسکرائیں تو میں نے تمہیں پہچان لیا۔ تمہاری آنکھوں میں وہی مقناطیسیت ہے۔ جو مجھے حیران کرتی تھی۔ اور تمہارے گالوں کے گڑھے اب بھی ذرا سی مسکراہٹ سے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ لیلیٰ! تم پاکستان چلی جاؤ۔۔۔"
لیلیٰ نے ایک نظر اسے دیکھا اور مسکرائی۔
"سوچوں گی لیکن تم کیا کر رہی ہو۔ شادی کی۔۔۔ بچے ہیں۔۔؟"
"نہیں۔ میں نے بھی شادی نہیں کی لیلیٰ۔۔۔ عبدالحئی کے بعد کوئی نظر کو جچا ہی نہیں لیلیٰ۔ بس ایک خیال ہمیشہ رہا کہ مجھے بھی کچھ کرنا چاہیے اس آزادی کے لیے جس کی خاطر عبدالحئی نے ایک قدم اٹھایا تھا۔۔۔ اور تمہیں پتا ہے لیلیٰ۔۔۔! تم اخبار پڑھتی ہو نا۔۔۔ آج سے دس سال پہلے عبدالحئی اور اس جیسے کچھ سرپھروں نے اپنے جسموں کے ساتھ بم باندھ کر چند اسرائیلیوں کا خاتمہ کیا تھا۔۔۔ اور اب دس گیارہ سال بعد پھر بہت سارے لوگ عبدالحئی کی طرح سوچنے لگے ہیں لیلیٰ۔ شاید ان کے پاس اور کوئی رستہ نہیں رہا۔ اور شاید وہ بھی سوچتے ہیں کہ وہ آزادی کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تو۔۔۔ آزادی کی راہ میں ایک قدم ہی سہی۔"
لنہ کی آنکھوں میں جانے کیسی چمک تھی کہ لیلیٰ نے دہل کر اسے دیکھا۔
"لنہ تم۔۔۔!"
"ہاں۔۔۔" لنہ نے اثبات میں سر ہلایا۔
"میں نے فیصلہ کیا ہے لیلیٰ کہ میں اپنے وطن کی آزادی کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تو کیوں نہ عبدالحئی کی طرح آزادی کی راہ میں ایک قدم اٹھالوں شاید یہ ایک قدم آزادی کا پیش خیمہ بن

جائے۔"
"لنہ!" آنسوؤں نے لیلیٰ کا حلق سی لیا۔
کتنے سارے دنوں سے وہ اخباروں میں ان خود کش حملوں کے متعلق پڑھ رہی تھی۔
"لیکن یہ لنہ یہ۔۔۔ خود کشی۔۔۔"
"پتا نہیں لیلیٰ! یہ خود کشی ہے یا شہادت۔۔۔ اس کا فیصلہ تو اللہ کرے گا۔" لنہ نے جیسے اس کے دل کی بات جان لی۔ "میں انکل قیس اور خالہ سے ملنے آئی تھی۔"
"انہوں نے تمہیں روکا نہیں لنہ!"
آنسو لیلیٰ کے رخساروں پر پھیل آئے۔
"نہیں۔۔۔ ہم اسے شہادت کہتے ہیں اور شہید مرا نہیں کرتے۔۔۔ شہادت کی موت نصیب والوں کے حصے میں آتی ہے۔"
لنہ کھڑی ہو گئی۔ لیلیٰ نے بل پے کیا اور لنہ نے بہت گرم جوشی اور محبت سے اس سے ہاتھ ملایا۔ کتنی ہی دیر تک لیلیٰ نے اس کا ہاتھ تھامے رکھا یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں تیرتے آنسوؤں کی دھند میں لنہ کا چہرہ چھپ گیا۔
"او کے لیلیٰ!" لنہ نے اس کا ہاتھ چھوڑا۔
"تم میرے وطن کی آزادی کے لیے دعا کرنا۔ میرے وطن کے بچے یہ دعا کرتے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ اور انہوں نے اپنی دعائیں اپنے بچوں کے ہاتھوں میں رکھ دی ہیں۔ لیکن دعائیں ابھی تک آسمانوں میں بھٹک رہی ہیں۔ جانے کب۔۔۔ جانے کب لیلیٰ انہیں در قبولیت ملے گا۔ اور تم کتنی خوش قسمت ہو لیلیٰ۔۔۔ ایک آزاد وطن کی باسی۔۔۔"
اس کی آنکھوں میں آزادی کی خواہش حسرت کی طرح مچلی۔
اور پچھلے دس سالوں سے وہ خود کو اپنی خوش قسمتی کا یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔۔۔ کہ انیق سلیمان کی بے وفائی کے باوجود وہ خوش قسمت ہے کیونکہ وہ ایک آزاد ملک میں پیدا ہوئی ہے اور وہ مسلم ہے۔۔۔"
"خدا تمہارے وطن کی آزادیاں ہمیشہ قائم رکھے لیلیٰ۔۔۔! اور تم پاکستان ضرور لوٹ جانا۔ وعدہ کرو لیلیٰ۔۔۔ لوٹ جاؤ گی پاکستان۔"
اس نے پھر ہاتھ آگے بڑھایا تو لیلیٰ نے وعدہ کر لیا۔۔۔
اس کا جی چاہا کہ وہ لنہ سے لپٹ جائے۔ گلے لگائے اور اسے بہت سارا پیار کرے۔ اور اس کے ہاتھ کوثر آپا خالہ جانی اور اماں کے لیے۔ بہت سارے پیام بھیجے داجی اور تاؤ جی کو پیغام بھیجے۔
لیکن وہ خاموش کھڑی لنہ کے چہرے کی روشنی اور نمک کو دیکھتی رہی۔ وہ جس سفر کی تیاری میں

تھی اس نے اس کے چہرے کو والوہی سی چمک عطا کردی تھی۔ وہ خدا حافظ کہہ کر چلی گئی مگر وہ کتنی ہی دیر تک وہیں ہی کھڑی رہی۔

اس کے ساتھ کیے وعدے نے بہت سارے دن اسے بے چین رکھا۔ اس وعدے کو پورا کرنے میں بھی اس نے کئی مہینے گزار دیے۔ وہ ہر روز اخبار میں "خود کش حملوں" کے متعلق پڑھتی اور لنہ عبداللطیف اسے بہت یاد آتی۔ پھر ایک روز اس نے اخبار میں لنہ کی تصویر دیکھی۔

"یہودیوں کے ایک بڑے اسٹور میں جسم سے بم باندھ کر جانے والی "لنہ عبداللطیف" اور اس روز وہ بہت روئی۔ بہت تڑپ تڑپ کر اس نے لنہ کے وطن کی آزادی کے لیے دعا کی۔۔۔۔ اور اپنی خوش قسمتی پر رشک کیا۔

اور اسی شام جب عباس نے فون پر گلوگیر آواز میں کہا۔

"لیلیٰ! بابا جان بہت کمزور ہو گئے ہیں اور تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔"

تو اس نے یکدم ہی عباس سے کہا۔

"میں آرہی ہوں عباس! بابا جان کو بتانا اور ان کا بہت خیال رکھنا۔"

اور اسے لگا جیسے کہیں قریب سے ہی لنہ کے مخصوص پرفیوم کی خوشبو آئی ہو۔۔۔۔ اور جیسے آسمانوں پر اس کی روح اپنے ساتھ کیے گئے وعدہ کے ایفا ہونے پر مسکرائی ہو۔

♥ ♡ ♡ ♥

اک الف پڑھو چھٹکارا اے

اک الفوں دو تن چار ہوئے

داجی کے کمرے کے دروازے کے باہر لیلیٰ ٹھٹک کر رک گئی۔ اسے لگا جیسے پندرہ سال پہلے بارہ تیرہ برس کی منی دروازے سے لگی کھڑی داجی کو غلام فرید کا کلام گنگناتے سن رہی ہے۔

ویسی ہی بھاری آواز، وہی سوز و گداز میں ڈوبا لہجہ .....

پھر لکھ کروڑ ہزار ہوئے

پھر او تھوں بانجھ شمار ہوئے

اک الف دا نکتہ نیارا اے

پچھلے چار ماہ سے وہ "کنجن بالی" آنے کا پروگرام بنا رہی تھی لیکن بابا جان کے پاس سے ہٹنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ بابا جان کی محبتیں اور شفقتیں۔ عباس اور ثمو کا پیار۔

ان کے بچوں کی معصوم شرارتیں اور پیار

وہ ان سب کو چھوڑ کر اجنبی دیس میں چھپی بیٹھی، اس ایک محبت کے بچھڑ جانے کا سوگ منا

رہی تھی جو اسے کبھی ملی ہی نہ تھی۔ اگر انیق کے دل میں اس کے لیے محبت کی ایک رتی بھی ہوتی خالص اور پکی محبت کی تو یہ محبت کبھی ختم نہ ہوتی اور اس نے اس ناموجود محبت کے سوگ میں زندگی کے دس برس اپنوں سے دور گزار دیے۔

وہ ہر رات ان بیتے دس سالوں کا ماتم کرتی اور ہر رات اپنی خوش قسمتی پر رشک کرتی کہ وہ ایک آزاد ملک کی شہری ہے۔

اس ملک کی ہواؤں میں بھی کتنا سکون ہے، کتنی اپنائیت ہے۔ یہ ہوائیں ہر صبح اسے محبت اور اپنائیت کے سندیسے دیتیں اور وہ بابا جان کے ساتھ "باماں بالا" کی حویلی سے منسلک اپنے وسیع باغ میں واک کرتے ہوئے یہ سندیسے وصول کرتی ہوئی انہیں ڈھیر کی باتیں بتاتی۔۔۔۔ اور واک کے اختتام پر حفیظ فاطمہ کی قبر پر فاتحہ پڑھتے ہوئے اس کی اور سید محب اللہ شاہ کی آنکھیں ایک ساتھ بھیگ جاتیں۔ اور اسے "کنجن بالی" کے وسیع قبرستان میں سفید مرمر کی دو قبریں یاد آجاتیں۔

کوثر آپا اور خالہ جانی کی۔

واک سے واپسی پر وہ ہر روز "کنجن بالی" جانے کا پروگرام بناتی اور پھر بابا جان کے ساتھ باتیں کرتے وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلتا۔ ان چار مہینوں میں اس نے اکرم سلطانہ، لنہ عبداللطیف، مہا لکشمی رتا، جگدیش، کیتھی گلنڈا سب کے متعلق لفظ لفظ بتا ڈالا تھا۔

آج پاکستان آنے کے پورے چار ماہ بعد وہ ثمو اور عباس کے ساتھ بڑی حویلی آئی تھی۔ اور اسے بتا چلا تھا کہ مدبر حسین اکثر داجی کے کمرے میں بیٹھے رہتے ہیں اور وہ سب سے مل ملا کر ادھر آئی تھی اور اب دروازے پر ساکت کھڑی تھی۔

"اک الف پڑھو چھٹکارا اے"

مدبر حسین کی آواز مدھم ہوتے ہوتے ختم ہوئی تو اس نے چونک کر دروازہ کھولا۔

مدبر حسین کی آنکھیں بند تھیں ہونٹ ہل رہے تھے لیکن آواز نہیں۔

"السلام علیکم۔"

اس کے سلام کی آواز سن کر مدبر نے آنکھیں کھول دیں۔۔۔۔ چند لمحے یونہی اس کے چہرے پر نظریں ٹکائے رہا۔۔۔۔ سنہری کمانی کی نازک سی عینک لگائے۔۔۔۔۔ بہت باوقار سی یہ کون تھی۔

"لیلیٰ!" انہوں نے یکدم ہاتھ آگے بڑھایا تو ان کے قریب بیٹھتے ہوئے اس نے سر جھکا دیا۔ اور بہت دیر تک مدبر حسین کا ہاتھ اس کے سر پر رہا۔

"کیسی ہو؟"

"اچھی ہوں بھائی! آپ کیسے ہیں؟"
"میں بھی اچھا ہوں۔" وہ مسکرایا۔
وہ روشن سی مسکراہٹ جو پورے چہرے کو روشن کر دیتی تھی۔
"تم نے واپس پلٹنے میں بہت دیر کر دی منی! اتنے برس لگا دیے۔"
"ہاں شاید راستے مشکل تھے یا مجھ میں ہی حوصلہ نہ تھا۔"
"کبھی کبھی دونوں باتیں ہوتی ہیں منی راستے بھی مشکل ہوتے ہیں اور حوصلہ بھی کم پڑ جاتا ہے۔" وہ پھر مسکرایا۔
"چلو تم آ تو گئیں اور شاید ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔"
ہاں شاید ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ لیلیٰ نے سوچا۔
ابھی بابا جان ہیں۔ عباس ہے' ثمرہ ہے' ان کے بچے ہیں ان کی محبتیں ہیں۔۔۔ اور تینوں حویلیوں کے مکینوں کا خلوص اور چاہت ہے۔۔۔ پھر یکایک اس نے چونک کر مدبر حسین کو دیکھا۔
یہ مدبر حسین ہیں جس کے متعلق ثمرہ بھابھی نے بہت دکھ سے بتایا تھا کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو چکے ہیں۔ مدت ہوئی انہوں نے جاب چھوڑ دی ہے۔ گاؤں کی گلیوں میں گھومتے رہتے ہیں یا پھر داجی کے کمرے میں بیٹھے ان کی کتابیں پڑھتے رہتے ہیں۔۔۔ اور پرانی ملازمہ رسولاں بی بی نے چپکے سے کہا تھا۔
"لیلیٰ بی بی آپ "کنجن بالی" جاؤ تو مدبر شاہ جی سے اپنے لیے دعا کروانا۔۔۔ وہ تو مجذوب ہو گئے ہیں۔"
اور یہ مدبر حسین جو اس کے سامنے بیٹھے اس سے باتیں کر رہے تھے۔۔۔ وہ تو بالکل نارمل لگ رہے تھے۔ بالکل ایسے ہی جیسے تب ہوا کرتے تھے' جب کوثر آپا زندہ تھیں۔
"منی! میں نہ پاگل اور دیوانہ ہوں نہ کوئی فقیر مجذوب۔"
انہوں نے جیسے لیلیٰ کی سوچ پڑھ لی تھی۔
"میں تو بس۔۔۔ منی کوثر تو کنوئیں میں گر کر ایک ہی بار ڈوب گئی تھی اور میں دنیا کے کنوئیں میں ایسا گرا ہوں کہ نہ ڈوبتا ہوں نہ ابھرتا ہوں۔۔۔ بیچ میں ہی کہیں خلا میں اٹکا ہوں۔۔۔ منی! داجی کہتے تھے۔ "پتر مدبر حسین! یا تو دنیا کو پورا کا پورا تیاگ دے۔۔۔ اور کوئی ایک راہ پکڑ لے۔ ادھر کی یا ادھر کی۔۔۔ یا پھر میانہ روی اختیار کر۔۔۔ اور اس رب کے حضور جھک جس نے صرف ایک کوثر کو لے کر باقی سب کا سب تیرے پاس رہنے دیا۔۔۔ گھر بسا

لے۔۔۔ پر منی! میں گھر نہیں بسا سکا۔۔۔ کوثر کے بعد دل ہی نہ چاہا گھر بسانے کو۔۔۔ اور نہ میں دنیا کو پورا کا پورا تیاگ سکا۔ داجی کہتے تھے۔ "اللہ تعالیٰ اپنے سالک پر سورج کی طرح انوار و برکات برساتے ہیں' لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ سالک کا شیشہ شفاف ہو اور اس کی سمت درست ہو تو تب ہی انجذاب ہو گا اور منی میرا تو نہ شیشہ شفاف ہے اور نہ ہی سمت درست ہے۔ میرے شیشے سے تو کوثر کی تصویر مٹتی ہی نہیں اور جو ذرا دھندلی پڑتی ہے تو میں رگڑ رگڑ کر اسے پھر چمکا لیتا ہوں۔ میں تو اس کی راہ کا سالک ہی نہیں ہوں۔ میرا راستہ تو بس قبرستان تک جا کر ختم ہو جاتا ہے۔"
اور لیلیٰ کو لگا جیسے اس کا دل پانی ہو کر پگھل رہا ہو اسے کوثر آپا بہت یاد آئیں جو اپنے بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھی پڑھتے ہوئے لتا اور محمد رفیع کے گانے سنتی تھیں۔ اور جو خالہ جانی کی دوست تھیں۔
جو منی سے بہت پیار کرتی تھیں اور جو مدبر حسین سے بھی محبت کرتی تھیں اور مدبر حسین کو یوں دیکھ کر ان کی روح ضرور پریشان ہوتی ہو گی۔
"بھائی! آپ گھر بسا لیتے؟"
"وہ کہاں منی! جی کو کوئی جچتا ہی نہیں۔۔۔ اور تم منی۔۔۔! تم نے کیوں نہیں گھر بسایا۔۔۔؟"
"میں نے۔۔۔" لیلیٰ کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ وہ بھلا کیا کہتی' وہ تو دس سال اس محبت کے بچھڑنے کا غم مناتی رہی۔ جو کبھی اس کی تھی ہی نا۔۔۔
"گھر بسا لو منی! زندگی سہل ہو جائے گی۔" مدبر حسین نے آہستگی سے کہا۔
اور یہ بات پچھلے چار ماہ سے سب ہی کہہ رہے تھے۔
بابا جان' ثمرہ۔۔۔ عباس۔
سلیمان شاہ نے کتنی ہی بار بابا جان کو فون کیا تھا۔۔۔ اور سعد سلیمان کے لیے اس کی آرزو کی تھی۔
سعد سلیمان جس کی بیوی دو سال قبل بیٹے کی پیدائش پر وفات پا گئی تھی۔۔۔ شادی کے نو سال بعد اولاد کی خوشی ملی بھی تو اسے دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا اسے۔۔۔
"اکیلے اتنی لمبی عمر کیسے گزارو گی منی؟"
"جیسے پہلے گزاری اجنبی دیس میں اجنبی لوگوں کے درمیان اور یہاں تو پھر سب میرے اپنے ہیں۔"
اس نے کہنا چاہا اور سر اٹھا کر مدبر حسین کی طرف دیکھا تو اس کی نظر سعد سلیمان پر پڑی

تھی۔۔۔۔ جو نہ جانے کب بنا آہٹ کیے کھلے دروازے سے اندر آگیا تھا اور اب آنکھوں میں اشتیاق کا ایک جہان چھپائے اسے دیکھ رہا تھا۔ اتنے بہت سارے سالوں میں وہ بہت زیادہ تو نہیں بدلا تھا۔ بس کنپٹیوں کے پاس سے کچھ بال سفید ہو گئے تھے اور وہ پہلے کے مقابلے میں بہت سوبر لگ رہا تھا۔۔۔۔ نظریں ملی تھیں۔

"لیلیٰ! انکار مت کرنا۔" اس کی آنکھوں نے پیغام دیا تھا۔

"میرے پاس تمہارے لیے بہت محبت ہے۔ میں تمہارا بہت خیال رکھوں گا۔ تمہیں ہر دکھ سے بچا کر رکھوں گا۔"

لیلیٰ کی نظریں جھک گئیں اور رخساروں پر گلابی پن دوڑ گیا۔ اور مدبر حسین کے ہونٹوں پر ہی نہیں سعد سلیمان کے ہونٹوں پر بھی بے اختیار مسکراہٹ بکھر گئی۔

"داجی کی خواہش تھی لیلیٰ کہ تم بڑی حویلی میں بہو بن کر آؤ اور آج ان کی روح بہت خوش ہو گی۔"

مدبر حسین نے بے حد مسرت سے کہا اور لیلیٰ کو کیتھی یاد آ گئی جو اکثر کہتی تھی۔

"لیلیٰ! تم کتنی لکی ہو۔۔۔۔"

"ہاں کیتھی میں واقعی بہت لکی ہوں۔"

پہلی بار اس نے پورے یقین کے ساتھ دل ہی دل میں اعتراف کیا اور ایک روشن مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔